# تفسیر تصوف

بنام

## ابی محمد عبداللہ دیولی

مصنف

پیر صاحب دیولی شریف

# تفسیرِ تصوّف

بنام

## ابن محمد عبداللہ دیولی

مصنّف

## پیر صاحب دیول شریف

جُملہ حقُوقِ بحق ناشِر محفُوظ ہیں،

نامِ کتاب : ابن محمد عبداللہ دیولی القادری
مصنّف : اعلیٰ حضرت خواجہ محمد عبدالمجید احمد
ناشِر : پیر روح الحسنین معین
طبعِ اوّل : نومبر ۱۹۷۰ء ایک ہزار (۱۰۰۰)
طبعِ دوم : دسمبر ۱۹۷۴ء ایک ہزار (۱۰۰۰)
طبعِ سوم : دسمبر ۱۹۹۲ء دو ہزار (۲۰۰۰)

کمپوزنگ : اسلامک پڈانہ گرافکس اینڈ کمپوزنگ سنٹر
فلیٹ نمبر ۶، اتحاد پلازہ جی ٹن مرکز، اسلام آباد

قیمت :

مقامِ اشاعت : آستانہ عالیہ قادریہ پیر صاحب دیول شریف
ڈیفنس روڈ وادیٔ دیول شریف (مور گاہ) راولپنڈی

# حمد باری تعالیٰ

میری روحِ زندگانی تیرا نام ہے خدایا
تیرے نام ہی سے اب تو میرا کام ہے خدایا
تیری یاد زندگی ہے تیرا ذکر بندگی ہے
تیری حمد میرے لب پر تو مدام ہے خدایا
تیرے عشق ہی میں جینا تیرے عشق ہی میں مرنا
یہی کیفِ غیر فانی یہی جام ہے خدایا
یہی ہے نجاتِ انساں یہی روح شرحِ قرآں
تیرا ذکر اودانی وہ کلام ہے خدایا
تیری صبح بھی ثنا خواں تیری شام بھی ثنا خواں
جو پڑھا نبی ﷺ پہ تو نے وہ سلام ہے خدایا
جو نصیب مصطفےٰ ﷺ کی ہو معین رہ نمائی
تیری بار گاہِ عالی تو دوگام ہے خدایا

صاحبزادہ پیر روح الحسنین معین
خلف الرشید
حضرت پیر صاحب دیول شریف

# فہرست


| نمبر شمار | نام ابواب | صفحہ نمبر |
|---|---|---|
| ۱- | پہاڑ کی زندگی | ۹ |
| ۲- | حسب و نسب | ۲۰ |
| ۳- | تقویٰ | ۳۲ |
| ۴- | نظریۂ اسلام اور تقویٰ | ۴۳ |
| ۵- | نفس امارہ اور نفس لوامہ | ۵۴ |
| ۶- | بندگی اور اس کی عملی تقسیم و تفصیل | ۸۴ |
| ۷- | معیشت انسانیہ | ۷۱ |
| ۸- | رازِ زندگی | ۸۴ |
| ۹- | میرا متاعِ زیست اور والدین کی عاطفت | ۹۵ |
| ۱۰- | فضیلت علماء امت | ۱۰۸ |
| ۱۱- | مومن کے درجات | ۱۲۴ |
| ۱۲- | شاہکار زیست کا نقطۂ پرکار | ۱۳۲ |
| ۱۳- | بربنائے تقویٰ سلوک کی تعریف | ۱۴۶ |
| ۱۴- | والدِ بزرگوار کے دینی مشاغل | ۱۵۷ |
| ۱۵- | خوارقات قولی و عملی | ۱۶۴ |
| ۱۶- | اہل حال کو علماء کی نگرانی میں رہنا چاہیے | ۱۷۳ |

| | | |
|---|---|---|
| ۱۷- | پیشین گوئی والد بزگوار | ۱۸۲ |
| ۱۸- | سورہ فاتح کی معیت میں مشاہدات | ۱۹۲ |
| ۱۹- | سورہ فاتح کی روشنی میں سات حامدانہ سلوک کے سات عقبات | ۲۰۲ |
| ۲۰- | = وسیلۂ مرشد طریقت و شریعت کے ساتھ ہی، مکمل ہو سکتا ہے = | ۲۱۱ |
| ۲۱- | اَخصُّ الخواص کی راہنمائی خواص و عوام کے لیے | ۲۱۸ |
| ۲۲- | مرشد سے مراد صاحب علم اولی الامر ہے۔ | ۲۳۳ |
| ۲۳- | والد بزرگوار کے پند و نصائح | ۲۴۰ |
| ۲۴- | راضی برضا رہنا | ۲۵۹ |
| ۲۵- | مرشدین کاملین اور ان کے تفویضات | ۲۷۱ |
| ۲۶- | سالک منزل اور وادی سلوک | ۲۸۱ |
| ۲۷- | اہل دنیا و اہل ایمان | ۲۹۹ |
| ۲۸- | ایک مردِ خدا سے ملاقات | ۳۰۸ |
| ۲۹- | والد بزرگوار کا وصال | ۳۱۵ |
| ۳۰- | عقیدہ حلول اور وحدت الوجود کی تردید | ۳۲۴ |
| ۳۱- | میرے وصال کے بعد میری قبر پر آنے کے آداب (پیشین گوئی) | ۳۲۷ |
| ۳۲- | خاندانی طور پر غیر آسودہ حالی | ۳۳۱ |
| ۳۳- | دیول شریف کے نام کی وجہ تسمیہ | ۳۴۸ |

# انتساب

بنام اولیاۓ امت و سوادِ اعظم اہل سُنت و الجماعت پاکستان

# پیش لفظ

ابن محمد عبداللہ کو شروع کرنے کی وجہ تسمیہ یہ ہوئی کہ میں نے تصنیف شروع کرنے کے ایک ہفتہ بعد جمعرات کو عالم خواب میں پاکستان کے عظیم المرتبت اولیاء اللہ کا ایک اجتماع عظیم دیکھا جو ایک ایسے میدان میں ہو رہا تھا جس کے ہر چہار جانب سے وسیع ترین سڑکیں میدان میں آ رہی تھیں، جن پر اولیاء اللہ قافلوں کی شکل میں پاپیادہ تشریف لا رہے تھے، اور کوئی منادی کرنے والا یہ منادی کر رہا تھا۔ کہ آج کی یہ مجلس عظیم حضرت خواجہ محمد عبداللہ صاحب خطیب اعظم دیول شریف کی یاد میں منعقد ہو رہی ہے۔ جس کی صدارت حضرت فقیر اللہ صاحب بکوٹی رحمۃ اللہ علیہ فرمائیں گے۔

چنانچہ جب میدان اولیاء اللہ سے بھر گیا۔ جس میں سب لوگ سفید لباس میں ملبوس تھے اور سب کے سب مسنون ڈاڑھیوں والے باریش لوگ تھے۔ سب کے سروں پر امامے تھے۔ کسی کے سر پر ٹوپی نہیں تھی اچانک حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑہ شریفؒ کی سواری تیزی کے ساتھ میدان میں داخل ہوئی۔ سٹیج زمین سے چند بالشت بلند تھا اس پر حضرت فقیر اللہ صاحب بکوٹی رحمۃ اللہ علیہ صدارت کی خوبصورت کرسی پر جلوہ افروز تھے۔

حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب کے استقبال کے لیے آپ سروقد کھڑے ہو گئے میرے والد بزرگوار حضرت خواجہ محمد عبداللہ صاحب قادری رحمۃ اللہ علیہ بھی استقبال کے لیے سروقد کھڑے ہو

گئے۔ یہ سب لوگ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر ملے
حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے لیے ایک نورانی کرسی لائی گئی۔ جس پر آپ نے نشست فرمائی اعلان ہوا کہ خواجہ محمد عبداللہ قادری رحمتہ اللہ علیہ کے صاحب زادے پیر محمد عبدالمجید احمد ولایت کے موضوع پر خطاب کریں گے۔
چنانچہ میں حالت خواب میں الاانّ اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولاَھَم یحزنون کے موضوع پر خطاب کرتا ہوں جس کو بہت زیادہ پذیرائی ملی۔
حضرت صاحب بکوٹی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ کہ محمد عبدالمجید احمد جو خواجہ محمد عبداللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے جگر پارہ ہیں آج کے اس سارے مجمع عظیم کی طرف سے محمد عبدالمجید احمد صاحب کو اپنے والد کے نام پر ایک کتاب لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے اور اس کتاب کا نام متفقہ طور پر ابنِ محمد عبداللہ تجویز ہوا اور میں نے اس ارشاد گرامی کو بسرو چشم قبول کیا اور اس عظیم ترین مجلس میں ان الفاظ کے ساتھ عہد نامہ کی صورت میں یوں گویا ہوا کہ میں انشاء اللہ کسی افراط و تفریط کے بغیر، کسی شاعرانہ مبالغہ آرائی کے بغیر اپنے والد ماجد کی مبارک زندگی پر تبصرہ کروں گا۔
اور ایک کتاب کی صورت میں اپنے والد کی عالمانہ یادگار رقم کروں گا۔ جس پر تمام اولیاء اللہ نے مجھے مبارک باد پیش کی۔ اس کتاب کا نام رکھنے کی وجہ تسمیہ یہی خواب تھا۔

خواجہ محمد عبدالمجید احمد

پیر دیول شریف

# بسمِ اللهِ الرّحمٰن الرحیم

# نحمدہ ونصلّی علٰی رُسولہِ الکَریم

## باب اول

### پہاڑ کی زندگی

میں اللہ کا عاجز ترین بندہ ابنِ حضرت محمد عبداللہ قادری دیولی عرضِ حال بیان کرتا ہوں کہ میں آج سے ستر (۷۰) برس قبل سرزمین دیول شریف میں ایک درویشِ باللہ گھرانے میں پیدا ہوا جو علمِ دین کا گہوارہ تھا اور تقویٰ و پرہیز گاری اس درویش گھرانے کا امتیازی نشان تھا۔ دو نفوس جن کی عاطفت میں مجھے پرورش نصیب ہوئی، وہ بڑے درجے کے متقی اور بڑے جودوسخا کے حامل تھے۔ نہایت حلیم، متواضع، نہایت عاجز، غمگسار اور نہایت منکسر المزاج اور عفوودر گزر کرنے والے صفاتِ عالیہ کے مالک تھے۔ سلسلہ تبلیغ دین اپنے اسلاف سے تواتر کے ساتھ ورثہ میں رکھتے تھے۔ حکمت و موعظتِ اسلامیہ پر بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ کوہ

مری، ہزارہ اور آزاد کشمیر کی پُر نور پہاڑیوں کے وسطی دامن قریۂ دیول شریف میں بیٹھ کر آپ نے مذہبی تبلیغ کے فرائض جس حسن و خوبی سے سرانجام دیئے۔ وہ ایک خاص نوعیت کے حامل تھے۔ خطۂ پہاڑ کے مرد و زن، عوام و خواص، صغیر و کبیر آپ کے معتقد اور آپ سے بے پناہ عقیدت رکھنے والے تھے۔ آپ کے پاس ہر وقت اہلِ عقیدہ کا ایک بابرکت تانتا بندھا رہتا تھا۔ ایک سادہ سی جھونپڑی میں اسی پچاسی برس کی عمریں گزار دیں۔ نہایت سادہ ماحول میں رہنا سہنا پسندِ خاطر تھا۔

مجھ عاجز کو حضرت والد بزرگوار کی خدمت میں حاضری کا زیادہ شرف ملا۔ واقعتاً میں نے آپ کو بڑی خوبیوں کا حامل پایا۔ آپ فی الحقیقت ایک کامل مرد، بزرگ اور درویش باللہ اور بہت بڑے فاضلِ دین تھے۔ مگر دعوائے علم سے ہمیشہ گریز فرماتے تھے۔ آپ ایک فصیح اللسان خطیب بھی تھے اور بعض دفعہ آپ کا کلامِ بلیغ اس حد تک پُرمعنی اور پُرتاثیر ہوتا کہ اہلِ دانش تڑپ اُٹھتے۔ آپ فقیہانہ اور مجتہدانہ صفات کے بھی مالک تھے۔ مگر باوجود ان صفاتِ عالیہ کے آپ منکسرانہ انداز میں اپنی صفات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

آپ نے اپنی پوری زندگی میں صرف عاجزی کا عملی ثبوت دیا۔ آپ نے دانستہ طور پر پہاڑ کی سادہ زندگی کو اپنایا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے۔ "کہ عارف باللہ کی نگاہِ عارفانہ پہاڑ سے جن لطائف کا اخذ کر سکتی ہے۔ اس کا اندازہ صرف اہلِ نظر ہی کر سکتے ہیں۔ فرمایا میں نے پہاڑ کی زندگی میں جو کچھ پایا۔ وہ شاید کسی دوسری جگہ سے نہ پا سکتا۔ میں نے یہاں سے اپنے مالک و مولا کو پایا ہے۔ منزلِ سلوک پائی ہے۔ صبر و استقامت

پائے۔ معرفت کے گوہرِ بے بہا پائے۔ میں اللہ پر کامل بھروسہ کرنے والا ہوں۔ بس میرا یہی زادِ راہ ہے۔

پہاڑوں کی قدرتی ساخت ایسی ہوتی ہے۔ جس میں نیرنگئی فطرت کے سوا کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ اوپر آسمان ہے۔ جو دستبردِ انسانی سے محفوظ و مامون اور سطحِ ارضی پر پھیلے ہوئے بلند و بالا جبال اور خودرو سبزہ زاروں سے لدی ہوئی زمین اور جوئے باروں کی آوازوں سے نغمہ ریز طوطیانِ خوش نوا اور مختلف پرندوں کے چہچہوں سے معمور فضاؤں سے آباد و خوشحال پہاڑ ایک سالکِ راہ کو اس مالکِ حقیقی کی راہ بتاتے ہیں۔ جو بے چون و چراں ساری مخلوقات کا پروردگار اور بے مثل و بے مثال ہے۔

کہیں ڈھونڈے سے بھی ان پہاڑوں کی دلفریب رنگینیوں میں بناوٹ کا شائبہ تک بھی نہیں ملتا۔ دہقان اپنی سادگی میں اپنی زندگی کے ترجمان ہوتے ہیں ان کی بہو بیٹیوں کی فطری سادگی ان کی سادہ سی معاشرت جو ہر قسم کے تصنع سے بالکل پاک و صاف ہوتی ہے۔ زندگی کی ان کیف انگیز حالتوں کی ترجمان ہوتی ہیں۔ جس کا ترجمہ چشمِ بینا ہی کر پاتی ہے۔ سطحی نظروں والے شاید اس متاعِ روح پرور کا سراغ نہ پا سکیں۔

ان پھیلے ہوئے کوہ و دمن میں عارفانہ نظریں نہایت سادگی سے اُچک کر حقیقی دامنِ مراد تھام لیتی ہیں اور کسی ماوریٰ ہستی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ دیہاتی زندگی اور کوہ و دمن کا قدرتی امتزاج قلب و نظر میں ایک کیف و سرور پیدا کر دیتا ہے۔ چونکہ صحیح کیف و سرور فطری منظر سے ہی میسر آ سکتا ہے۔ لہذا وہ بھی فطری کیف و سرور بن جاتا ہے۔ اس ہئیتِ مجموعی میں بصیرتِ عارفانہ کا افتتاح ہو جاتا ہے۔

چنانچہ عارف باللہ بصیرت زندگی کے وہ وہ راز معلوم کر لیتا ہے۔ جو مکتب و مدرسہ میں میسر نہیں آسکتے اور نہ ہی شہروں کی گنجان آبادیوں میں ان تک رسائی ہو سکتی ہے۔ شہر تو بس شہر ہیں۔ جن میں اکثر و بیشتر نفوس کی نگاہیں منتشر الحال رہتی ہیں۔ اگرچہ سامانِ زیست کی افراط ہوتی ہے مگر سامانِ قلب و نظر بہت کم یاب ہوتے ہیں۔ اور ان فطری جہانوں میں چاہیں تو سارے دہقان ہی صاحبِ نظر ہو جائیں۔ اس واسطے کہ دہقان کی تارِ رُبابِ حیات دنیا کے فریب سے محفوظ رہنے کی بنا پر مسلّمہ طور پر سلامت ہوتی ہے۔ جب بھی مضرابِ حقیقت کے ساتھ اس کی تارِ حیات چھیڑی جائے گی اس سے وہی نغمات صادر ہوں گے۔ جو بالکل فطری ساخت پر غیر مصنوعی ہوں گے۔

دل غیر مصنوعی، سمع و بصر غیر مصنوعی، تمنا غیر مصنوعی، جستجو غیر مصنوعی، طلب غیر مصنوعی، منظر غیر مصنوعی۔ اس پاک ہجومِ فکر و عمل میں دہقان زادوں اور ان کے خاندانوں کو سوائے حقیقت کے اور کچھ نظر ہی نہیں آسکتا۔ ان کی نماز، نماز ہے۔ ان کا امام، امام ہے۔ وہ ہمہ وقت انفس و آفاق سے انوار و تجلیات فطرت کا مہبط ہوتے ہیں۔

پہاڑ کی زندگی اور اس کے علم و عرفان اور اس کی نگاہ رسا کو اور اس کے تہذیب و تمدّن کو اللہ تعالےٰ نے ساری دنیا پر تفوق و برتری دے رکھی ہے۔ سالک مردِ کوہستانی ترجمان حقیقت ہے وہ زمانہ اور تہذیب کا محاسب ہے۔ وہ دل کا بادشاہ ہے۔ وہ مقاصدِ زیست کا عارف ہے۔ اس کے قلب و نظر سے فیض کے دریا پھوٹتے ہیں۔ اور رواں دواں ہوتے ہیں۔ وہ سنتِ اسلاف کا امین ہوتا ہے۔ وہ کسی کا حریف نہیں ہوتا۔ مگر

اس کے حریف پامال خزاں ہو جاتے ہیں۔ وہ حق کی بے نیام تلوار ہوتا ہے۔ وہ ظاہری باطنی طور پر صمصام اللہ ہوتا ہے۔

اس دنیا میں سب سے مشکل ترین سوال مقاصدِ زیست کا حل کرنا ہے۔ اس سوال کا حل فلاسفہ و ادباء و شعراء و متکلمین اور دوسرے مفکرین کے بس کا روگ نہیں ہے۔ مگر دشت و جبل کا خود آگاہ درویش ایسے مشکل ترین لاینحل سوالات کو بھی حل کر لیتا ہے۔ دوسرا سوال جو اہلِ دنیا کے نزدیک ناقابلِ حل ہے۔ وہ انسانی سطح پر ابھرنے والے جدید تہذیب و تمدن ہیں۔ جو مختلف اور جدید تہذیب و تمدن کے ساتھ انسانی ذہنوں کے بے پایاں طوفانوں اور اس کی معاشرت کے ہنگاموں میں مخفی و مستور ہوتے ہیں۔ کہیں معاشرت کے چہروں کے اتار چڑھاؤ سے ہی اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر انسانی تہذیب و تمدن کے چہروں کو مجموعی طور پر پڑھنا سوائے اہلِ نظر کے مشکل ترین عُقدہ ہے۔ مگر اہلِ نظر کے نزدیک پہاڑی زندگی کی نسبت آخرالزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پہاڑی زندگی کی طرف منسوب ہے یہ کہ اللہ کے سب سے بڑے اور مکرّم ترین بندہ کامل نے زندگی کا آغاز پہاڑوں سے کیا۔ پہاڑوں میں پرورش پائی۔ پہاڑی ماحول سے آشنا ہوئے۔ پہاڑی تربیت میں جوان ہوئے اور فاران کی چوٹی سے ساری دنیا کو ایک خدا کی طرف دعوت حق کے ساتھ نجات کامل کی طرف بلایا اور مقاصدِ زندگانی کے سوال کو حل کیا۔ تہذیب و تمدن کا صحیح جائزہ لے کر انسانیت کی صحیح راہنمائی فرمائی۔

مردِ کوہستانی کا فقر و غنا اگرچہ بظاہر بوریا نشین ہوتا ہے۔ مگر سرمایۂ سلطانی بھی اس کے سامنے ہیچ ہوتا ہے۔ چونکہ بندۂ فقیر خیر الانام علیہ

الصلوۃ والسلام کا اطاعت شعار ہوتا ہے۔ دین کی پیروی میں وہ روحانیت اور مادیّت پر متصرّف ہوتا ہے۔ اس کا فقر و غنا جہاں کہیں اور جس حالت میں ہو مطمئن ہے۔ اسے انسانی نفوس پر اپنے اسلامی فقر و غنا کے ساتھ برتری حاصل ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے خفی جہانوں کے بلند و بالا ایوانوں میں رہتا ہے۔ ساری دنیا اس کے نزدیک ایک خیمہ یا جھونپڑہ کے مانند ہے۔ جس کی چھت آسمان اور فرش زمین ہے۔ وہ ایسے عارضی مسکن کو اپنی قیام گاہ متصور نہیں کرتا۔ اہل دنیا کو وہ ہمہ وقت حادثات و آلام کا شکار پاتا ہے۔ اور ان کے لیے عافیت کی دعا مانگتا ہے۔ اس کی دعاؤں سے اہلِ دنیا امن پاتے ہیں۔ روحانیت کی بلند و بالا پرواز رکھنے والا ایسا مردِ فقیر اتنا بَرتر و بالا ہو کر بھی اس عالم کاخ و کو میں اس واسطے بوریا نشین ہونا پسند کرتا ہے کہ انجام کار سب کو زیر زمین خاک پر ہی اپنا بستر لگانا ہوگا۔ اس کا یہ فیصلہ حاصل زندگی ہے اور صحیح جواب ہے

والد بزرگوار جب پہاڑ کی زندگانی پر عارفانہ استفسار فرماتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا کہ آپ کی ساری باطنی قوتیں اسی نقطۂ نظر میں سمٹ آئیں اور پہاڑوں کی قدرتی ساخت اس کی آبادیوں، اس کے مساکن، اس کی بود و باش پر باتیں کرتے ہوئے جھوم جاتے۔ فرمایا

"جس پہاڑ کو حضرت فقیر اللہ صاحب بکوٹی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت مخدوم علی شاہ صاحب سوہاوی رحمتہ اللہ علیہ، حضرت دادا ملک سورج صاحب رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت پیر محمد قاسم صاحب موہڑوی اور حضرت علامہ مولانا محمد سعید صاحب رواتی رحمتہ اللہ علیہ نے نوازا ہو۔ اس کی بلندیٔ شرافت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔"

بیٹا! اگر حالات نے اجازت دی۔ تو پہاڑی آبادی کو ترک نہ کرنا ورنہ بصورتِ دیگر اس کی روایات کو ذہن نشین رکھنا۔ اس کے بسنے والوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ یہ لوگ ناقابلِ فراموش ہیں۔ پھر بشارت کے طور پر فرمایا۔

"کہ تم جو کچھ بھی پاؤ گے۔ ان ہی دشت و جبل سے پاؤ گے۔ معرفتِ الٰہی کے ساغر بھی تمہیں یہیں پلائے جائیں گے۔ مگر جو کچھ اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی بہتر ہوتا ہے۔ دینِ اسلام سب سے محبوب ہے۔ اس کی اشاعت کے لیے اگر باہر چلے جاؤ۔ تو بھی مری کی پہاڑیوں کو اور خاص طور پر دیول شریف کو اپنا منبع و مصدر جاننا۔"

حضرت والد بزرگوار کے کلام سے میں بار بار یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ پہاڑ کی تعریف کرتے ہوئے طورِ سینا کو بھی شاملِ کلام فرماتے اور اس کا اہتمام مکہ اور مدینہ کی پہاڑیوں کے ساتھ کرتے۔ صاف ظاہر ہو جاتا۔ کہ آپ کی توجہ کا مرکز مکہ و مدینہ کی پہاڑیاں ہیں۔ جن کو سید الکونین ﷺ سے نسبت ہے۔ میں نے اپنی ریاضت کے دوران کئی سال پہاڑ کے نشیب و فراز، پہاڑ کے جوئے باروں، دریاؤں، جنگلوں میں عبادات کیں اور پہاڑی فطری ماحول کا بغور مطالعہ کیا اور مجھے بھی پہاڑ کی زندگی سے بہت کچھ ملا۔

حضرت والد بزرگوار پہاڑ کے دہقان اور پھر دہقان کی محنت و مشقت اور اس کے مساکن پر اکثر ایک شعر پڑھا کرتے تھے۔ جو مجھے یاد ہے۔ میں بھی گاہے گاہے اپنی تنہائی میں اس کو والد بزرگوار کی سنت سمجھ کر پڑھا کرتا ہوں اور اس کے پڑھنے سے روح کو تسکین ہوتی ہے۔

شعر۔

فضا کی وسعتوں میں چند کچے گھر کسانوں کے
یہی ارضی مساکن ہیں زمیں کے رازدانوں کے

میں نے اپنے مطالعہ سے پہاڑی زندگی کے متعلق جو اندازہ لگایا۔ وہ یہ ہے

کہ خالص تربیت کے ساتھ پہاڑ کا بچہ انسانی خدمت کے لیے اعلیٰ قسم کی سیادت و قیادت کا حامل ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں سیادت و قیادت کی سبیل کو اگر کوہ و دمن میں ہی پالا جائے۔ تو یہ سنتِ مصطفویؐ کی پاسداری ہو گی۔

میرے والدین طریقت میں سلسلۂ قادریہ سے منسلک تھے۔ والد بزرگوار نے سلسلۂ چشتیہ سے بھی فیضِ خلافت حاصل کیا۔ بغداد معلّٰے سے بھی خلافت حاصل کی اور پاکپتن شریف سے بھی خلعت خلافت حاصل کی۔ سوہاوہ شریف جو آزاد کشمیر میں ہے۔ حضرت مخدوم علی شاہ صاحب سے بھی خلعتِ خلافت حاصل کی حضرتِ فقیر اللہ صاحب بکوٹی رحمتہ اللہ علیہ کے جلیسِ خاص رہے۔ اگرچہ آپ نے ان سے بیعت نہ کی تھی۔ مگر آپ فرمایا کرتے تھے۔

"کہ مجھے حضرت فقیر اللہ صاحب بکوٹی رحمتہ اللہ علیہ سے بے حد عقیدت ہے اور ان سے مجھے خاص الخاص فیض نصیب ہوا۔ اور میں آپ کی خاص توجہ کا مرکز رہا۔ آپ نے مجھ سے بے پناہ التفات فرمائی یہاں تک کہ میں نے آپ کے دستِ حق پر بیعت حاصل کرنے کی بارہا آرزو

کی۔ مگر آپ اتنا فرما دیا کرتے تھے۔ کہ آپ نے تو قادریہ خاندان کے منبع و مصدر بغدادِ معلّٰی سے فیض معرفت و طریقت حاصل کرنا ہے جو بڑی فضیلت ہے۔ پس اسی پر اکتفا کرو۔ یہ مقام خوش بختی سے ہی کسی کے حصہ قسمت میں آتا ہے۔

پھر فرمایا کرتے تھے۔ کہ عبداللہ میں چاہتا ہوں کہ ہمارا انجام ایک اور بالخیر ہو۔ بارہا یہ بھی فرمایا۔ کہ تم شیر بیشہ عرفان ہو۔ تم رستمِ فقر و غنا ہو۔ تم اپنے زمانے کے عظیم سبکسار غازیٔ میدان علم و معرفت ہو۔ تمہاری پروازِ علم و عرفان بلند و بالا ہے۔ جو اللہ کے فضل و کرم سے تمہیں عطا ہوئی۔ فرمایا

"کہ تم اللہ کے دوست ہو۔ ایک دفعہ آپ نے حالتِ وجد و سرور میں فرمایا کہ عبداللہ تم تو ایک مخفی خزانہ ہو۔ میری دعا ہے کہ تم مخفی ہی رہو۔ میں دیکھتا ہوں۔ کہ تمہیں اللہ تعالیٰ ایک درویش بچہ دے گا۔ جو دین کو روشن کرے گا۔ جس کی ہدایت دور دراز تک پھیلے گی۔ یہی نورِ معرفت تمہارے ذاتی اور مخفی فقر و غنا کا اظہار ہو گا۔ اور اس ظہور سے تمہاری روح برزخ میں بھی امن و سرور پائے گی"۔

میں نے آمنا و صدقنا کہا۔

ایک دفعہ حضرت فقیر اللہ صاحب بکوٹی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا عبداللہ تم بڑے خوش نصیب ہو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم اور تمہاری بیوی دونوں وہبی ولی اللہ ہو۔ یہاں تک کہ تم دونوں کے ماں باپ، آباؤاجداد بھی ولی اللہ ہیں۔ اسی اعتبار ولایت سے تمہاری اولاد نجیب الطرفین ولیوں کی اولاد ہو گی۔ میں نے عرض کیا۔ حضرت میرا ایمان ہے کہ ایسے ہی ہو گا۔

جیسا کہ آپ کی زبان فیضبار سے ارشاد ہو رہا ہے۔ حضرت میرے ہاں ابھی تک اولاد نہیں ہوئی فرمایا کچھ مدت بعد دعا کروں گا۔ پھر بشارت دوں گا۔

ایک عرصہ کے بعد آپ کی مجلس اقدس میں چند ہمراہیوں کے ساتھ اولاد کی غرض سے دعا کے لیے حاضر ہوا۔ میرے ہمراہ جانے والے مری اور آزاد کشمیر کی معروف ترین شخصیات تھے جن میں سردار اکرم خان عباسی، سابق جج اور مری کی معروف ترین شخصیت ذیلدار نذر محمد عباسی بھی تھے۔ آپ نے دعا فرمائی اور بشارت دی اور فرمایا کہ تیرے گھر اللہ کی عنایت سے تین لڑکے پیدا ہوں گے۔ اس وقت آپ پورے جلال میں تھے۔ مجلس میں کسی صاحب نے شبہ کیا۔ تو سخت جلال کے عالم میں فرمایا کہ قسم ہے اللہ تعالٰے کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ کہ عبداللہ کے گھر تین لڑکے ہوں گے۔ یہ لوگ شک کرتے ہیں میں ان کے نام بھی بتائے دیتا ہوں۔ فرمایا۔

تمہارے بڑے بچے کا نام محمد عبدالجلیل ہو گا اور تمہارے منجھلے لڑکے کا نام محمد عبدالخالق ہو گا اور تمہارے سب سے چھوٹے لڑکے کا نام محمد عبدالمجید احمد ہو گا۔ یہ چھوٹا بچہ وہ ہو گا۔ جس کے ذریعہ دین کی تائید ہو گی۔ جس کو تمہاری تدریس کے علاوہ علومِ دینیہ خدا کی غیبی تائید سے حاصل ہوں گے۔ مدبرین و مفکرینِ وقت اس سے دین و عرفان کا سبق لیں گے۔ اکابرینِ وقت اس سے فیضِ دین و ایمان پائیں گے اس کو کسی مکتب و مدرسہ میں نہ بھیجنا۔ دریاؤں کے کناروں اور دشت و جبل میں اس کا معلمِ خاص اس کا انتظار کرتا ہے۔ یہ معلم صدہا برس کے بعد اللہ کی خاص

رحمت و کرم سے کسی بندۂ خاص کے نصیب میں آتا ہے = یہ فرمایا اور مبارک باد دی۔ اور فرمایا۔ آپ کا یہ لختِ جگر جب پیدا ہو تو میری طرف سے اس کی پیشانی چوم لینا۔ =

"اپنے لختِ جگر و نورِ نظر محمد عبدالمجید احمد کو میرا اسلام دینا اور میری دعا دینا۔ یہ پہاڑی علاقے مردانِ خدا سے کبھی تہی دامن نہیں ہوں گے یہ علاقہ جبال، اللہ کے بندوں سے ہمیشہ آباد رہے گا"۔ =

= ایک دفعہ آپ نے دورانِ کلام فرمایا۔ =

= "میں دیکھتا ہوں کہ ہمارا پہاڑ لعل و جواہر سے بھرا ہے۔ میں نے عرض کی حضرت اس سے کیا مراد ہے۔ فرمایا۔ دریائے معرفت کے وہ وہ انمول موتی و گوہر اس میں مخفی ہیں اور جن کی قیمت خدا کے اونچے بازاروں میں ہو سکتی ہے۔ جن کا خریدار خود پروردگار عالم ہوتا ہے۔ یہاں بازار عرفان کے یوسف چھپے بیٹھے ہیں۔ ان گدڑیوں کے لعلوں کی قیمت دنیا کے بازاروں میں نہیں ہوتی۔" =

= پھر فرمایا۔ دیول سے مجھے شرافت کی خوشبو آتی ہے۔ یہ شیرانِ غاب کا مسکن ہے۔ یہ بادشاہوں کی منزل گاہ ہے۔ اور فقر و شاہی کا گھوارہ ہے۔ =

= حضرت مرشدی اباجان نے ایک دفعہ میرے سامنے ایک خواب بیان فرمایا کہ میں اپنی مسجد شریف میں سویا ہوا تھا۔ غالباً قیلولہ کی نیند کا ذکر فرمایا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مسجد کی شمالی کھڑکی سے شیر کے غرّانے کی آواز آ رہی ہے اور حالت خواب میں آنکھ اُٹھا کر دیکھا کہ شیرِ بَبر اپنے دونوں پنجوں کو کھڑکی کے اندر کیے ہوئے ہے اور اس کا پُر جلال منہ اور چمکدار آنکھیں میری

طرف پوری آب و تاب سے متوجہ ہیں۔ میں گھبرا کر بیدار ہوا۔ ابھی اٹھ کر بیٹھا تھا کہ حضرت فقیر اللہ صاحب بکوٹی رحمتہ اللہ علیہ کے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی اور گھوڑا مسجد کے سامنے کھڑا تھا۔ حضور بکوٹی رحمتہ اللہ علیہ اس پر سوار تھے۔ میں فوراً استقبال کے لیے صحنِ مسجد کے باہر آ گیا اور گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ فرمایا۔

"عبداللہ قسم ہے اللہ کی کہ میں صرف تجھے ہی ملنے آیا ہوں۔ اور صرف یہ بشارت دینے آیا ہوں۔ کہ تیرے گھر وہ بچہ عنقریب پیدا ہونے والا ہے۔ جس کی میں نے بشارت دی ہے۔ عبداللہ تم بڑے خوش نصیب ہو تمہارا بیٹا اسلام کی پاسداری کرے گا"۔

# باب دوم

## حَسب و نَسب

میرے والد بزرگوار حضرت محمد عبداللہ القادری رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے عظیم ترین مدبرین و مفکرینِ دین میں سے تھے۔ اور صاحبِ قلب و نظر، صاحب زبان، صاحبِ قلم، صاحبِ طریقت اور صاحب حال وقال تھے۔ آپ کی زندگی میں آپ کو سب سے بڑی نعمت یہ میّسر آئی، کہ آپ کو زندگی کا جو ساتھی ملا یعنی آپ کی رفیقہٗ حیات بیوی وہ یقیناً آپ کے لیے وجہٗ عروج، وجہٗ اتقا اور وجہٗ طمانیت ثابت ہوا۔ ان دو نفوسِ قدسیہ نے مل کر اس انداز سے زندگی اور زندگی کے ان صفات عالیہ کو جو انہیں ورثہ میں ملے تھے محفوظ رکھا جس طرح ساحلِ سمندر کے ریگزاروں میں گوہرِ بے بہا محفوظ رہتا ہے۔ اور وہ کسی خوش نصیب کے حصہٗ قسمت میں آتا ہے اور وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح آپ نے اپنے اوصاف حمیدہ کو اپنے محدود وسائل کے ساتھ گمنام ہو کر پہاڑوں کے دامنوں میں چھپ کر محفوظ رکھا۔ تاکہ وہ سینہ بہ سینہ بعافیتِ تمام اولادوں اور نسلوں میں منتقل ہوتے رہیں اور انسانیت باقیات الصالحات کی صورت میں متواتر استفادہ کرتی رہے۔

حضرت والد بزرگوار نسباً علوی النسل تھے۔ مگر تفاخرِ نسبی سے اس

قدر گریزاں و ترساں رہتے تھے کہ کبھی آپ اپنی زبان پر بھولے سے بھی نسبی الفاظ نہیں لائے۔

فرمایا کرتے تھے۔ کہ نسب اگرچہ پاک لوگوں سے ہی کیوں نہ متعلق ہو۔ تاہم فیصلہ اعمال پر ہوگا۔ ورنہ بصورت دیگر بھی نیک اعمال ہی کام آ سکتے ہیں۔ محض زبان سے نسبی طور پر اظہار تفاخر کرنا بے سود ہوگا۔ بلکہ وبالِ جان ہو جائے گا۔ حسب و نسب کے ذکر میں اکثر یہ حدیثِ پاک پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔

کُلُکُم بَنُو اٰدمُ وَاٰدَمُ مِن تُرَاب

یعنی تم سب اولاد آدم ہو اور آدم کی اصل مٹی تھی۔

اس پر فرمایا کرتے کہ اچھے خاندان اپنی نیک روایات کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کی شرافت دنیا میں کئی اچھے خاندان بناتی ہے۔

میں نے والد بزرگوار کے ان نصائح کو کتاب و سنت اور تاریخ بنی نوع انسان کی روشنی میں بنظرِ غائر دیکھا۔ تجزیہ کیا تو اولادِ آدم کی حیثیت میرے سامنے آ گئی۔ یعنی افزائشِ نسل کے ساتھ ہی اولادِ آدم کو فروغ ملتا ہے اور اعمال کے مطابق درجات ملتے ہیں۔ نہ کہ نسباً اور پھر بعض لوگوں نے شرافت و شجاعت کے نیک کارناموں کے ساتھ انسانوں میں تاریخی شہرت پائی پھر ان کی معروف شخصیات کے ساتھ قبائل بننے شروع ہوئے۔ ان میں سے جو لوگ ضرب المثل کے طور پر نیک نام ہوئے۔ ان کو سیادت کے ساتھ یاد کیا جانے لگا۔ در حقیقت یہ شہرت کسی عملی تاریخ پر مرتب ہوتی ہے۔ نسلاً بعد نسل یہ تفاخر بھی کیا جانے لگتا ہے۔ کہ میں بڑے اعلیٰ حسب و نسب کا آدمی ہوں۔ مگر اعلیٰ حسب و نسب کے لیے بری

اولاد ننگ ناموس ہوتی ہے اور اچھی اولادیں بہزار حیلہ پوشیدہ رہنے کی کوشش کریں۔ مگر فطرت انہیں پوشیدہ نہیں رہنے دیتی۔ بلکہ ان کو زمانہ میں اس طرح نمایاں اور ظاہر کیا جاتا ہے۔ جس طرح خزاں زدہ اشجار سے بہاروں کے ساتھ کونپلوں، پھلوں اور پھولوں کو عیاں کیا جاتا ہے۔

ہر بہار کے بعد خزاں آتی ہے۔ خزاں پت جھڑ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مگر جن درختوں میں نمود پانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ان میں پھل پھول مستور و محجوب طور پر موجود رہتے ہیں۔

جوں ہی کاروانِ بہار کا ان پر گزر ہوتا ہے۔ ان کی مستور و محجوب صلاحیتیں کونپلوں پھلوں اور پھولوں کی صورت میں عیاں ہو جاتی ہیں۔ وہی خزاں زدہ اشجار جو چند ایام پہلے بے پھل اور بے پھول نظر آتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا یہ واقعتاً تہی دامن ہیں۔ مگر آج ساری نظروں کے سامنے ان کا دامنِ زندگی پر بہار نظر آنے لگتا ہے۔

بالکل اسی طرح اچھے لوگوں کی اچھی اولادیں اگر اپنی نیک صلاحیتوں کو اپنے وجود میں محفوظ و مستور رکھتی ہوئی چلی آئیں۔ تو راہ زندگی پر اگر بظاہر وہ کسی ایسی اُفتاد کا شکار ہو کر اپنے صفات خاندانی کو پامال بھی کر دیں تو جب کبھی بھی رحمت خداوندی بہاروں کی صورت میں ان پر گزرے گی۔ تو یقیناً ایسے شریف النفس خاندانوں کی مخفی صفات بہاروں کی طرح سر سبز و شاداب ہو کر سامنے آجائیں گی۔ اور وہ نباتات جو اپنی صداقتیں کھو بیٹھتی ہیں وہ بہاروں کی آمد پر بھی بے بہار ہی رہتی ہیں اسی طرح برائیوں کا پیہم شکار ہونے والی نسل انسانی اپنے خاندانی اثرات نیک کچھ مدت کے بعد زائل کر بیٹھتی ہے۔ ایسی نسلیں ننگِ خاندان ہو کر شریف خاندانوں کی بدنامی کا باعث بن

جاتی ہیں۔ مگر یہ بدنامی صرف ان ہی بداعمال لوگوں تک محدود رہتی ہے جو ننگ ناموس ہوتے ہیں۔ تاریخ ایسے لوگوں کو معاف نہیں کرتی مگر اسلاف کا نام بدستور ان کی تاریخ کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔ صرف نسلی امتیاز کے لیے ایسے لوگوں کو ننگِ خاندان کہہ کر اصولاً ان کو خاندان کی حقیقی عظمت سے الگ کر دیا جاتا ہے جس طرح صحت مند جسم کے کسی ایک عضو کے بیمار ہونے سے سب وجود کو بیمار نہیں کہا جاتا بلکہ جسم کے اسی ٹکڑے کو بیمار کہا جاتا ہے جو بیمار ہوتا ہے، اس کو صحت مند کرنے کے لیے وجود کی پوری صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں۔ مگر ناکامی کی صورت میں بعض دفعہ طبعیتِ انسانی اس بات پر بھی اتر آتی ہے۔ اور یہ فیصلہ قبول کر لیتی ہے کہ اس بے حد بیمار حصہ جسم کو جسم سے کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔ تاکہ یہ باقی وجود کی ہلاکت کا باعث نہ بن جائے۔

جیسا کہ حضرت نوح علیہ السّلام کے لختِ جگر نورِ نظر نے نافرمانی کی اور خاندانِ نبوت کے خلاف عادتِ مذمومہ کی پیروی کی اور برے لوگوں میں جا ملا۔ جس کے نتیجہ میں حضرت نوح علیہ السّلام جو اپنے کردارِ نبوت کے ساتھ اپنے جدِ اعلیٰ حضرت شیث علیہ السّلام کے مذہب پر کاربند تھے۔ اور من حیث الخاندان سلسلۂ تاریخِ نبوت تعمیر کر رہے تھے۔ کہ آپ کے جسم پاک سے اولاد کی ایک شاخ پھوٹی۔ جس کا نام آپ نے کنعان رکھا۔

یہ بیٹا اصلاً اولادِ نوح علیہ السّلام تھا۔

مگر عملاً نافرمان اور سرکش تھا ہر چند کہ باپ نے نصیحت فرمائی۔ اس نے ایک نہ سنی اور اپنی عادت کو پیہم بگاڑتا چلا گیا۔

نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اس پر امتحان کا زمانہ آپہنچا۔ طوفانِ نوح علیہ السلامؑ نے آگھیرا۔ لوگ پہاڑوں کی طرف بھاگے۔

حضرت نوح علیہ السّلام نے ایسی نازک ترین گھڑی میں نہایت شفقت کے ساتھ اپنے لختِ جگر بیٹے کو سمجھایا اور وہ الفاظ مبارکہ جو آپ نے اس وقت اپنے نورِ نظر کو بطور نصیحت بازگشت کے لیے ارشاد فرمائے۔ قرآن کریم ان کو مَن وعَن بیان کرتا ہے۔

آپ نے فرمایا۔

یٰبُنَیَّ ارکَب مَّعَنَا

اے میرے بیٹے اس طوفانی حالت میں میں نے بچاؤ کے لیے جو کشتی بنائی ہے۔ اس میں میرے ہمرکاب ہو جا۔ مگر بیٹے نے جواب دیا۔

قَالَ سَاٰوِی اِلیٰ جَبَل یَعصِمُنِی مِنَ المَاء

کہا اے باپ میں پہاڑ پر جا کر اپنا بچاؤ کروں گا۔

چنانچہ وہ اسی نافرمانی کی دوڑ میں طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ ایسی حالت میں نوح علیہ السّلام کی نظریں اس پر پڑیں۔ شفقتِ پدری جوش میں آئی۔ تو اپنے پروردگار کے حضور میں یوں التجا کی۔

"اے اللہ تو نے وعدہ فرما رکھا ہے۔ کہ نبیوں کی اولادوں کو دردناک ہلاکتوں سے مامون رکھوں گا۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ میرا لختِ جگر میری آنکھوں کے سامنے شکارِ طوفان ہو رہا ہے اور موت و زیست کے ہچکولے کھا رہا ہے اور ہلاک ہونے والا ہے۔ پروردگارِ عالم نے اپنے بندے نوح علیہ السّلام کو ان الفاظ میں جواب دیا جو بیٹے کی نافرمانی کے مطابق صحیح تھا"۔

قَالَ یَا نُوحُ اِنّہٗ لَیسَ مِن اَھلِکَ اِنّہٗ عَمَلٌ غَیرُ صَالِحٍ۔

اے نوح علیہ السّلام یہ درست ہے۔ کہ میں نے نبیوں کی اولادوں کی حفاظت کا وعدہ کر رکھا ہے جو اپنے باپ کے فرمانبردار ہوں۔ چونکہ وہ نیک ہوتے ہیں۔ مگر یہاں اس کے خلاف ہے اگرچہ آپ کا بیٹا آپ کا ہی لختِ جگر ہے مگر روایات کے خلاف بد عملی کا شکار ہو گیا ہے۔ اس واسطے یہ تیرے اہل سے نہیں ہے۔ یعنی نااہل ہے۔

حضرت نوح علیہ السّلام کا بیٹا عظمت نسبی کو بھول کر بد کردار لوگوں سے جا ملا تو اپنے خاندانِ نبوت کو اپنے ہاتھوں سے کھو بیٹھا۔

دنیا ایک پراسرار جگہ ہے اور یہ اللہ کے انعامات کا دسترخوان ہے اور اس میں جو کچھ ہے، سب سامانِ زیست ہے اور اس دسترخوان کا میزبان خود اللہ ہے اور اس کے مہمان انسان ہیں۔ اور انسان خاندانِ آدم ہیں۔ میزبان کی نظریں عموماً اپنے مہمانوں پر مروت والتفات کرتی ہیں۔ مگر میزبان اچھے اور بروں میں تمیز بھی کر لیتا ہے۔

جو مہمان اچھے ہوتے ہیں۔ انہیں عزت و تکریم کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اگر میزبان کوئی بادشاہ ہو اور مہمان رعیت ہو کر بھی بد اطوار ہو تو ایسا مہمان بادشاہ کی نگاہوں میں معتوب ہی ہو گا۔

اور اس طرح معتوب ہونا رعیت کے لیے سخت بد قسمتی کا باعث ہوتا ہے۔ اور ایسی بُری رعیت چاہے کیسی ہی الوالعزم کیوں نہ ہو۔ اپنے میزبان اور مربی کی نظر سے گر جاتی ہے۔ اور ایسی بے عقل و نادان رعیت بادشاہ کی نظر میں معتوب ہو کر یقیناً پسرِ نوح کی طرح ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس طرح جو لوگ اپنے میزبان و مربی کی نظر میں پسند آ جائیں۔ ان کو بڑی بڑی

مراعات سے نوازا جاتا ہے۔ جس سے ان کی عزت و تکریم سعادت مند خاندانوں کی صورت میں صفحۂ ہستی پر عروج مندانہ ظہور کرتی ہے۔ ایسے خاندان جنھوں نے بارگاہِ فطرت کے دسترخوانِ نعمت سے گونا گوں استفادے کیے اور اپنے میزبان و مربی کا شکرانہ ادا کیا۔ وہ اہل وفا سے ہیں۔ ان کی اپنے مربی و محسن سے وفا شعاری ہی ان کو اعلیٰ خاندان بننے کی حیثیت دیتی ہے۔

خاندان از خود نہیں بنتے بلکہ خدا کی رحمت و رافت سے بنا کر سامنے لائے جاتے ہیں۔ اور جب تک وہ اپنے مالک و مولا کے فرمانبردار رہتے ہیں۔ اس وقت تک ان میں خاندانی سعادت مندیوں کے اثرات موجود رہتے ہیں۔ جب کبھی یہ لوگ اپنے مالکِ حقیقی کے سامنے ادائیگی شکر میں تغافل شعار ہو جاتے ہیں۔ تو رفتہ رفتہ ان کا مالک و مختار ان کی پرتاثیر صلاحیتوں کو ان سے چھین لیتا ہے۔ جب خاندانوں کی نیک صلاحیتیں مفقود ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ تو یہی فقدانِ سعادت خاندانوں کو اپنی خداداد بلندیوں سے نیچے گرا دیتا ہے۔ پھر وہ مہتر سے کہتر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

اسلام میں شرافتِ نسبی کا بنیادی اور معیاری ماخذ انبیاء و مرسلین کی ذوات ہیں۔ جیسا کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اصلاب وارحام میں سفاحِ جاہلیت سے پاک رکھا۔ اور حضرت عبداللہؓ کی پُشت مبارک تک ان کو غلیظ اور پراگندہ اصلاب و ارحام سے مامون رکھتے ہوئے رحم مادر تک ان کو پہنچایا۔ چونکہ آپ فطرۃً پاک تھے۔ ہر پاک چیز، ہر پاک نظریہ، ہر پاک عمل، ہر پاک جسم و جان اور ہر پاک نطفہ کو اللہ تعالےٰ ہمیشہ ناپاکی

سے بچاتے ہیں۔

ہر حلال جانور کا دودھ اپنے مقام پر حلال ہے جب تک وہ جسموں میں رہتا ہے۔ اسے قدرت پاک رکھتی ہے۔ جب اسے دوھ لیا جاتا ہے اور کسی دوسرے برتن میں اسے منتقل کیا جاتا ہے۔ تب اس کے ناپاک ہونے کا اندیشہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

مگر پاکیزگی پسند لوگ دودھ کو پاک برتن میں دوھ لینے کے بعد بھی اسے پاک رکھتے ہیں۔ پاک برتن میں دودھ پاک رہتا ہے۔ اس کی شرافتِ اصلیہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مگر غیر پاکیزہ ہاتھوں میں جا کر وہی پاک و صاف دودھ ان خطرات کا شکار ہو جاتا ہے جو پاکیزگی کی ضد یعنی ناپاک ہوتے ہیں۔

دودھ ناپاک چیز لگنے سے ناپاک ہو جاتا ہے اور اس پر بحیثیت دودھ ہونے کے ناپاکی کا پورا پورا اطلاق ہو جاتا ہے۔

دودھ ہو کر اگر ناپاک ہو سکتا ہے۔ تو انسان زادہ نسلِ آدم ہو کر بھی بداحتیاطی سے اپنے خاندان کو ناپاک کر سکتا ہے۔ دودھ اصلی حالت میں بہتر ہوتا ہے۔ مگر ناپاک ہو جانے پر کمتر بن جاتا ہے۔

اسلام میں بہتر انسان کی تمیز تقویٰ پر ہے۔ اسلام اسی واسطے دین فطرت ہے کہ وہ ہر چیز کو پیمانۂ فطرت پر پرکھتا اور ماپتا ہے۔ وہ بلاصفتِ تقوی کسی حسب و نسب کا قائل نہیں۔ البتہ اسلام اچھے خاندانوں کی تعریف تاریخِ انبیا کے ساتھ کرتا ہے۔

حسب و نسب اچھی چیز ہے۔ اس سے صفاتِ خاندانی کا پتہ چلتا ہے کہ کتنی مدت العمر فلاں خاندان اپنی نیک روایات پر کاربند رہا ہے اور

اس روایاتی خاندان نے نسلِ انسانی میں کتنے بہتر خاندانوں کا اضافہ کیا ہے۔

اچھے خاندان دنیا میں تفاخر خاندانی بیان کرنے کے لیے نہیں آتے۔ بلکہ وہ دنیا میں نسلِ آدم کے بہت سے خاندانوں کو بنانے اور تعمیر کرنے کے لیے آتے ہیں۔

آدم علیہ السّلام کا سلسلۂ خاندانِ نبوت حضرت شیث علیہ السّلام تک باصفات کریمانہ اور شیث علیہ السّلام کا نوح علیہ السّلام تک اور نوح علیہ السّلام کا آگے چل کر ابراہیم علیہ السّلام تک اور ابراہیم علیہ السّلام کا سلسلۂ خاندان کریمانہ صورتوں میں منتقل ہوتا ہوا آخر الزمان سرور کائنات فخر موجودات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک اپنی پوری نیکیوں کے ساتھ آ پہنچا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

انّ اللہ اصطفیٰ اٰدَمَ و نوحاً واٰلَ ابراہیم واٰلَ عمِرانَ عَلیَ العلمینَ

تحقیق اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام نوح علیہ السلام اور آلِ ابراہیم اور آلَ عمران کو سب جہانوں پر فضیلت بخشی۔

یہ بزرگانہ انتخاب خاندانِ انبیاء کے لیے تھا۔ تاریخ نبوت سے ثابت ہوا۔ کہ انسانیت کے جدِّ اعلےٰ آدم علیہ السّلام تھے۔ جو صفتِ نبوت کے حامل تھے۔

اگر آدم علیہ السلام صفتِ نبوت کے بغیر محض خاکی آدم ہوتے۔ تو آدمیّت صرف حیوان نما جنس ہوتی۔ جس پر تکرم اور تشرف کا مطلقاً اطلاق نہ ہوتا

معلوم ہوا کہ خاندانِ انسانی کی جبلّت شرافت نبوت سے وابستہ کر دی گئی ہے۔ شرافت نبوت تقویٰ ہے۔ ہر نبی کا تقویٰ اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ بلند و برتر ہوتا ہے۔ اس واسطے اس کا خاندان بھی سب سے اونچا ہوتا ہے۔

فرعون، نمرود و ہامان اپنے زمانہ کے الوالعزم بادشاہ تھے۔ مگر ان کی خاندانی بوجہ تفاخر نفسانی ننگ انسانیت ٹھہری۔ آج اگر ان کی اولادیں فخر کریں گی تو فراعنہ کی تاریخ استکبار تاریخ ظلم و عدوان کے سوا انہیں کوئی چیز نہیں مل سکے گی اور ایسے تفاخر نسبی سے سوائے طاغوتیت کے اور کچھ بھی میسّر نہیں آسکتا۔ اولاد آدم میں سب سے بڑے اور اونچے، سب سے بلیغ و ممیز، سب سے ارفع اعلیٰ، سب سے زیادہ حسین و جمیل ترین شخصیت حضرت محمد الرسول اللہ ﷺ نے جس شرافت کی بنیاد رکھی، وہ تاریخِ اسلام اور تاریخِ سماوی میں اظہر من الشمس ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خاندانِ نبوت کے صفات امت میں کس طرح منتقل ہوسکتے ہیں۔ اس کے لیے یہ حدیث دلیل ہے۔

كُلُ تَقِيٍّ نَقِيٍّ فَهُوَ مِنْ اَهلِي

یعنی ہر متقی و پرہیز گار میری اہل سے ہے۔

اس حدیث سے قدرتی طور پر یہاں دو قبیلے بن جاتے ہیں۔ ایک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ اہل جسمانی جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسمانی قرابت دار ہیں اور ایک آپ کی امت کے متقی ہیں جو تعمیلاً آپ کے قریب ہیں۔

دونوں کی نیکی کے لیے حضور علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ ہر نبی کی

اولاد جہاں نبی اللہ کی اولاد ہوتی ہے۔ وہاں وہ نبی کی امت بھی ہوتی ہے ایک امت من حیث القرابت اور ایک امّت من حیثِ تقویٰ۔ ان دونوں پر احکاماتِ خداوندی یکساں طور پر عائد ہوتے ہیں۔ احکامات کا نفاذ سب کے لیے برابر ہوتا ہے۔

# باب سوم

## تقویٰ

عملی اعتبار سے جو زیادہ متقی ہو گا۔ وہی مقربِ خدا اور مکرم خدا ہو گا۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے۔

یاایُھَاالنّاسُ اِنّا خَلَقتکُم مّن ذکَر وَ اُنثیٰ وَ جَعَلتکُم شعُوباً وّقَبَائلَ لتَعَارَ فُوا اِنّ اکرَمکُم عندَاللہ اَتقکُم۔

یعنی اے لوگو! میں نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت کے جوڑے سے پیدا فرمایا۔ اور تم میں مختلف گروہ اور قبیلے بنا دیئے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ تم میں سے اللہ کے نزدیک وہی شخص بزرگ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

تاریخی اعتبار سے خاندانی تعارف کے بغیر نسلِ انسانی کی باہمی دقتیں، باہمی معاملات، باہمی تعلقات، باہمی کاروبار مشکل تھے۔ اس واسطے خاندانوں کی ضرورت کا وجود بھی ملتا ہے۔ جن کو شعوب و قبائل کہا گیا ہے۔ مگر تعارف میں خاندانوں کی عملی تاریخ کا بھی دخل ہوتا ہے۔ تعارف کے معنی پہچاننے کے بھی آتے ہیں۔ جاننا علماً بھی ہو سکتا ہے۔ مگر پہچاننے میں حسب و نسب، رہنا سہنا، علم و عمل، رنگ وطن، خدو خال سب داخل ہیں۔

لہذا خاندانی روایات کا اولاد آدم کے ساتھ موجود رہنا تعارف کے لیے اشد ضروری ہے۔ مگر حاصل کلام تکرم انسانیت تقوی پر ہے۔ اس تعارف خاندانی کے علاوہ بڑی صفت خاندانوں کی اللہ پر ایمان لانا اور اس کے بتائے ہوئے نیک اعمال کی بجا آواری کے ساتھ ہے۔ اس پر فضیلتِ انسانیہ کا انحصار رکھا گیا ہے۔ یہ حصر تقوی کے ساتھ مختص ہے

خاندانی روایات جن کا ظاہر تعلق صرف نسلاً بعد نسل چلتی پھرتی مٹی کی صورتوں سے ہے۔ جو رنگ و نسل کی صورت میں موجود رہتی ہیں اور ایک روایات خاندان عمل الصالحات ہیں جس میں گورے و کالے کی تمیز ختم ہوجاتی ہے۔ جس میں تقوی کو معیارِ شرافت قرار دیا جاتا ہے۔ حضرت بلالؓ حبشی النسل اور قریش عربی النسل کا معیار شرافت تقویٰ پر رکھا گیا ہے۔

چنانچہ حدیث شریف میں ارشاد ہوتا ہے۔

لَا فَضلَ لِعَرَبی علیٰ عَجمی اَلّا باالتقوی۔

سوائے تقویٰ کے کسی عربی النسل کو کسی عجمی النسل پر کوئی فضیلت و بزرگی نہیں۔

مسلمانوں کے لیے بجائے اپنی ذات، اپنے خاندان، اپنے علم و ہنر پر فخر کرنے کے خدا اور رسول پر فخر کرنا چاہیے۔ جن کی بدولت وہ اشرف المخلوقات کے مرتبہ کے ساتھ خیر الامم ہوئے۔ اسلامی شرافت یہ ہے کہ انسان اپنی انسانیت کے جوہر اصلیہ کے ساتھ بندگی کرے۔ اور اسے چاہیے کہ ہمیشہ اپنی ہر تعریفی حیثیت کی نفی کرے اور اپنے آپ کو منفی جانے اور اللہ تعالے کو مثبتِ حقیقی گردانے۔ وہ زندگی کی تمام قوتوں کا

منبع خدا کی ذات کو قرار دے۔ فی الحقیقت فقر و غنا ہی وہ خالصتاً نیکی ہے، جس کا ظاہر و باطن تزکیۂ نفس کے ساتھ پاک ہو کر اتنا خالص ہو جاتا ہے کہ اس سے کسی طرح بھی مضرات کا اندیشہ نہیں ہو سکتا۔

بشرطیکہ اس فقر و غنا کی بنیاد تقویٰ ہو اور جستجوئے حقیقت ہو۔ ایسا فقر بندگی میں اپنے لیے جس قسم کی آسودگی چاہتا ہے۔ وہاں دوسروں کے لیے بھی ویسا ہی چاہتا ہے۔

انبیائے کرام کی بنائے عمل تقویٰ تھا۔ اسی وجہ سے وہ انسانیت کے مونس و غمگسار تھے۔ دنیا سے الگ تھلگ ہو کر انہوں نے جو بھی تزکیہ و ریاضت کی اس کا منشا خدمت انسانی سے دوری نہیں تھا۔ بلکہ وہ ان نفسیاتی مہلکات کے خلاف بصورت جہاد مشق کرتے تھے جو انسانیت کے دلوں کو کسی طرح بھی دکھ دینے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

تمام انبیاء و مرسلین کے نزدیک اللہ کو پانے کے دو ہی ذریعے تھے۔ ایک خالصتاً اللہ کے لیے عبادات، دوسرے خالصتاً اللہ کی خوشنودی کے لیے اس کی مخلوقات کی بے لوث خدمات، جن کی انسانوں کو ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے۔

تمام انبیاء نے فقر و غنا کو اپنا اساسی دستور اس واسطے بنایا تھا۔ کہ اس طرز میں طبائع انسانیہ پر ملوکانہ دباؤ نہیں پڑتا۔

ریاضتوں کے زمانہ میں انہوں نے نور باطن کے ساتھ اللہ کی اتنی خوشنودی اور تقرب حاصل کر لیا کہ خدا نے انہیں انسانیت کے دلوں میں درجۂ امامت پر فائز المرام کر دیا اور امامت کے فرائض سونپنے کے بعد انہیں عبادات و معاملات عطا فرمائے اور دونوں کی ادائیگی کا حکم لوجہہ اللہ عطا فرمایا

اور انہیں بتایا۔ کہ اللہ سے ڈرنے والے ہی ان احکامات کی بجا آوری کر سکتے ہیں۔

ان کو طرز خدمت کے انداز سکھائے۔ جو فقر و غنا کی صورت میں بیک وقت عبادات کی انجام دہی اور بیک وقت خدمتِ خلق کی انجام دہی میں ان کی راہبری کرتے ہیں۔

جہاں جاہ و حشمت سے حکمرانی کی جائے وہاں دل آزاری کے امکانات موجود ہوتے ہیں اور وہاں دبدبۂ شاہی ہوتا ہے۔ جس سے لوگ لرزہ براندام رہتے ہیں۔ یہی لرزہ براندام ہونا انسانیت کو دکھ میں ڈالنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ اس خوف کی علامت ہوتی ہے جو اپنے جیسے ایک انسان کی طرف سے پیدا ہوئی ہو۔ بالآخر یہی دبدبہ انسانیت بعد میں ایک عظیم مردم آزاری اور جذبات کشی بن جاتا ہے جس سے انسانی حقوق بے دردی سے پامال ہوتے ہیں۔

بادشاہت کسی رنگ میں بھی ہو۔ چاہے آج کل کے جمہوری طریقوں پر مبنی ہی کیوں نہ ہو۔ حکمرانی بلا تزکیہ نفس، شاہی طمطراق کا باعث بنتی ہے لوگ ان کو دردناک اذیت محسوس کرتے ہیں اور ان کی ناکامی میں مسرت پاتے ہیں کہ ان کو دردناک دباؤ سے نجات ملی ہے۔ اس کے برعکس فطرت کے مقاصد کو جاننے والی ہستیاں اور صالحانہ تہذیب سازی کا صحیح اندازہ لگانے والی شخصیات اگر حکومت کریں گی تو ان سے صرف وہی ذہن اختلاف کریں گے جو جارحیت پسند ہوں گے، مگر عوام الناس بہر حال ان سے مطمئن رہیں گے۔

ایسے لوگ اگر کامیاب ہو جائیں تو عوام الناس کی خوشیاں ان کی

عاطفت میں پھلتی پھولتی اور سکون پاتی ہیں۔ اور اگر کسی وجہ سے یہ لوگ ناکام ہو جائیں۔ تو ایسی حالت میں عوام الناس کی روحیں سخت مایوس ہو کر پژمردہ ہو جاتی ہیں۔ مگر پھر بھی اچھے لوگوں کی تاریخ نہایت اچھائی کے ساتھ لکھی اور یاد کی جاتی ہے۔ یہ بحالتِ حکومت بھی اور بغیر حکومت کے بھی محبوب قوم ہوتے ہیں

انبیائے کرام سے اکثر و بیشتر برگزیدگانِ رب العالمین اسی راہِ حق میں قربان ہوئے۔ مگر ان کی تاریخِ مقدس عوام الناس کے ذہنوں میں محفوظ اور از بر رہی۔ جس کو نہایت حفاظت کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لا کر لوگوں تک پہنچایا گیا۔

وہ تمام شخصیات جنہوں نے بر بنائے تقویٰ تزکیۂ نفس کیا اور ہمہ وقت وہ ایک ایسی طاقت کے سامنے جواب دہ ہونے کے متعلق سمجھاتے رہے۔ جو انجام کی مالک ہے۔

بس اس میں ان کا یہی منشا تھا کہ لوگ خلوت و جلوت میں اس مالک و مختار سے ڈریں جس کے سامنے انہیں اپنا اور دوسرے لوگوں کے حقوق کے متعلق جواب دینا ہے اور اسی کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر حیاتِ دوام پا لیں گے۔ اور یہ کہ فطرت کی ناگہانی تعزیرات سے بچتے ہوئے نسلِ انسانی کی حفاظت کریں۔

یہ وہ فقر و غنا تھا جس نے تخت و تاج پر بھی اپنے غیر جارح وطیروں کو فراموش نہیں کیا۔ اور چٹائی پر بیٹھ کر بھی وہ وہ انسانیت نوازیاں کیں جن کی مثال نہیں مل سکتی۔

ان تمام نے اپنے سادے لباسوں، سادے مکانوں اور سادے

حالات کے ساتھ عوام کا ساتھ دیا اور دن بھر کی خدمت سے فارغ ہو کر رات بھر اللہ کی عبادت کی اور مخلوقات کی نجات و فلاح کے لیے دعائیں مانگیں۔

یہ لوگ قائم اللیل اور صائم النہار تھے۔ اکثر آبادیوں سے ویرانوں کی طرف زیادہ غور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک دنیا ایک ویرانہ تھی، جس کی ابتداء ویرانگی سے ہوئی اور جس کی انتہا بھی ویرانگی ہو گی۔ اسی واسطے وہ تجسس کے لیے پہاڑوں، بیابانوں اور خلوت گاہوں میں چلے جاتے تھے۔

آخر میں سرورِ کائنات، سلطانِ دو عالم محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف لائے۔ سب سے بڑی سطوت و جلالت کے مالک نے سب سے بڑی عاجزی کا اظہار فرمایا۔ آپ کے فقر و غنا کا یہ عالم تھا کہ آپ نے کبھی ایک مرتبہ بھی دنیا کو اس پسندیدگی سے نہیں دیکھا کہ اس سے کچھ خواہش پوری کر سکیں۔

اگر دنیا میں رہے تو محض اس واسطے کہ اس میں اولادِ آدم آباد ہے۔ جس کو ایک آخری اور کامل و مکمل ہدایت و خدمت کی ضرورت ہے۔

آپ نے مکہ و مدینہ کی پہاڑیوں میں جو عبادات انجام دیں اور جو جو تفکرات فرمائے ان سب کا منشا اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کے ساتھ انسانیت کو نجات دلانا تھا۔

آپ نے بال بچوں میں اور مکانات میں اس واسطے زندگی بسر کی کہ لوگ رہبانیت سے بچیں۔ اس فقر و غنا نے دنیا کے بڑے بڑے شہنشاہوں کے ایوانوں میں رعشہ پیدا کر دیا اور انسانی عوام کی آنکھیں بینا ہوئیں۔ انہوں نے زندگی میں خوشی حاصل کرنے کی فرصت پائی۔ ایک آخری فقر

وغنا نے پوری انسانیّت کو عبادت ربانی کے ساتھ آئینی حکومت دی جس کے ساتھ ساری انسانیت امان پا سکے اور بغیر کسی خوف و خطر کے راہِ نجات پر مسلسل اپنا سفر جاری رکھ سکے۔

آپ نے آخری نبی ہونے کی حیثیت میں جس فقر و غنا کا مظاہرہ کیا۔ وہی در حقیقت دستورِ فطرت ہے۔ سلطانِ دو عالم علیہ الصلوۃ والسلام کے آخری مرسلانہ فقر و غنا کا مطلب سمجھ جانے سے خدا کی خدائی اور خدا کا راز مل جاتا ہے۔

کامل فقرائے اسلام کے نزدیک دنیا میں ہر چیز میراث ہو سکتی ہے۔ مگر فقر و غنا صرف اسی کا ورثہ ہو سکتا ہے جو عقل و دل اور نگاہ سے اللہ تعالےٰ کا بندہ ہو جائے اور صرف اسی کا ہو جائے۔ دنیا اور اہل دنیا سے صرف اسی امید پر موافقت کرے کہ شاید اس طرح لوگ راہ راست پر آ سکیں۔

غلامی بہت سی صورتوں میں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں سب سے اونچی منزل و مقام بادشاہت ہے۔ سب لوگ بادشاہوں کے غلام ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ بادشاہ کسی کے غلام نہیں ہوتے۔ وہ انسانوں پر حکمرانی اس لیے کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے نفس کی خواہشات کو پورا کر سکیں۔

نفس وجود انسانی میں سب سے زیادہ غلیظ مقام ہے۔ جس طرح انسانی آبادی اور انسانی معاشرے میں انسانیّت نے کراہیّت کے اعتبار سے عفونت ناک چیزوں کو نچلا درجہ دے رکھا ہے اور کوئی شخص بھی کسی عفونت ناک چیز کی غلامی برداشت نہیں کرتا۔ اس واسطے کہ غلاظت سے

سب لوگ اجتناب کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح وجود انسانی میں نفس وہ مقام ہے۔ کہ جو ہمہ وقت غلاظت سے بھرا رہتا ہے۔ اس کا غلام چاہے شاہ ہو یا گدا، کہتر ہو یا مہتر انسان کا یہ تصور کہ بادشاہ غلام نہیں ہوتے یہ اس کی سراسر اور کھلی نادانی ہے۔ یہ نادانی اسے احساس کمتری میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس دنیا میں بھنگی سے اجتناب قانون فطرت کے خلاف ہے۔ اس واسطے کہ وہ معاشرے کی نہایت ذلت آمیز خدمت کرتا ہے۔ جو خدمت کوئی دوسرا کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا اس طرح وہ معاشرے کا ناقابل فراموش عنصر بن جاتا ہے۔ مگر نفس کی غلامی ہزار بیماریوں اور ہزار خرابیوں کی جڑ ہے۔ نفس کا غلام خود غرضی کا شکار ہو کر مکر و فریب پر اتر آتا ہے۔ نفس کا غلام مخدومیت کا پرستار ہو کر خادموں کی بہتات چاہتا ہے۔ اور جب بھی خدام کو خدمت میں کسی طرح بھی کم پائے ان پر دست ظلم دراز کرتا ہے۔ اور خدام کی طویل خدمات کو فراموش کرتا ہے۔ جس سے خدام کے دلوں کو بے حد صدمہ پہنچتا ہے۔ گویا کہ وہ جیتی جاگتی ظلم و ستم کی تصویر بن جاتا ہے۔

نفس پرست بخیل ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کا حق کھا کر پھر انہیں بھوکا رکھتا ہے تاکہ وہ کمزور ہو کر اس کے مقابل نہ آسکیں۔

نفس پرست کام چور ہوتا ہے۔ اس کی عادت ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ذاتی کام جو اس پر ایک فرض منصبی کے طور پر لازم ہوتے ہیں اور قابلِ ادائیگی ہوتے ہیں، دوسروں کے کندھوں پر ڈالتا رہتا ہے۔

اس کے مختصر سے دھندے جو صرف اس کی ذات یا اس کے خاندان تک محدود ہوتے ہیں۔ اس کی خود غرضی کی بنا پر ہزار کندھوں کے لیے وبالِ جان بنے رہتے ہیں۔

نفس پرست عیش و طرب کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اور اس عیش و طرب میں وہ بہتات سے ضیاع مال کرتا ہے۔ اور اس ضیاع میں جوں جوں وہ بڑھتا جاتا ہے۔ اس کے بے جا اسراف میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ جن کو پورا کرنے کے لیے اس کو خدام کے گاڑھے پسینے کی کمائی اپنی طرف کھینچنا پڑتی ہے۔ اس کھینچاؤ میں وہ ہزار حیلے بہانوں کی راہ نکالتا ہے۔ وہ اپنے اس دجل و کینہ اور فریبانہ ظلم کو مکمل کرنے کے لیے منصوبے بناتا ہے۔ اور ان کو جامہ پہنانے کے لیے نمائندے پیدا کرتا ہے اور بہت سے شریفوں اور سادہ لوح جانوں کو اذیت دینے کے لیے ان سے کام لیتا ہے۔

اس طرح بہت سے لوگ اخلاق باختہ ہو کر بادلِ ناخواستہ اس کی جماعت بن جاتے ہیں۔ وہی نمائندے ہاتھوں ہاتھ لے دے کر عادتِ شنیعہ کا سبق سیکھ لیتے ہیں۔ ان میں پیشہ ورانہ فریب بار بار ظلم وعدوان کو پھلنے پھولنے کا موقع مہیا کرتا ہے۔

نفس پرست دادِ عیش حاصل کرنے کے لیے بھی ان ہی مظلوموں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ جو اس کے جور و ظلم سے نڈھال، نیم جان ہو کر بے بسی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنی گوناگوں مصیبتوں میں کسی نفس کے بندے، عیش و طرب کے دلدادہ کو دادِ عیش دیں۔ چونکہ ایسا کرنے میں ان کے زخموں پر نمک پاشی ہوتی ہے۔ مگر نفس پرست ان دلوں کے زخمیوں، مجروحوں، بے بسوں اور بے کسوں سے ضرور دادِ عیش لیتے ہیں۔ اس طرح وہ ہمہ گیر ظلم کرنے کے موجد بن جاتے ہیں۔

نفس پرست حلم و تواضع سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کا تبسم، ان کی مروت، محض نمود و نمائش کے لیے ہوتی ہے۔

اور وہ صرف ان لوگوں سے ہی مصنوعی برتاؤ کرتے ہیں۔ جن کے ذریعہ ان کا نفس خوش ہو۔ ان کی اس مروت سے خدام کو کہیں جزوی حصہ بھی نہیں مل سکتا۔ نفس پرست ضمیر کے اندھے ہوتے ہیں۔ وہ بہت سے ایسے بھیانک جرائم کرتے ہیں اور ایسے گھناؤنے گناہ کے عادی ہوتے ہیں کہ معاشرے کا کوئی فرد ان کو برداشت نہیں کر سکتا۔

چنانچہ وہ ان کو پورا کرنے کے لیے زبان کی چوری، ہاتھ کی چوری، خلوت و جلوت کی چوری، کسی کے مال و جان و اولاد اور آبرو پر معاصی کے ساتھ ناکہ بندی کرنے کی چوری پر پردہ ڈالنے کے لیے جھوٹ بولتے ہیں۔

اپنی مصنوعی شرافت منوانے کے لیے دوسرے کو جھوٹ بولنے پر آمادہ کرتے ہیں اور اپنے عیب کو چھپانے کے لیے اپنے ساتھ بہت سے جھوٹوں کو نشوونما دیتے ہیں۔

دنیا میں جھوٹ نے جتنا فروغ حاصل کیا ہے۔ اس کے بانی نفس کے بچاری اور نفس پرست لوگ ہیں۔

عیش جرائم کی ماں ہے۔

حدیث شریف میں شراب کو اسی واسطے اُمُ الخبائث کہا گیا ہے کہ شراب عیش کی طرف لے جانے والی ہے اور شرابی عیش پرست ہونے کے بعد ضمیراً اخلاق سے محروم ہو کر ظاہراً نفسانی تہذیب کا دلدادہ ہو جاتا ہے۔

اس کا مذہب صرف یہ ہوتا ہے۔ کہ معاشرہ میں معزز مقام حاصل

کرو اور شریف کہلاؤ اور نفس کی خواہشات کو پورا کرتے چلے جاؤ۔ یہ خیال بنیادِ کذب پر قائم ہوتا ہے۔ جس سے برائیاں اور جرائم افزائش پاتے ہیں۔

نفس پرست کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وہ اپنی طرف سے ایسا مخترع مذہب پیش کرتا ہے۔ جس میں تن آسانی کی گنجائش ہو اور سختیِ منزل سے نجات مل سکے۔ اسی لیے وہ تاویلات سے کام لیتا ہے اور ان حقیقی راہوں کے نقوش ختم کرنے کے لیے ہر نئی سے نئی چال اختیار کر لیتا ہے۔ جن راہوں کے برحق ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ اس طرح دنیا میں مذاہب حقہ میں رخنہ اندازی کی تمام تر ذمہ داریاں بھی نفس پرستوں پر عائد ہوتی ہیں۔

اگر یہ نفس پرست سانپ کی طرح خوبصورت زہریلے ناگ دنیا میں نہ ہوتے تو انسانیت مذاہب حقہ پر چلتی ہوئی آخرالامر ضرور مذہبِ اسلام کے دامنِ عافیت میں پناہ لے کر نجات پالیتی۔

اس برگشتگیٔ حق و صداقت کی ذمہ داری بھی انہی نفس پرستوں پر عائد ہوتی ہے۔

# باب چہارم

## نظریۂ اسلام اور تقویٰ

مذہب اسلام ایسا نظریۂ حق ہے جس کی پہلی ضربِ کاری نفسِ امّارہ پر لگتی ہے۔ اسلام نفس کے مخالف نہیں۔ بلکہ نفس کی ان عادات کے خلاف ہے۔ جو انسان کو بہمیت کی طرف لے جاتی ہیں۔

اسلام کے نزدیک نفس کے جائز مطالبات پورے کرنا بھی تقویٰ میں داخل ہے۔ وہ نفس پر نظریات حقہ کے تابع لگام ڈالتا ہے۔ اسلام کے نزدیک اگر نفس پر ضوابط کی لگام نہ ڈالی جائے۔ تو یہ لوگوں کی حق تلفی کرنے سے باز نہیں آسکتا۔

نفس کی عادت آگ کے مانند ہے کہ اس کے سامنے جو ایسی چیز آجائے۔ جس کو آگ لگ سکتی ہو تو وہ اسے جلا ڈالتی ہے۔

یہ آگ کا قصور نہیں بلکہ آگ اہلِ عقل وارادہ کے ہاتھوں میں آنے کے بعد اگر کسی چیز کو جلا دے تو یہ قصور و جرم آگ لگانے والے کا ہوتا ہے۔

بعینہ نفسِ انسانی ارادۂ عقل کی معیت میں اگر جرم کرے، تو یہ نفس کا قصور نہیں۔ بلکہ اس ارادہ و عقلِ انسانی کا جرم ہے جس کی تحویل و تصرف میں نفس ہوتا ہے۔ یہ نفس بہائم و چرند و پرند کے پاس بھی ہوتا

ہے۔ مگر غیر مکلّف۔ اس واسطے کہ وہ عاقلانہ ارادہ سے مستثنےٰ ہوتے ہیں۔ ان کا نفس نفسِ محض ہوتا ہے۔ جو فارغ عن العقل ہونے کی حالت میں ان تکلّفات و قیود سے مُبرّا ہوتا ہے، جن تکلّفات میں نفسِ انسان مبتلا ہے۔

اسلام نے نفسِ انسان کو بہمہ وجوہ معراجِ تقویٰ کا باعث قرار دیا ہے۔ یہ نفس جنوں اور انسانوں کو بقیدِ عقل و فکر فہیمانہ تفویض ہوا۔ تاکہ فرشتوں کے بعد ایک ایسی مخلوق بھی میدانِ عمل میں آئے۔ جو نفس و شیطان کی کشمکش کی حالت میں تعمیلِ احکامات کی بجا آوری کر کے یہ ثابت کر سکے کہ خلافت ارضی کے صحیح حقدار انسان ہیں۔

جنات بھی صاحب عقل و شعور ہیں مگر ناری ہونے کی وجہ سے وہ مغلوب الغضب اور مغلوب الہوس ہیں۔ اس واسطے وہ انسان کے مقابلے میں مفضول ہیں۔ اور مقابلتاً تمام مخلوقات سے زیادہ ذمہ داریاں انسان پر عائد ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ اس کی معاشرت تمام مخلوق سے زیادہ دشوار ہے۔

انسان تمام مخلوقات سے افضل ہے۔ اس واسطے کہ اس کی راہِ حیات میں نسبتاً زیادہ تردّدات ہیں۔ وہ خاکی جسم رکھتا ہے۔ وہ خزینہ معرفت ہے، وہ آئینہ حق نما ہے۔ وہ سینۂ گیتی کی آبرو ہے۔ وہ ارض و سما کا نورِ نظر ہے۔ آتش، آب و باد و خاک اس کے چاکر ہیں۔ وہ بحر و بر پر متصرف ہے۔ سمندر کے سینے پر حکمرانی کرنے والا ہے۔ آسمان کی بلندیاں بھی اس کی رفعت حکیمانہ کے سامنے سر نگوں ہیں۔ جنات جیسی مہیب ترین مخلوق بھی اس کی کرامت کے سامنے عاجز اور دم بخود ہے۔

اس کے درِ عالیہ پر چرند و پرند اور جنات نے گدائی کی۔ یہ خاکی اپنی مُشت خاک میں وہ وہ اعجاز انگیز واقعات چھپائے ہوئے ہے۔ کہ ساری خلائق اس کے اعجاز کے سامنے ایک پابہ زنجیر نوکر کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسی واسطے عقیدۂ توحید کی امانت کا بار زیادہ اسی انسان زادے پر ڈالا گیا ہے تاکہ ایک ازلی و ابدی عقیدہ کے ساتھ انسان زادہ ہی بالآخر مقصدِ زیست کو جامۂ عمل پہنا سکے۔

اگر انسان نفس کی لااُبالی کا شکار نہ ہو۔ بلکہ نفس پر حکمران ہو جائے تو یقیناً وہ اللہ کی قدرت کا مظہر بن جائے اور نیکیوں کا جیتا جاگتا سرچشمۂ حیات بن جائے۔

دنیا میں جتنے قبیح ترین جرم پیدا ہوئے۔ ان کا بانی مبانی نفس ہے۔ اور نفس پرست لوگوں کے ہاتھوں میں نفس بداخلاق ہوتا ہے۔ جس نے نفس پر قابو پالیا۔ اس نے مقاصدِ حیات پر فتح پالی۔ وہ بامراد ہوا۔ فطرت کی تمام تائیدات اس کے شامل حال ہیں۔ وہی صاحب تواضع ہے۔ اور مردِ حق ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَہَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی ۔ فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی۔

قرآنِ کریم کی یہ آیت جنت کی بشارت ان ہی اہلِ ایمان کو دیتی ہے۔ جنہوں نے خوفِ خدا کی بنا پر اپنی خلوت گاہوں میں بھی گناہ کرنے کی جرأت نہ کی اور گناہ سے اجتناب کیا۔ اور اس سے دست کشی کی اور نفس کو بری خواہشات سے روکا۔ پس جنت ان کا ٹھکانہ ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالٰی نے نفس کے گناہ سے بچنے پر جنت کی بشارت دی ہے۔ جس کے کرنے کا کھلا موقعہ مل رہا ہو۔ اور کوئی روکنے والا نہ ہو۔ مگر گناہ سے صرف اس واسطے اجتناب کیا جا رہا ہو۔ کہ خدا دیکھتا ہے۔ یہ اجتناب عن المعاصی اسلامی تقویٰ سے ملتا ہے۔ جو بر بنائے ایمان باللہ میسر آتا ہے۔ اور متقی کے معنے ڈرنے والوں کے ہیں۔ اور خدا سے ڈرنے والوں کو ہی پرہیز گار کہا گیا ہے۔

اسلامی تقوے کی بنا خوف الٰہی پر رکھی گئی ہے۔ جو متقی کے دل پر مسلط ہو کر حکومت کرتا ہے۔ اور دل کو ہمیشہ اور ہمہ وقت خوف الٰہی میں مبتلا رکھتا ہے۔ اور جملہ وسواسِ شیطانی سبیلِ نفس پر دل کو متاثر کرتے ہیں۔

اور اگر دل ان سے متاثر ہو جائے۔ تو اقلیم جسمانی کا کوئی حصہ معاصی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور لامحالہ گناہ کی زد میں آ کر ارتکاب جرم کر لیتا ہے۔

جب قلب و نظر اور جسم کے مختلف اعضا و جوارح گناہ کرنے پر متحدہ طور پر کمر بستہ ہو جائیں اور بار بار ایسا کریں تو ان کا متفقہ ارتکاب پورے وجود کو گناہ کرنے کا عادی بنا دیتا ہے اور کچھ مدت بعد وجود عادتاً جرم پسند ہو جاتا ہے۔

یہ ڈرنے کی عادت پروردگار عالم نے فطرتاً ہر چرند و پرند اور ہر انس و جان حتیٰ کہ ہر ذی جان اور غیر ذی جان کو عطا کر رکھی ہے۔ اس ڈر کی بدولت ہر چیز سے خوف ختم ہو جائے تو وہ اپنے ضوابط سے الگ ہو کر بکھر جاتی ہے اور یہی بکھرنا استقامتِ شے کو متزلزل کر دیتا ہے۔ اور

یہی تزلزل انجام کار اس شے کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔
مگر انسانی خوف و رجا اور دوسری چیزوں کے خوف و رجا میں بڑا عظیم فرق ہے۔ دوسری چیزوں کا بے خوف ہونا صرف ان کی ذاتی تباہی تک ہی محدود ہوتا ہے۔ مثلاً پتھر کا اپنی جگہ سے لڑھک کر گر جانا، آگ کا بجھنا۔ چرند پرند کا تزلزل، صرف ان کی نجی زندگی تک ہی محدود ہوتا ہے۔
مگر انسان کا بے خوف ہو کر متزلزل ہونا پورے انسانی معاشرہ کو منتشر اور پراگندہ کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔
اسی طرح عوام سے خواص کی لغزش کہیں زیادہ معاشرۂ انسانیہ کے لیے پراگندگی اور زوال کا ذریعہ بن جاتی ہے۔
علماء و فضلاء قوم کی لغزش پورے عالم کی لغزش کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔

اذَ ضَلَّ العَالمَ ضَلَّ العَالَم

یعنی عالم دین کی لغزش و گمراہی ساری دنیا کی گمراہی کی مترادف ہے۔

اسلام میں تقویٰ کی زیادہ ذمہ داری علماء امت پر رکھی گئی ہے۔ اہل اسلام کو قرآن مجید کی زبان مبارک میں علمائے امت کے بارے میں وضاحت کے ساتھ تعلیم دی گئی ہے۔

وَلتکُن مِنکُم اُمّتہ یَدعُونَ اِلَی الخَیرِ وَیَا مُرُونَ بِالمَعرُوفِ وَیَنھَونَ عَنِ المُنکَرِ۔

یعنی تم میں ایک ایسے گروہ کا ہونا ضروری ہے۔ جو تمہیں نیکی کی طرف بلاتا رہے اور بدی سے منع کرتا رہے اور امت کو بھی اس تقویٰ کی

بنا پر بہتر امت قرار دیا گیا۔

اور فرمایا۔

کُنتُم خَیرَ اُمّتہ اُخرِجَت لِلنّاسِ تَامُرُونَ بِالمَعرُوفِ وَتَنھَونَ عَنِ المُنکَرِ۔

یعنی تم ہی تمام امتوں سے بہتر امت ہو۔ اس واسطے کہ تم لوگوں کو اچھائی کی طرف بلاتے ہو۔ اور برائی سے منع کرتے ہو۔

خود متقی ہو کر لوگوں کو نیکی کی طرف بلانا اور برائی سے منع کرنا ہی تقویٰ ہے۔ تقویٰ کے شرعی معنی خوف خدا کی بنا پر ہر قسم کی برائی سے بچنے اور ہر قسم کی نیکی کو اختیار کرنے کے آتے ہیں۔ اسلامی تقویٰ اطاعتِ امیر سے منسلک ہونے کے بعد ہی صحیح خطوط پر چلنے کے قابل ہوتا ہے۔

تقویٰ کوئی معمولی مضمون نہیں۔ بلکہ یہ مرجع العلوم والاعمال ہے۔ تمام علوم اسلامیہ صرف تقویٰ کی تعلیم دیتے ہیں۔ تقویٰ صرف نماز ہی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ مومن کی نیت سے لے کر جملہ باطنی خیالات اور اس کے ظاہری حرکات و سکنات اور اس کے اعمال صالح پر مکمل ہوتا ہے۔ یہ عمل کے لوازمات ہیں ان لوازمات کے بغیر نماز بھی مکمل نہیں ہو سکتی۔ اسلام کے ہر کام میں تقویٰ کو ملحوظِ خاطر رکھنے کی تاکید ہے۔ یہ نہیں کہ صرف بوقت نماز ہی خوف کرے۔ اور بوقت معاملات اس کو فراموش کر دے۔ عبادات و معاملات صرف کامل خوف ورجا سے پایۂ تکمیل تک پہنچتے ہیں۔

بلکہ اسلام میں ہر شعبۂ زندگی میں چھوٹے بڑے عمل کے ساتھ ساتھ

خوف الہی کو جاری و ساری رکھنے کا حکم ہے۔ اسلام میں تقویٰ چونکہ اساسِ اعمال ہے۔ لہذا اس کے لوازم بھی نسبتاً دوسرے امور کے زیادہ ہوں گے۔ ان لوازمات میں روحانی و مادی دونوں لوازم داخل ہیں۔ کچھ تو ارکانِ تقویٰ ہیں۔ اور کچھ معاونِ تقویٰ ہیں۔

اللہ تعالےٰ اور اس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لانا۔ نماز، روزہ، حج و زکوۃ کی پابندی کرنا، آسمانی کتابوں پر ایمان رکھنا۔ یعنی تورات، انجیل، زبور اور آخری کتاب مقدس قرآن مجید پر اور قیامت پر کہ وہ ضرور آئیگی جس میں شاہ و گدا سب کو جواب دہی کرنی ہو گی۔ یہ تقویٰ کے بنیادی ارکان ہیں۔ ان میں اول الذکر اور ثانی الذکر کی عدم موجودگی میں ایمان حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ لہذا معدوم الایمان اس تقویٰ کا سرے سے دعویٰ ہی نہیں کر سکتا۔ جس کی اسلام تاکید کرتا ہے۔

بنا بریں تقویٰ کے لیے سب سے مقدم اللہ تعالےٰ اور اس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لانا ہے۔

اولیائے امت و صلحائے امت نے فرمایا۔

کہ ہمہ وقت اپنے باطن میں جھانک کر دیکھ لیا کرو۔ کہ خدا اور رسول کے بارے میں کہیں ایمان میں تزلزل تذبذب یا ضعف تو پیدا نہیں ہوا اور اس بات کے معلوم کرنے کا بہتر طریقہ یہی ہو سکتا ہے۔ کہ یہ معلوم کیا جائے کہ دل میں ماسواء اللہ کی محبت کے کوئی دوسری محبت زیادہ تو نہیں ہو گئی۔

پس ایمان کے قوی اور ضعیف ہونے کی یہی دو علامات کافی ہیں۔ کہ کیا شریعت پر چلنے کے لیے رغبت ہے اور دوری شریعت شاق گذرتی

ہے۔ کیا خوف خدا کی کمی ہے اور شریعت پر چلنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

پس ایک حالت، ایمان کے صحت مند ہونے کی علامت ہے اور دوسری حالت، ایمان کے ضعیف ہونے کی دلیل ہے۔

اگر ایمان قوی معلوم ہو۔ تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اور اس کی حفاظت کے لیے باوضو ہو کر حرام سے بچنا چاہیے۔ اور نماز قائم کرنی چاہیے۔ اور سچ بولنے کی عادت پیدا کرنی چاہیے۔ پھر بار بار توبہ کے ساتھ کردہ اور ناکردہ گناہوں سے رجعت الیٰ المغفرت کرنی چاہیے توبہ و استغفار انسانی بدن کا وہ جھاڑو ہے۔ جس سے روزمرّہ بدن کے گھر کو پاک و صاف کیا جاتا ہے۔ جس طرح گھر کو جھاڑو سے صاف کیا جاتا ہے۔ گھر میں جتنا زیادہ جھاڑو دیا جائے۔ گھر اتنا ہی زیادہ پاک و صاف رہتا ہے۔ جھاڑو جتنا کم دو گے اتنا ہی صفائی کم ہو گی۔ بالکل بعینہ مومن جتنا زیادہ استغفار پڑھتا ہے۔ اتنا ہی زیادہ اس کا باطن صاف و شفاف رہتا ہے۔ مومن کا دل عام نہیں۔ بلکہ وہ اللہ تعالےٰ کا مسکن ہونے کی بنا پر خاص الخاص ہے۔

حدیث شریف۔

قَلبُ المُؤمِنِ عَرشُ اللهِ۔

مومن کا دل اللہ کا گھر ہے۔

اور کون ایسا صاحب گھر ہو گا۔ جس کو اپنے گھر آنے کا شوق نہ ہو۔ ہر مالکِ خانہ اپنے گھر میں آنا پسند کرتا ہے۔ ہر مالک کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کا گھر نہایت پاک و صاف ہو۔ تاکہ وہ جب بھی گھر آئے۔ تو گھر کی صفائی و پاکیزگی اس کے لیے مزید وجہ طمانیت ہو۔ یہ مثال تو عالمِ مجاز کی ہے۔

ایک مالک خانہ طبعاً طہارت پسند ہو اور وہ اپنے بال بچوں کو اور چاکروں کو یہ تلقین کرے کہ میں اسی وقت گھر آیا کروں گا۔ جب میرا گھر بار اور اس کے گلی کوچے بے حد صاف و شفاف ہوں گے۔ اگر ایسا نہ ہوا۔ تو میں گھر نہیں آیا کروں گا۔ میرا نہ آنا تمہاری غفلت اور نادانی پر محمول ہو گا۔

چنانچہ مالکِ خانہ کی اس شرط کو اگر پورا نہ کیا جائے تو بنا بریں زمانہ دراز گذر جانے تک بھی مالک گھر گھر واپس نہ تشریف لائے تو اس شرط بالمشروط کے ایفا نہ ہونے پر مالک کا نہ آنا عین صداقت پر مبنی ہو گا۔

یہاں قصور اہل خانہ کا ہے۔ جنہوں نے شرطِ طہارت کے مواعید پورے نہ کیے اور اس طرح گویا مالک خانہ کو عمداً رو کا یا ناراض کیا گیا۔

اتفاق سے بعض دفعہ مالک خانہ اپنی ذاتی التفات کی بنا پر گھر کی جانب آتا ہے۔ مگر گھر کے قرب و جوار کو غلیظ در غلیظ پاتا ہے۔ تو وہیں سے واپس ہو جاتا ہے۔

چونکہ وہ طبعاً طہارت پسند ہے۔ اس کی تمنا تھی کہ وہ اپنے گھر جائے۔ بال بچوں سے ملے مگر اس کے بال بچوں نے یا چاکروں نے اس کی منشا کے مطابق اس کے احکامات کی تعمیلاً بجا آوری نہ کی۔ جس کی بنا پر مالکِ خانہ واپس ہو جاتا ہے۔

اس واپس جانے میں مالک مکان کا قصور نہیں۔ بلکہ اہل خانہ کا قصور ہے۔ جنہوں نے گھر کو بوجود حکمِ و منشائے مالک کے پاک و صاف نہ کیا۔ یہ مثال تو مجازاً پیش کی گئی ہے۔ حقیقتاً مومن کا دل اللہ تعالےٰ کا گھر ہے۔

یعنی اللہ تعالےٰ کا مومن کے دل میں گذر رہتا ہے۔

اور یہاں قَلبُ المُؤمِنِ عَرشَ الله فرمایا۔ قَلبُ الانسَانِ عَرشُ الله نہیں فرمایا۔

اس عرشُ اللہ کی قید بالایمان ہے۔ اور اسلام نے صاحبِ ایمان پر ہی ظاہری و باطنی طہارت کی قید لگائی ہے۔

قدرتی طور پر ایمان باللہ سے نجاست کفریہ تو معدوم ہو جاتی ہے۔ صرف نجاست بدنیہ ظاہریہ کا حکم اس پر مستزاد ہوتا ہے۔ تاکہ مومن ہمہ وقت ظاہری و باطنی طہارت کا پیکرو مجسمہ رہے۔

اس حالت مطہرہ میں پروردگار عالم مومن کے دل پر اترتے ہیں۔ اور اجلال فرماتے ہیں۔ جس سے مومن کے دل میں زیادہ خشیت پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ ذکر و فکر الہیٰ میں حظ پاتا ہے اور اس کے ساتھ اسے طمانیت ملتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَلَا بِذِکرِالله تَطمَئِنُ القُلُوبُ

خبر دار یاد رکھو۔ کہ اطمینانِ قلبی کا دارومدار ذکرِ الہیٰ پر موقوف ہے۔ یہاں ذکر الہیٰ کی ادائیگی سے مراد ذکر مومن ہے۔

ویسے تو ساری مخلوقات اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے۔ مگر سوائے مومن کے اللہ تعالےٰ کسی کے دل پر اپنی محبت خاص سے متمکن اور جلوہ افروز نہیں ہوتے۔

ایمان کے بعد عَمِلُواالصّٰلِحٰت اور پیہم استغفار سے ہی مومن کا دل پاک و صاف رہتا ہے ایسی حالت میں مومن کا دل زیادہ سے زیادہ یاد الہی کا مرکز ہو جاتا ہے۔ اور اللہ بار بار مومن کے دل پر اترتا اور اجلال فرماتا ہے۔

اس کیفیت سے مومن کو بار بار معراجِ ایمانی نصیب ہوتی ہے۔ اور وہ نماز پڑھتا ہے۔ اور دوسرے حقوق ادا کرتا ہے۔ اس کا دل نورانیت رحمت سے عرفان پاتا ہے۔یہی معرفت کی اصل ہے۔

اگر کیفیتِ ایمانی میں سرِ مو بھی فرق واقع ہو۔ تو نورِ معرفت قلب و نظر میں کم ہو جاتی ہے جس سے طمانیت قلب مومن بھی کم ہو جاتی ہے۔

مومن کی مطہرانہ عملی زندگی اور اس کے کم و بیش ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی طمانیت و نورانیت قلب میں بھی کمی بیشی واقع ہوتی رہتی ہے۔

جب وہ طہارت کے ساتھ اعمالِ صالحہ کی ادائیگی کرتا ہے۔ تو اپنے آپ کو اللہ تعالےٰ کے زیادہ قریب پاتا ہے۔ جب وہ ان اوصافِ حمیدۂ مومنانہ میں کمی کرتا ہے۔ تو اپنے آپ کو اللہ تعالےٰ سے دور پاتا ہے۔

یعنی اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت و اطاعت کم ہو جاتی ہے۔ ایسا کرنے سے دل کورانہ مرض کا شکار ہو کر یادِ الٰہی سے غافل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالےٰ کی ذات پر شبہ کرنے لگتا ہے۔ اس سے زوالِ ایمان کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بچائے۔ اور ایمان پر ثابت قدم رکھے۔ آمین

# باب پنجم

## نفسِ امّارہ
## اور
## نفسِ لوامہ

نفس کی بے ہودگی، نفس کی طفلانہ خیالی، نفس کی بے جا ضد، نفس کی عادتِ قبیحہ، نفس کی طغیانی، نفس کا جوش و مستی، نفس کا فکرِ ثواب اور خوفِ عذاب سے تغافل۔ نفس کی حق سے برہمی، اور حق کے سامنے دیدہ دلیری، نفس پرست کو ہر برائی کا شکار بنا دیتی ہے۔

اور وہ برائی کو اپنا مستقر اور ٹھکانہ اور اپنی جائے رہائش بنا لینے پر مصر ہو جاتا ہے اور اس کی جملہ آماد گیاں برائی ہی کے لیے وقف ہو جاتی ہیں۔

وہ زہرِ ہلاہل کو تریاق سمجھ کر کھا لیتا ہے اور پھر اس پر فخر کرتا ہے۔ وہ تہذیب و تمدن انسانیت کی بلندیوں سے گر کر بد اخلاقی کو ہی اپنا ملجا و ماوٰی گردان لیتا ہے۔ وہ ہر سعادت کو سخت کرخت نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ ہر نیکی سے چیں بجبیں ہو کر اس سے اجتناب کرتا ہے۔ وہ نیکی پر استہزاء کرتا ہے۔

اس طرح وہ فطرت کو ناراض کر لیتا ہے اور ایک ایسے بے وفا نفس کی دوستی کو دوستی حق و صداقت پر ترجیح دیتا ہے۔ جو کسی طرح بھی اس کے لیے سود مند نہیں ہو سکتی۔

وہ حق کو چھوڑ کر ایسے دوست کو اپنا دوست بنا لیتا ہے۔ جو آسودگی میں اس سے مختلف اور بے جا مطالبات کے ساتھ ھل من مزید کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جو اپنی عارضی تشنگی، عارضی خواہش کو بجھانے کے لیے زیادہ مطالبات منواتا ہے۔ مگر اس کی بے وفائی کا یہ عالم ہے۔

غیر آسودگی میں، بیماری و کلفت میں منزلِ مقصود سے پہلے ہی کسی سخت ویرانے میں ساتھ چھوڑ دینا اس کی عادتِ قدیمہ ہے۔ جب ضرورت نہیں ہوتی۔ مانگتا ہے اور جب ضرورت ہوتی ہے۔ تو انکار کرتا ہے۔

سخت مرض کے عالم میں طبیب کی رائے پر دوائی سے انکار کرتا ہے۔ اور اپنے لاڈلے پن کی طفلانہ صورتیں بنا بنا کر دوائی کھانے پینے کی چیزوں سے اپنے متنفرانہ تیوروں کے ساتھ انکار کرتا ہے اور ہر شفا بخش چیز سے بھی اجتناب کرتا ہے۔

سخت خوفناک منزل میں جب انسان کو صبر و استقامت، ہمت و جرات اور عظیم حوصلہ کی راہنمائی کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ وہاں انتہائی بزدلی کا مظاہرہ کرتا ہے اور راہِ راست پر شدائد کے مقابلے سے جی چرا کر پیٹھ دکھا کر راہِ فرار اختیار کرتا ہے۔

بیماری میں دوائی سے اجتناب میدانِ جنگ اور شدید حالات میں پیٹھ پھیرنے کی دعوت سب ہلاکت میں ڈالنے والے مشورے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسی آرا ہلاکت خیز ہوتی ہیں۔

یہ سب سے بڑا مکّار، بڑا عیّار، کام چور، بے وقت مصیبت میں ڈالنے والا اور ناگہانی آفات میں معاً ساتھ چھوڑنے والا، منزلِ زیست میں سخت مشکل ترین منازل میں ساتھ چھوڑنے والا، اپنوں سے بیگانہ کرنے

کے بعد تنہا چھوڑ کر بھاگ جانے والا اور اغمام میں اضافہ کرنے والا، بے بسی کے عالم میں اوندھا گرا کر دبک جانے والا بے وفا دوست نفس ہے۔ یہ محض لذات کا خوگر ہے۔

اور قدرت نے تو نفسِ انسانی کو جائز طریقوں پر رکھنے کے بعد ایک بہلاوے کا سامان بنایا تھا۔ تاکہ انسان اس مسافر خانہ عالم میں تھک کر رک نہ جائے۔ بلکہ بوقتِ ضرورت جائز طور پر اس کے پاس مطالبات کا ہونا بھی ضروری ہے۔

وہ جائز طور پر بحالتِ بلوغ شادی کر لے۔ اور جائز اولاد حاصل کرے۔ اور ان سے مانوس ہو۔

اچھی روزی کمائے۔ خود بھی کھائے۔ اور ساتھ اپنے بال بچوں کو کھلائے۔ دوسرے حاجتمندوں کے جائز مطالبات پورے کرے۔

اپنے احباب و اعزّا کی بھی مدد کرے۔ اس سے یتیموں، بے کسوں، مفلسوں اور قلاشوں کی خدمت بھی انجام دے۔ پڑوسیوں کے حقوق کی بھی نگہداشت کرے۔ والدین اور ذوی القربیٰ کا حصہ بھی ادا کرے، مسافر اور بیمار پر بھی نظر رکھے۔

تاکہ وہ ایک طرف جائز مطالبات کے ساتھ ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو۔ تو دوسری طرف منزلِ مقصود پر اپنا سفر جاری رکھ سکے۔ نہ ہی نفس کو مار دے۔ اور نہ ہی نفس کے ہاتھوں مارا جائے۔

نفس کی تخلیق کا منشا درحقیقت یہی تھا۔ مگر انسان زادے نے شیطان کے وسوسہ پر ہمیشہ نفس کی بے ہنگم باتوں اور اس کی چاپلوسیوں کی حمایت و تائید کی۔

بار بار اس کے ہاتھوں فروخت ہوتا رہا۔ اور بار بار اس کے ہاتھوں شکست کھاتا رہا۔ پھر بھی باز نہ آیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان کو راہبرِ کامل کی اشد ضرورت ہوتی ہے اور راہبر بھی ایسا ہو۔ جو اس کی نفسانی شوخیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے بار بار ہدایت کی طرف بلاتا رہے۔

جب بھی اس کے ذہن میں اچھی بات اثر کرے گی۔ تو سنبھل جائے گا اور راہِ راست پر چلنا شروع کر دے گا۔

نفس اچھا بھی ہے۔ نفس برا بھی ہے۔ قرآن مجید میں اس کو دو ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔

نفسِ امارہ برا نفس جو برائیوں کا شکار ہو جائے اور نفسِ لوامہ نیک نفس، جو نیکیوں کا حامل ہو اور نیکیوں کا خوگر ہو۔ اور نیکیوں پر ایمان رکھتا ہو۔ کہ نیکی انجام کار نجات کا قطعی ذریعہ ہے۔

نفس جب نیکیوں کا عقیدۃً خوگر ہو جاتا ہے تو وہ ضوابط پر اس لیے مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا انجام عافیت والا ہو گا۔ وہ اپنے حال کو مستقبل کی امید پر نیکی کے لیے مستعد رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ نفسِ مطمئنہ ہو جاتا ہے۔

بہت سے مطمئنین کی تعریفیں اولیاء اللہ نے اپنے تذکروں میں ذکر کی ہیں۔ چنانچہ حضرت مائی رابعہ بصریہ رحمتہ اللہ علیہا کا ذکر ہے۔ کہ آپ جب قریب الوصال ہوئیں۔ تو ایک کمرہ میں صاحبِ فراش تھیں اور زبانِ پاک پر بار بار اپنے مولا کا نام جاری ہو رہا تھا۔ معاً اپنے مصاحبوں سے ارشاد فرمایا۔ کہ میرے مہمان آ گئے ہیں۔ لہذا تم لوگ باہر تشریف لے جاؤ۔

سب باہر تشریف لے گئے۔ اور دروازہ بند کر دیا۔
لوگوں نے دیکھا۔ کہ دروازہ از خود کھل کر پھر بند ہو گیا۔ اندر سے حضرت مائی رابعہ بصریہ رحمتہ اللہ علیہا کی زبان مبارک سے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھنے کی آواز آئی۔

یاَیَّتُھَا النّفس المطمئنۃ ٥ ارجِعِی
الیٰ ربک رَاضِیَۃ مرضِیّۃ ٥

یعنی اے نفس مطمئنہ اپنے پالنے والے کی طرف اپنی رضا و رغبت سے رجوع کر لے۔

موت تمام مہیب حالات سے مہیب تر حالت ہے اور حالت موت میں اطمینان کلفت موت کے سبب معدوم ہو جاتا ہے۔ ہذیان و پریشانی کی انتہا ہوتی ہے۔

جبکہ سوائے درد و کرب و آہ و بکا اور خوف نزع کے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ اپنے عزیز بھی بھول جاتے ہیں۔ بس موت جان پر آ پڑتی ہے اور موت ہی موت کا گھراد باؤ مسلط ہوتا ہے۔ کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا۔

ایسی حالت میں زندگی کی بحالی کے لیے ایک موہوم امید کے ساتھ مرنے والا ہاتھ پاؤں مارتا اور ایڑیاں رگڑتا ہے۔ چہرہ پر خوف و ہراس کے آثار ہویدا ہوتے ہیں۔ جس سے ہر ایک دیکھنے والا بخوبی اندازہ کر لیتا ہے۔ کہ مرنے والا اپنی اس حالت زار سے سخت پریشان اور بیکل ہے۔

یہ حالت کسی پر بھی واقع ہو سکتی ہے۔ مگر مطمئنین اس حالت کو بھی زندگی کا ایک مرحلہ قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک یہ مرحلہ محبوب کے ملنے کی آخری منزل ہوتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ واقعہ ہونے والا تھا۔

اور ہو رہا ہے۔

ان کے نزدیک ان کی موت بے مقصد نہیں ہوتی۔ وہ اس کو ناگہانی نہیں سمجھتے۔ بلکہ قادر و قیوم کی رضا تصور کرتے ہوئے باالاستقامت اس منزل سے گزرنے کی دعا کرتے ہیں۔

اور قادر و قیوم کی قدرت کے مظاہرین سے اس ہیبت انگیز واقعہ کو بھی ایک معاہدہ جانتے ہیں اس کا نام لے کر اس سے اعانت چاہتے ہیں۔ اور مسنونہ دعا پڑھتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اَعِنّی فِی سَکَرَاتِ المَوت

اے اللہ سکراتِ موت میں میری مدد فرما۔

یہ لوگ ہمیشہ

اِنَّ صَلٰوتیِ وَ نُسُکِی وَ محیَایَ وَمَمَاتِی للہِ رَبِّ العٰلَمِینَ

کو ہی نظریہ حیات جانتے ہیں۔

یعنی میری نماز، میری قربانی، میری زندگی، میری موت پروردگارِ عالمین کے لیے ہے اور ہمیشہ ہر حال میں انّاللہ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون کا ورد کرتے ہیں۔ اور کلمہ طیّبہ اس لیے ہمہ وقت وردِ زبان رکھتے ہیں۔ کہ خدا جانے کب موت آجائے۔ اور اللہ کے نام سے محروم ہو جائیں۔

ان کے نزدیک سب سے بڑی کمائی ذکر اللہ ہے۔ وہ ذکر اللہ پر ہی زندہ رہتے ہیں اور ذکر اللہ ہی ان کی خوراک ہوتی ہے۔ ذکر اللہ ہی ان کا زادِ راہ ہوتا ہے۔

وہ اسی ہنگامہ ذکر کے ساتھ موت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ اور اسی ذکر کی معیت میں قبر، حشر و نشر کے خواستگار ہوتے ہیں۔

چنانچہ انجام کاران کو اس ذکر پاک کے ساتھ ظفر مندی ملتی ہے۔ اور موت کی آنکھ میں محبت کی آنکھ ڈال کر اپنے محبوب سے مل لیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی طبعی موت یا شہادت کی موت سے ہر طرح اپنے محبوب کے درِ اقدس پر حصولِ دیدار کے لیے دستک دیتے رہتے ہیں۔

یہ لوگ نفسِ مطمئنہ کے مالک ہوتے ہیں۔ یہی لوگ فرِحین اور مُستَبشرِین کہلاتے ہیں یہی لوگ نیکیوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔

انہی کی حکومت اللہ تعالےٰ کو پسند ہوتی ہے۔ یہی لوگ حزب اللہ ہوتے ہیں۔ انہیں کے متعلق ارشادِ باری تعالےٰ ہے۔

اَلَا اِنَّ حزبَ اللہ ھُمُ الغٰلبُونَ

یعنی خبردار رہو کہ یہی لوگ اللہ تعالیٰ کی جماعت ہیں۔

یعنی خبردار رہو کہ اللہ کی جماعت ہی وہی جماعت ہے۔ جو غالب و کامران ہے۔ جو ہمیشہ غالب رہیں گے فی الحقیقت وہی گروہ اللہ کا گروہ کہلانے کا مصداق ہو سکتا ہے۔ جو اس کا مقتضی ہو جائے اور مقامِ بندگی کو ہمہ وجوہ جانتا اور پہچانتا ہو۔

اللہ کی جماعت اپنے تعمیلی اوصاف کی بنا پر اللہ کو راضی کر لیتی ہے۔ اور اللہ کو راضی کر لینا ہی اس کی سب سے بڑی فتح مندی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کی جماعت جب اپنے اور مولا کے مابین راضی نامہ کر لیتی ہے۔ تو اسے اپنے مالک و مختار کی جانب سے جو بڑا تحفہ ملتا ہے۔ وہ ذکر خدا بالفکر صالحہ ہوتا ہے۔

جب اللہ کے بندوں کی جماعت خفی و جلی حالتوں میں اپنے خدا کی یاد کو ہی اپنے لیے ذریعہ نجات گردان لیتی ہے۔ اور ذکر و فکر ہی اس

جماعت کی خوراک بن جاتی ہے۔ تو اس حالت میں اللہ کی ذاکر و متفکر جماعت کو اپنے مالک کی طرف سے دوسرا تحفہ جو مقصد بندگی کی جزائے خیر کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ یعنی اطمینانِ قلب جیسی نعمتِ عظمیٰ اسے دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ خود خدائے لم یزل کا وعدہ ہے۔

اہل ذکر و فکر کو اطمینان و سکون بھی ہوتا ہے۔ یہ اطمینان اصل سے متعلق ہو کر دلوں میں راہ پاتا ہے۔

بندوں کی جماعت اس متاع طمانیت کی معیت میں مزید بندگی کی راہ پالیتی ہے۔ اس طمانیت سے مراد خدا کو پا کر اس کی حمد کو پالینا مراد ہے۔

غلبہ پانے کی کئی حالتیں ہیں۔ اصل غلبہ وہی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی تائید سے حاصل ہو۔ ورنہ انجام کار ہر غلبہ صاحبِ غلبہ کے لیے علامتِ زوال بن جاتا ہے۔

جیسا کہ اہلِ نمرود بندگانِ نفس کے غلبہ کا حال آخر ان کے لیے مہلک ہوا۔ اور انہیں مختلف ہلاکتوں سے دوچار ہو کر تباہیوں اور بربادیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

# باب ششم

## بند گی اور اس کی عملی تقسیم و تفصیل

در حقیقت بند گی ہی وہ راز عظیم ہے۔ جس کے لیے انسانی تخلیق کا آغاز ہوا۔ تا کہ بند گی کا اصل مقصد مفہوماً پورا ہو کر انسانوں کو راہ بند گی پر چلنے کے لیے خوشی کے ساتھ آمادہ کر سکے۔ اور اللہ تعالے نے صرف لفظِ بند گی مکمل کرنے کے لیے ساری کائنات کو اس کے عوامل کے ساتھ پیدا فرما دیا تا کہ وہ اس بند گی کا تجربہ کر سکے۔

اللہ تعالیٰ انسانی شعور سے بالاتر ہے۔ اس کے منشا نے انسانی صلاحیتوں کو اور باقی کائنات کو اس انداز سے تخلیق فرمایا۔ کہ انسانی جذبات ان کو محسوس کرنے میں دسترس حاصل کر کے ان کو تحت الشعور کر لیں۔

اسی لیے خدا نے اپنے آپ کو مخفی رکھا۔ اور انسانوں کو ظاہر فرمایا۔ یہ اس کا بڑا احسان ہے اب انسان پر لازم ہے۔ کہ وہ خود کو فنا کر کے اس کو ظاہر کرے۔ جس نے اس کو ظاہر کر کے اپنے آپ کو مخفی کیا۔

تحت الشعور رہنے والی جملہ اشیائے عالمین انسان کے سامنے خدا کو پہچاننے کے لیے ایسے اچھوتے نشانات ہیں۔ جن کی بدولت وہ اپنے فوق

الادراک مالک و مختار کا علم و عرفان حاصل کرنے میں کامیابی پائے۔

احساس و محسوس دونوں انسان کے لیے ہیں۔ یہی احساس و محسوس انسان کی پہلی اور آخری منزل ہے۔ ہر چیز محسوس ہے۔

کائنات اور اس کے جملہ عوامل انسانی ادارک کے سامنے مدرکات ہیں یہ سب انسانی پرواز کا ذریعہ ہیں۔ جن سے وہ خدا کی طرف پرواز حاصل کرتا ہے۔

انسان کی اس پرواز کی راہ میں بہت سے خفی و جلی جہان آباد ہیں۔ جن کو عقبات بھی کہا جاتا ہے۔ منازل مادی و مدارجِ روحانی بھی کہا جاتا ہے۔ جن کی ابتداء خواہش سے ہوتی ہے۔ اور خواہشات مطالبات کے زینے ہوتے ہیں۔

یہی زینے حق و باطل میں امتیازی فرق پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ زینے صرف نفسیات کی خواہشات اور رغبات ولذات تک محدود کردیئے جائیں۔ تو بنیادِ احساس باطل ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے جملہ فروعات بھی بطلانِ محض ہو جاتے ہیں۔

یہ طرز و اطوارِ زندگی محدود طور پر اہلِ دنیا کا حصہ ہے۔ جن کا مقصود صرف حصولِ دنیا اور جلبِ منفعت ہے۔

ان کی خواہشات کی اصل و فرع دونوں بظاہر نہایت نازک تر اور حسین تر ہوتی ہیں۔

یہ نوعیت خزاں آور ہے۔ اس پر بار بار خزاں آ پہنچتی ہے۔ ایک دور انسانی فنا کے ساتھ نابود ہو جاتا ہے تو دوسرا دور انسانی پھر دوبارہ اسی بہارِ ناپائیدار کی طلب میں آگے بڑھ کر پامالِ خزاں نمود و نمائش پر

آسائشِ ناتمام کی عمارت قائم کرلیتا ہے۔

جس سے مایوسیوں پر مایوسی کی تعمیر کا سلسلہ رواں دواں رہتا ہے۔ اس مایوسانہ کڑی کے تسلسل دینے کو اہل دنیا دوام گردانتے ہیں۔ اور یہی مزاج ان کو اس منزلِ زیست پر نہیں آنے دیتا جس سے ان کی زندگی راہِ دوام کا سراغ لگا سکے۔ اور حال دنیا فرزانوں کے نزدیک ایک ڈھلتے سائے یا خواب یا باد کے جھونکوں کے مانند ہے۔ اختتام کے بعد یہ موہوم کہانی ہو جاتی ہے۔

ہر چیز جو ماضی میں منتقل ہو جائے۔ اور مستقبل میں ساتھ نہ دے سکے۔ وہ بھول جانے والی داستان ہوتی ہے۔ چاہے وہ کتنی حسین و جمیل داستانِ زندگی ہی کیوں نہ ہو۔

مگر دنیا میں کچھ حالات ایسے بھی ہیں۔ جو مستقبل کی راہنمائی اس طرح کرتے ہیں۔ جن سے مستقبل کی جانب بڑھنے کی ایک ایسی امید انگڑائی لیتی ہے کہ صاحبِ دانش انسان کو دوامِ حیات کے لیے شادمانی کی راہ مل سکتی ہے۔ اور یہ کہ وہ دائمی اطمینان پا سکتا ہے۔

یہ نظریہ تقریباً سب انسانوں کے پاس کسی نہ کسی طرح ضرور موجود رہتا ہے۔

مگر دنیاوی لذات کے دباؤ اسے یکسر خاموش کر دیتے ہیں۔ اگر اس اُلٹے دباؤ کے بجائے سیدھا دباؤ یعنی حقیقت پسندانہ دانش کے دباؤ سے احساسات کو ابھرنے دیا جائے تو عارضی اور ناتمام انجام کی بجائے مستقل اور پائیدار جہان انسانی ادراک کے سامنے آ جاتے ہیں۔ مگر نفسیاتی علوم بڑے بڑے علوم و معلوماتِ زندگی میں آڑے آ کر صرف مادی ترقیات کو

ہی اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں۔

حالانکہ علمِ نفسیات جو صرف حالات کی کچھ موہوم نشان دہی کرتا ہے، دامن عقلِ انسانی سے قدرت نے باندھ دیا ہے۔ جس میں منشائے فطرت یہ تھا کہ انسان روزمرّہ کی گذران میں اس علم موہوم کو استعمال میں لائے۔ یک قلم خوفِ دشمن اور اس سے بچاؤ کی تیاری، سناٹے کے عالم میں دہشت اور اس سے بچاؤ کے لیے خیالات کا سامنے آنا۔ اپنے اور بے گانوں کے چہروں کی حالت کا جائزہ۔ کہ یہ میرے ہمدرد ہیں۔ یا نہیں۔ خفا ہیں یا راضی پھر ان کے لیے تدارک کرنا وغیرہ۔ بیوی بچوں کی مزاج شناسی۔ مہمانوں کی کیفیت کا اندازہ لگانا۔ موسم کے حالات کا جائزہ۔ اور اس کے انتظامات، سفر و حضر میں حالات کا جائزہ اور سخت حالات کے اندازہ پر اس کے لیے تدارک حالات کے مشکل یا مشکل ترین سوالات کا حل، انسانی معاشرے کے مجموعی تاثرات کا حال، جنگ و جدال کا اندازہ لگانا۔ اور بچنے بچانے پر غور و حوض، محبت و نفرت میں جسم کا پھیلاؤ یا سمٹنا وغیرہ ان ہی حدود تک اپنی دوڑ جاری رکھ سکتے ہیں۔

مگر یہ فیصلے قطعی نہیں ہوتے۔ اور نہ ہی انسانی برادری اس کی قطعیّت کی دلیل مہیا کر سکی ہے۔

جہاں تک علم نفسیات کا تعلق ہے اور اس کی معلومات کا پھیلاؤ ہے۔

بس وہ اس مختصر سے موہوم احساس کے گرد گھومتا رہتا ہے۔

یہ علم اللہ تعالےٰ نے انسانوں کو محض اس لیے عطا کیا تھا کہ اس علم موہوم سے انسانی جسم اپنے قرب و جوار اور حسن و قبح کا کم از کم جائزہ

لیتا رہے۔ اور اس کی طبیعت اس عالمِ فانی سے لگی بندھی رہے۔
= ورنہ اس ذیلی علم کی شاید ضرورت ہی درپیش نہ آتی مگر اس کے درپیش آنے سے بھی کوئی خاص رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس طرح تو ہم اس نفسیاتی علم کو جا کر راہ بنا کر اس کو اپنا امدادی وستہ بنا لیتے ہیں۔

= صرف ایسی حالت میں انسان شکست کھاتا ہے جب حیاتِ جاوداں سے آنکھ بند کر کے صرف اسی علم نفسیات کا ہی مرہونِ محض ہو جائے۔ =

ایسے عالم میں انسان اپنے ان حقیقی علومِ روحانیہ سے بیگانہ ہو جاتا ہے، جو اسے عالمِ ہست و بود میں عظیم مقاصد کی راہنمائی کے لیے مقصودِ حقیقی کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

اور ایسی راہنمائی سے انسانی محرومی دائمی راحت سے حرماں نصیبی پر محمول ہو کر بیگانہ حق بنا دیتی ہے۔

= نفسیات کے ماہرین نے اپنے موہوم علم کو مقاصدِ حقہ پر مسلط کرنے کے لیے آج تک جو مساعی انجام دیں وہ سب لاحاصل ثابت ہوئیں۔ =

= اگر واقعتاً نفسیات کے ماہرین کو علم نفسیات نے مطمئن کر دیا ہوتا تو وہ بیماری اور حادثات میں، زلزلوں اور برق و بار میں، آندھیوں اور طوفانوں میں لفظِ فنا و برباد سے لفظِ ہلاکت یا لفظِ انقطاعِ حیات سے لرزاں و ترساں نہ ہوتے۔ ان کا لرزہ براندام ہونا نفس کی آوازِ باطن ہے۔ جو مستقبل کی ترجمانی ہے۔ =

= چونکہ جسے شام کو گھر واپس لوٹ آنا ہوتا ہے۔ وہی رستہ میں چلتے ہوئے بچاؤ کا خیال کرتا ہے اور آفات و مصائب آنے پر لرزتا ہے۔ =

= اس کی لرزیدگی جانِ عزیز کے بچاؤ کو اپنے محبوب تک پہنچانے کی علامت ہوتی ہے۔ ہر صاحب نفسیات صاحبِ ماضی اور صاحبِ حال بھی ہوتا ہے اور ہر حال مستقبل کے لیے مختص ہوتا ہے۔ =

اِن تینوں حالتوں میں صاحبِ نفس کا پسِ منظر بھی اس کے ہمراہ ہوتا ہے۔ مگر اس کا فیصلہ کون کرے؟۔

وہ تو محض اپنے محدود موہوم علمی نظریات میں سکڑ کر مستقبل کی لازوال نعمتوں کی نوید سے آنکھیں بند کر چکا ہے۔ وہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ بس اپنوں اور پرایوں کے لیے وہم اور شک کرتا رہے۔

علم النفسیات کو اگر علومِ حقہ سے علیحدہ کر دیا جائے۔ تو چشمہ آب کے گرد و نواح کا کیچڑ بن کر رہ جائے۔ یا بچے ہوئے دستر خوان کا پس خوردہ۔ یا کھائے ہوئے پھل کی گٹھلی۔ یا خزاں زدہ باغ و بستان کی مثالِ موہوم یا آباد ہو کر اجڑے ہوئے دیار، یا گئے گذرے آثار کا نشان۔ یا بستے ہوئے محلات کے اُجڑنے کے بعد کھنڈرات کا ڈھیر۔

= اصلاً علمِ نفسیات ایک علامتی علمِ حکیمانہ تھا۔ جس کو نسخہ حکمت کہا جا سکتا ہے۔ لوگوں نے اسے حکیم گردان لیا۔ =

= یہ ظاہر ہے کہ حکیم نسخہ نہیں بن سکتا۔ اور نسخہ حکیم کا مقام نہیں پا سکتا۔ نسخہ تو حکیم کی ایجاد بن کر اہلِ نفس کی کلفتِ جسمانی کی دوا بنتا ہے۔ جس سے اہلِ نفس استفادہ کرتے ہیں۔ =

= بہر طور علمِ حکمت کا درجہ، نسخہ اور بیمار دونوں پر فضیلت رکھتا ہے۔ بعینہٖ پروردگار عالم حکیم کائنات ہے۔ اور اس کائنات میں بسنے والی مخلوقات کا مربی و محسن ہے۔ =

= اس نے اپنی حکمت کریمانہ سے انسان کو جسم و جان جیسی نعمت غیر مترقبہ عطا فرمائی۔ پھر اس نے اسے لاتعداد لوازم بخشے تاکہ وہ اپنے لوازم کے ساتھ ایامِ زندگی گذار سکے۔ =

= جسم و جانِ انسانی کو روح و مادہ کی ترکیب سے پیدا فرمایا۔ بس زندگی کے یہی دو بنیادی ارکان ہیں۔ جن سے انسان کی نبضِ زندگی متحرک ہوئی اور اس نے آنکھ کھولی۔ اور سننے لگا، اور چلنے پھرنے لگا۔ زندگی کے لیے اسے احساسات ظاہریہ اور احساسات باطنیہ عطا فرمائے۔ عقل و دل و نگاہ تفویض فرمائے۔ تب وہ صاحب علم ہوا۔ اور کار گاہ زیست کا مکرم ترین شاہکار بن کر ساری مخلوقات پر فضیلت دیا گیا۔ =

علم نفسیات احساساتِ عقلیہ کے فروعات سے ہے۔ نہ کہ بنائے احساسات۔ اس طرح جس طرح ناخن تدبیر ہاتھ نہیں ہوتے۔ بلکہ ہاتھ کی ایک فرعی حیثیت پر مبنی ہو کر ہاتھ کے کام آسکتے ہیں۔

= بالکل اسی طرح قدرت نے انسانی عقل و روح کے دانشمندانہ ہاتھوں پر علمِ نفسیات کو ناخن تدبیر بنا دیا تاکہ جس کے حالات حاضرہ کا اس علم کے ذریعے جائزہ لیا جا سکے۔ اور یہ کہ علم نفسیات انسانی دانش میں ناخن تدبیر بن سکے۔ اس نوعیت میں علم نفسیات اصل دانش نہیں۔ بلکہ فروغ دانش سے ہے۔ =

= مگر جب انسان اپنے جسم تک ہی اپنے آپ کو محدود کر لیتا ہے۔ تو روح بس اس کو زندہ رکھتی ہے۔ اور اسکی معیت میں اسے فہم رسا دیتی رہتی ہے۔ جس سے وہ خورد و نوش کے سامان پیدا کر کے اپنا پیٹ پالتا ہے۔ =

پھر اس کے آگے فوق الادراک معلومات میں جو حال اور مستقبل کے لیے ہوتے ہیں، ان سب کے حل کے لیے علمِ نفسیات کو ہمیشہ عقل، دلِ و نگاہ عارفانہ کی احتیاج ہوتی ہے۔ وہ کبھی فوق الادراک حالات کا جائزہ لینے پر قادر نہیں ہو سکتا۔

چونکہ وہ نفسیاتی حالات میں مقید ہے۔ اگر انسان نفسیاتی علوم پر ہی اکتفا کر کے اپنی معیشت کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینا چاہے۔ تو معیشت بہتر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

چونکہ انسان بوجہ دانشِ انسانی کے مکرم ہے۔ اس کا چاہے کوئی زاویہ نگاہ ہو۔ بہر کیف عقلِ انسانی اس کے زاویہ نگاہ پر اس کی مدد کرتی ہے۔

عقل و دانش کی عادت ہے کہ وہ افکارِ انسانی کی لازماً راہنمائی کرتے ہیں۔ اس طرز عمل پر انسانی گروہ جس طرح چاہے اور جس منزل پر چلنا پسند کرے۔ عقل اسی سبیل پر اس کی گتھیاں سلجھانے میں اس کی ممد ہو جاتی ہے۔ جس سے انسانوں کے مختلف طبقے مختلف نظریات کے ساتھ مختلف ترقیات کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ چور، ڈاکو اور رہزن بھی اپنی عقلِ انسانی سے کام لے کر اپنے اپنے جرائم میں بڑی کامل مہارت حاصل کر لیتے ہیں اور انسانی دنیا میں اپنے کمالاتِ مجرمانہ سے بدامنی کا باعث بن جاتے ہیں۔

عقلِ انسانی ہر قسم کی معیشت میں انسان کی مدد کرتی ہے۔ حسین و قبیح دونوں قسم کی معیشتوں میں مددگار ہو کر انسانوں کے زاویہ نگاہ کی تائید کرتی ہے۔

یہ اصطلاح کہ فلاں گروہ بد اخلاق ہے۔ جس کا ترجمہ بری گذران والا ہے۔ اور فلاں زمرۃ الانسان جمیل و حسین و شریف معیشت کا حامل ہے۔ جس سے کسی معاشرے کی اچھائی ظاہر ہوتی ہے۔

یہ دونوں اصطلاحات معیشت میں خواہشِ نفس پر یا تہذیب اخلاق پر مرتب ہو کر ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

اس انسانی کردارِ بد اور کردارِ نیک کی تاریخ سے ثابت ہوا کہ عقلِ انسانی مجوزہ نہج پر تائید و حمایت کرتی ہے۔

لہذا محض انسانی معیشت کا معراجِ کمال تک پہنچ جانا بر بنائے نفسِ امارہ بھی ممکن ہے اور معیشت کا بر بنائے تہذیب روحانیہ بھی معراجِ کمال تک پہنچ جانا ممکن العمل ہے۔ دونوں معیشتوں میں سے ایک معیشت کا الگ انتخاب کر کے اسے بندگی میں داخل کرنے کے لیے بنیادی دلائل کی ضرورت ہے۔

اور ایک معیشت کی معراج کو عیش و طرب پر منتج کرنا پڑے گا۔ اور دوسری معیشت کو معیشت خیر و صلاح پر یہ ضروری نہیں۔ کہ صرف ایک ہی قسم کی معیشت یک طرفہ معراج پا سکتی ہے۔

یہاں یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ کہ عقل و دانش، نیک و بد دونوں معیشتوں میں دستگیری کرتی ہے۔

فرق صرف اتنا ہے کہ ایک معیشت انسانوں کو بد اخلاقی پر مجبور کرتی ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ بنیادی نظریات کی غلطی ہوتی ہے۔ اور ایک معیشت نیک اخلاق پر مرتب ہوتی ہے جو آئینِ عافیت ہوتی ہے اور اس کی بڑی وجہ نیک نظریات ہوتے ہیں۔

# باب ہفتم

## معیشت انسانیہ

دنیا میں بد اخلاق قوموں کے نظریات بنیادی طور پر خواہشِ نفس پر تعمیر ہو کر تہذیب و تمدن کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ صورتاً بظاہر وہ بھی گذرانِ انسانیت کا ذریعہ ہوتے ہیں مگر ان کی تبلیغ عیشِ محض کے لیے ہوتی ہے۔

بعض کمزور طبائع نیک معاشرہ کے پروردہ ہونے کی حالت میں بھی مغلوب ہو کر ایسی بد اخلاق تہذیب کا شکار ہو کر دین و ایمان کھو بیٹھتے ہیں کہ تنگیٔ معیشت کو ہی آئین و منشور بنا لیتے ہیں اس دنیا میں بندگانِ خدا کی معیشت صرف ان تک ہی محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ ریاست کو خود کفیل کرنے کے بعد ریاست سے باہر دوسروں تک پھیل کر بھلائی کرتی ہے۔ جس کی نوعیت خیراتی ہوتی ہے اور اس پھیلاؤ یا خیرات کا کوئی سود یا معاوضہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اس پر دباؤ کی صورت اختیار کی جاتی ہے۔

جیسا کہ آج کل اقوام عالم کی مصنوعی اور بظاہر کامیاب معیشت اپنے پھیلاؤ پر سود لیتی ہے اور کئی طریقوں سے منافع در منافع حاصل کرتی ہے۔ یہ معاملاتِ انسانی کی ایک سخت بد نما اور سخت بد ترین صورت

ہے۔ منافع تجارت میں جائز ہے۔ لین دین کی اس صورت میں جس میں تجارت مطلوب ہو اور ذرائع کو جائز طور پر وسیع کرنا مطلوب ہو۔

بیع و شرع کے منافع کی ایک ایسی جائز اور غیر مضر حد مقرر اور قائم کر دی جاتی ہے۔ جس سے بائع و مشتری دونوں مطمئن ہو سکیں۔ نہ ایک کو خسارہ ہو اور نہ دوسرے کو نقصانِ مال و جنس ہو۔

اسلام میں ایسا معاملہ بندگی قرار دیا گیا ہے۔ اسلام کی بندگی ہر جزو زندگی میں پھیل کر صلۂ رحمی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اسلام کی بندگی کا آغاز اس نیت پر ہوتا ہے۔ کہ ہر چیز خدائے علیم و بصیر کی دین ہے۔ غلط مصرف پر وہ ناراض ہو گا۔ چاہے یہ مصرف لسانی ہو۔ یا بدنی، یا انفاقِ مال و جان اور اولاد سے ہو۔ بہر صورت مصرف اللہ کے لیے ہے، جس کے سامنے سب نے جواب دہ ہونا ہے۔ جس معاشرے کی بنیاد یہ ہو، وہ ضمیراً خوش اخلاق ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے لیے اور کسی دوسرے کے لیے بداخلاقی اس واسطے نہیں کرتا کہ اسے اپنے اور دوسروں کے متعلق خدائے تعالیٰ کے سامنے حساب و کتاب دینا ہے۔ ہمارے نبی کریم علیہ الصلوۃ والسّلام نے اللہ کی عبادات کی تکمیل کے ساتھ انسانی معاشرہ میں وہ تمام کام سرانجام دیئے۔ جن کا معیشتِ انسانیہ سے تعلق ہو سکتا ہے۔ مگر ان امور کی ادائیگی اس حسن و خوبی سے سرانجام دی کہ اگر کسی نے ایک ذرہ برابر بھی برائی کی تو اسکی اسی قدر وعید سنائی گئی اور اگر کسی نے ذرہ برابر بھی بھلائی کی تو اس کو اسی قدر جزائے خیر کی بشارت سنائی گئی۔ اس دستورِ العمل کو آپ کے پیروکاروں نے عملاً ثابت کر دیا کہ بندگی کی پرواز دو پروں پر ہوتی ہے۔ ایک خالصتاً پروردگار عالمین کی سچی عبادات کے

ساتھ اور ایک انسانی حقوق کی ادائیگی کے ساتھ۔

مومن ان دونوں پروں کے ساتھ بلندیٔ ایمان پر اڑتا ہے جس تک غیر بندے نہیں پہنچ سکتے۔ ایک پر کے ٹوٹ جانے سے مومن بلندیٔ ایمان سے نیچے گر جاتا ہے۔ مومن پر حق لازم آتا ہے۔ کہ وہ بندگی کے یہ دونوں فرائض بااحسن وجوہ تمام انجام دے تاکہ اس کی معیشت فارق الکفرو الاسلام ہو۔ جس سے بوضاحت تمام بااخلاق معیشت اور بداخلاق معیشت انسانیت کے سامنے آجائے۔

بندگی روحانی اور جسمانی معیشت کو مستحکم کرتی ہے۔ جو بندگی پروردگار کے لیے کی جائے۔ ایک تو وہ طمانیت بن کر دل کو مطمئن کرتی ہے کہ تو ضمیراً اس خدا کا بندہ ہے جو نہ صرف تیرا ہی مربی و محسن ہے بلکہ ساری خلائق کا مربی ہے۔ دوسرے وہ اپنے حقیقی فیصلہ کی قطعیت پر ایمان رکھتا ہے۔ اس واسطے کہ وہ جس خدا پر ایمان لایا ہے۔

وہ فَاطِرِالسَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ ہے ایسا مومن بندگی کا آغاز
اِنِّیۡ وَجَّھتُ وَجھِیَ لِلَّذِیۡ فاطِرَالسَّمٰوٰتِ وَالاَرضَ حَنِیفاً
وَّمَا اَنَا مِنَ المُشرِکِینَ کے ساتھ کرتا ہے۔

کہ میں عبادت کے لیے اپنا منہ اس معبودِ مطلق کی طرف کر رہا ہوں جو زمینوں اور آسمانوں کا پیدا کرنے والا ہے اور یہ کہ میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بھی نہیں گردانتا۔ اس عقیدہ سے وہ قطعی ایمان کے ساتھ قطعی فیصلہ کرلیتا ہے اور یہ قطعی فیصلہ اسے خشیت کا پیکر بنا کر عبودیت کا درجہ دیتا ہے۔ ایسی خشیت جِس کی نُمود خالقِ مطلق کی ذات پر ایمان لانے کے بعد وقوع ہو کر عبادت میں شریک ہو۔ ایسا عابد اپنی عبادت سے کیوں نہ

مطمئن ہو۔ ایسا عابد معاشرہ کیونکر تغافل شعار ہو سکتا ہے۔ جس کی قلبِ ماہیت خوف و رجا ہو اور خوف ورجا میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں شامل ہوں۔ وہ تو اپنے صالح نظریہ کی بنا پر نیکیوں کا چشمۂ جاریہ بن جاتا ہے جس کے ایمانی اور عملی تسلسل سے گردوپیش میں ایمان انگیز روئیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

پانی مختلف نوعیت کی زمینوں پر سے گزرتا ہے۔ مختلف جڑی بوٹیوں کو جو مختلف انواع کی حامل ہوتی ہیں۔ سب پر یکساں اثر کرتا ہے۔ ہر زمین اپنے مزاج کے مطابق اس سے استفادہ کرتی ہے۔ ہر بیج کا استفادہ پانی کی تاثیر پر منحصر ہے۔ ہر بیج جس رنگ وروپ اور ذائقہ کا متحمل ہوتا ہے۔ ان ہی صلاحیتوں کے ساتھ نمود پا کر شاخ بن جاتا ہے۔ گھاس بھوس سے لے کر کھلکھلاتے اور مسکراتے ہوئے چمن مختلف رنگوں، پھلوں پھولوں سے لدے ہوئے باغ و بستان، پانی کے عمل جاریہ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

چونکہ پانی کا یہ استفادہ دلیلِ قدرت ہے قرآنِ کریم میں ارشاد ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْئٍ حَيٍّ۔

یعنی ہر چیز کا مدارِ حیات پانی ہے۔

اگر کائنات کی ہر چیز اپنا عمل جاری نہ رکھ سکے وہ زندہ ہی نہ رہ سکے تو معیشت انسانی کا سوال ہی لاحاصل ہو جائے۔ اہل ایمان اپنے مقام میں قانونِ فطرت کے جاری کردہ اور فیض یاب کرنے والے چشمۂ جاریہ کے مانند ہیں۔ ہر مومن قطعی یقین و ایمان پر اعمال کو جاری رکھتا ہے۔ جس پر اس کے گردوپیش کی انسانی صلاحیتیں پرورش پا کر نمود پاتی ہیں۔

ہر مومن حقیقت حقہ کی ایک کھلی دعوت اور کتاب ہدایت ہوتا ہے۔ اس کی ہر ہر حرکت، اس کا ہر جزو زندگی دعوت حق ہوتا ہے۔ وہ ایسی کتاب زندگی ہے۔ جس کو جہاں سے اور جس صفحہ سے پڑھو گے، بس صداقت، نجابت، عافیت اور حقیقت ہی ملے گی۔

جب مسلمان معاشرہ اپنی اس فطری نوعیت پر منظم ہو کر سامنے آ جائے تو ایسی حالت میں جو معاشرہ جس تہذیب و تمدن کے ساتھ ظہور پذیر ہو گا۔ اسی پر بندگانہ معیشت صادقہ اور معیشت صالحہ کا اطلاق ہو سکے گا ورنہ معاشرہ اور اس کی معیشت غیر قطعی بنیادوں پر کبھی صداقت شعار نہیں ہو سکتے۔ اصل مقصد ان دلائل سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اہلِ دنیا اکثر اپنی معیشت کو اچھا ثابت کرنے کے لیے اسے دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ جس کسی معاشرہ کی ظاہری معیشت اچھی ہو گئی اور اس معاشرت کو اپنے گردو پیش کی اقوام عالم پر شہرت مل گئی تو ایسی حالت میں وہ دوسروں کی معیشت پر بیشتر قسم کے دباؤ ڈالنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور ناجائز طور پر لوگوں کو اپنے غلط نظریات منوانے کی سعی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اس ظاہری دوران غلبہ میں اکثر مجبور و بے بس لوگ یا تو دفع وقتی کے لیے ان کے نظریات کو قبول کر کے ان کے معاون بن جاتے ہیں۔ یا کمزوری ایمان کی بدولت آسائش نفسانی کے حصول کے لیے اپنے مذہب حقہ سے متروک ہو کر معاشرتی دلچسپیوں کو ہی اپنا مذہب بنا لیتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے ترک مذہب کے لیے ہمیشہ ظاہری معیشت ہی ذریعہ فرار بنتی رہی۔ اول الذکر متروک جس نے اپنے مذہب پر ایمان رکھتے

ہوئے دفع وقتی کے لیے ترکِ مذہب کیا تھا۔ اس قسم کے لوگ بھی قدرتی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔

اگر صرف دفع وقتی کے طور پر ترکِ مذہب ظاہراً مراد تھا تو اضطرار دور ہونے پر وہ فوراً رجعت الی اولیٰ کر لیں گے۔ اگر دفع وقتی کے ساتھ وہ مغلوب المعیشت ہو گیا، تو بھی اس کا نظریہ خطرہ میں پڑ جائے گا۔ یا تو وہ فرداً اسیرِ غیر ہو کر حاصل شدہ آسائش سے بیگانگی اختیار کرنے میں دقت پائے گا۔ یہ تاخیر اسے کسی وقت بھی خارج از ایمان ہونے کے لیے مہلک ہو سکتی ہے۔

اگر بالفرض محال وہ خود اضطراراً ایسے غلط معاشرہ میں دفعہ وقتی کے اضطرار سے فراغت پانے کے بعد بھی اس معاشرہ سے جدا نہیں ہوتا اور محض اس خیال پر کہ میں اپنے نظریہ ایمان پر ثابت قدم رہنے والا ہوں، میں اچھی بھلی معاشرت میں دن گزار رہا ہوں۔ بلاوجہ اس سے الگ ہو کر معاشی بدحالی مول لینے سے بھلا ہے کہ میں اس غیر معاشرہ میں رہ کر زندگی گذار لوں۔

اس حالت میں انجام کار اس کی نجی زندگی بھی خطرہ میں پڑ جائے گی اور اس کی اولادوں کو پیدائشی طور پر معاشرہ غیر کا لازماً حصہ ہونا پڑے گا انجام کار وہ اور اس کا خاندان غیر نظریات کا شکار ہو کر یا تو اپنے سچے مذہب کو خیر باد کہہ دے گا۔ یا صرف نام کا مذہبی کہلائے گا۔ مگر مذہبی روح سے قطعی بے گانہ ہو کر اپنوں سے بیگانگی۔ اور غیروں سے دلچسپی اس کا مشغلہ بن جائے گا۔ ایسا طبقہ کہیں خوش بختی ہی سے بچ سکے۔ ورنہ اس کا بچنا دشوار تر مراحل میں داخل ہو جاتا ہے۔

اہل اللہ نے فرمایا، کہ کسی بداخلاق نظریہ زیست کے پابند فرد یا خاندان یا معاشرہ یا قوم کی قرابت وہ راسخ الایمان کر سکتا ہے جس کا ایمان اس قدر مضبوط ہو کہ وہ کائنات کی ہر چیز پر اپنے نظریۂ ایمان کو محبوب تر جان کر ترجیح دینے والا ہو اور اس کا مطمحِ نظر صرف اخلاقِ ایمانی کے ساتھ دوسروں کو بھی ہمنوا بنانا مقصود ہو۔ ایسی صورت حال میں کوئی فرد یا خاندان یا قوم کسی غیر معاشرے یا اس کے فرد و خاندان سے دو چار ہو جائے۔ تاہم وہ اپنے دامن عفت ایمانی کو بچا لینے میں کامیابی پاتا ہے۔ بلکہ وہ اپنے اثراتِ نیک غیر معاشرہ میں منتقل کرنے میں بھی کامیابی پا لیتا ہے۔

آج تک اقوامِ عالم اسی دستور العمل کے تحت بگڑتی اور سنورتی رہی ہیں۔ ایک قوم نے متمدن ہو کر اپنی تہذیب کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش اپنی معیشت کے عروج کی مدت تک جاری رکھی۔ مگر جونہی ایسی معاشرت موت کی آغوش میں سو گئی تو دوسری قسم کی ابھرتی ہوئی معیشت نے لوگوں کو آگھیرا۔ اس تسلسل نے حق و باطل کی رزم گاہیں بنائیں۔ کبھی حق غالب آیا اور کبھی باطل۔ باطل کے ابھرنے کا بس ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ عیش و طرب کو فروغ دینے کے لیے آشائش ڈھونڈھتا ہے۔

ہر انسانی دل کے ساتھ نفسانی خواہشات ملوث ہوتی ہیں۔ اس واسطے اکثر و بیشتر لوگ عیش و طرب کا دیکھتے دیکھتے شکار ہو جاتے ہیں اور پھر وہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل پاتے۔

انسانی معاشروں پر سنجیدگی سے غور کرنے پر صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ معاشرہ صحیح یا غلط بنیادوں پر قائم ہے۔ جیسا کہ ہندو قوم میں خیرات بھی ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ صلہ رحمی کے سلسلے بھی جاری ہیں۔ ان کے اخلاق میں ہر کس و ناکس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بات کرنے کی دلپذیر رسم بھی پائی جاتی ہے اور مخاطب کرنے کے وہ وہ دلنواز انداز موجود ہیں جو ہر خاص و عام کو دعوت ستائش دیتے ہیں۔ وہ ساز و سرور سے بھی اپنی مجالس کو پر کیف بنانے کے عادی ہیں۔ اس کے ساتھ وہ اپنے عبادت خانوں میں بڑے ادب و احترام کے ساتھ مجوزہ عبادات کے لیے جمع بھی ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی مذہبی کتاب کو پڑھنے کے علاوہ ظاہراً نہایت درجہ ادب بھی کرتے ہیں وہ اپنے معابد کو نہایت نفاست کے ساتھ سجاتے اور اسلاف کی بڑی بڑی دلنواز تصاویر آویزاں کرتے ہیں اور بزرگانِ قوم کی مردانہ تصاویر اور بزرگ عورتوں کی تصاویر ان کے احوال کی ترجمان ہوتی ہیں وہ اپنی عقیدت کو زندہ رکھتے ہیں۔

یہ سب صورتیں بظاہر بھولی بھالی دل آویز ادائیں، ساز و سرور، اختلاطِ مرد و زن۔ ان کی شادی و غمی کی رسومات، ان کے تہوار، ان کے بھجن، ان کے نغمات، ان کا ادب، ان کا علم و ہنر، سب کے سب میدانِ عمل میں ان کے ساتھ ساتھ ان کی منزلِ زیست پر عیاں نظر آتے ہیں۔ جس سے طبائع مسحور ہوتی ہیں۔ مگر ان مذکورہ مظاہرات اخلاقیہ کے حاملین ان تمام ظاہری حالات کی موجودگی میں ایک غریب کی دولت ایک مختصر سے عرصہ میں، ہنسی اور مذاق میں اڑا لیتے ہیں۔

ایک بے بس و بے کس غریب جس دن آسائش ذاتی سے قطعی تہی دامن ہو جاتا ہے اور جملہ وسائل اسکا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ قرض اس کی ذات پر بالکل ایک نیم جان کے سر پر وزنی پتھر کے مانند ہوتا ہے۔ اس کی ننھی منی اور محبوب ترین اولاد، اس کی رفیقۂ حیات اس کی آنکھوں کے سامنے روٹی کے ایک ٹکڑے اور دو ٹکوں اور معمولی کپڑوں اور چھوٹی سے چھوٹی ضروریات زندگی سے محروم بلک بلک کر اپنے مالک خانہ کی طرف دیکھتے ہیں جو ان کی امیدوں کا اس دنیا میں آخری سہارا ہے۔ مگر جب اس کو بے بس بے حال، پر نوچے ہوئے پرندہ کی طرح بے سہارا پاتے ہیں تو ان کی رہی سہی امیدیں بھی بری طرح پامال ہو جاتی ہیں۔ ان کے آنسو ترازوئے فطرت میں تولے جائیں گے۔

مگر یہ بعد کی بات ہے حال یہ ہے کہ نا امیدی ان کے آخری آنسو بھی خشک کر کے لوٹ لیتی ہے۔ تا کہ دیکھنے والا ان کو مردہ تصور کرے۔ ان کی امیدوں کے سہارے نیم جان مالک خاندان نے تعمیر کے لیے بڑی امیدوں پر خشت اول رکھی تھی اور اس خاندانی تعمیر کے لیے مشفقانہ محبت و مشقت کی تھی۔ جب آسائش کا سانس لینے کے قابل ہوا اور خاندان کی امیدیں بندھ گئیں۔ معاً اس کے پرامن ماحول میں بسنے والے خاندان کے دروازہ پر ایک ہنستا، مسکراتا اور کھلکھلاتا اور باکمر خمیدہ چہرہ سادے سے لباس میں ملبوس ہاتھ جوڑے کھڑا نظر آتا ہے۔ اور بڑے علم و ادب سے آداب بجا لاتا ہوا سلام کہتا ہے اور مالک خانہ کو سرکار کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ اس کی اس دل آویز سادگی اور فروتنی سے ایک سادہ لوح، نیک دل، صاحب مروت مالک خانہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اس نووارد ساہوکار کا

پر تپاک خیر مقدم کرتا ہے۔ اسے اپنے قریب بٹھاتا اور عزت و تکریم کرتا ہے۔ مگر اسے کیا معلوم کہ یہ تبسم، یہ بھولاپن، یہ دستور اخلاق میری دنیائے امن کا لٹیرا ہے۔ یہ طریقے سب کے سب دوسروں کو ذبح کرنے کے اوزار ہیں۔ کسی نووارد مہمان کا یہی تبسم، محنت کش مردِ غیور کو اپنے دامنِ تزویر میں پھانس لینے کے بعد ایک دن اپنے شفیق میزبان کو اس طرح بے دست و پا کر دیتا ہے۔ کہ وہ اپنی بے بس بیوی، بے بس بچوں، ننھے شیر خواروں سمیت اس کے سامنے ہاتھ جوڑے حاضر ہو کر اپنی پر درد و الم ناک شکست اس طرح بصورت فریاد پیش کرتا ہے۔ کہ اب تو میرے پاس سوائے مکان اور زمین کے اور کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ آپ ہم پر رحم کریں اور مزید کچھ مدد کریں۔ اس حیران کن مرحلہ پر بھی وہ ہاتھ جوڑ کر ابتداء کرنے والا مہاجن ان کی پھر مدد کرتا ہے۔ جب مکان اور زمین بھی گرو کر لیتا ہے۔ تو یہ اس خاندانی دہقان یا خاندانی زمیندار یا خاندانی پیشہ ور یا خاندانی معزز گھرانوں کی آسائش کا آخری دم ہوتا ہے۔ جس کے بعد وہی لوگ مہاجن کے چاکر ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں۔

جس قوم کے نظریاتِ مذہبی کا پھیلاؤ یہ ہو اور وہ کار سازِ عالم میں پورا عملی پروگرام بھی رکھتی ہو، وہ معبد خانوں میں بھی نظر آتی ہو، وہ گوسالہ، پتھر کی مورتیوں پیتل، لوہے اور چاندی کے بت بنا کر ان کے سامنے سجدہ ریز بھی ہو۔ اگر مال و زر کمانے اور خوبصورت شہر و محلات بنانے اور صرف زیب و زینت کا نام بہتر معیشت ہو۔ جس معیشت میں کوئی خوف بھی موجود نہ ہو حسین و جمیل شہروں اور پر شکوہ محلات میں بسنے والے ہوں اور پھر کسی دکھیے کی مدد تک نہ کر سکیں تو اس کا صحیح ترجمہ یہی ہو سکتا ہے۔

شہر و محلات، آشائش اور خوبصورت رنگا رنگ زیب و زینت اس سانپ کے مانند ہیں جو بظاہر بڑا خوبصورت ہو اور خوبصورت باغ و بستان میں رہتا ہو اور نشۂ زہر میں مخمور ایسا معلوم ہوتا ہو کہ وہ بالکل بھولا بھالا اور بے ضرر ہے اور نادان اسے خوبصورت جان کر اس سے کھیلیں اور ہلاک ہو جائیں۔

تہذیب و تمدن کی بنیاد نیکی پر استوار ہو کر ہی اسے صحیح تہذیب و تمدن بنا سکتی ہے۔ ورنہ خدا جانے ان بھرے شہروں میں یہ خوش گذرانیں کتنے ہی معصوم دلوں کا مذبح بن جانے کا باعث بن جاتی ہیں۔ اسلام نے اللہ کے خوف پر ہر چیز کی بنیاد رکھی ہے اور خوف کے ساتھ رجا دیا ہے تاکہ اپنے کیے کی جزا کی امیدوں پر مزید نیکیاں سرانجام دی جا سکیں۔

اسلام ایمان و بندگی کو اولیت دے کر پھر معاملات کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ پہلے تزکیۂ نفس کے ساتھ عجبِ ذاتی کی بیخ و بن اکھاڑتا ہے۔ ایمان باللہ، عبادات اور معاملات، تینوں صحت مندانہ راہ پر چل کر معیشت حقہ کی صورت میں نمودار ہو کر باہمی آسائش بن جاتے ہیں۔ اسلام کی معاشی تشکیل ان اوصاف پر مرتب ہو کر امن کا گہوارہ بن جاتی ہے۔ جب اسلامی معاشرہ اپنے ان متذکرہ صفات پر کاربند ہو جائے تو نتیجہ کے طور پر اس سے اخلاقی قدریں پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ جس طرح گلستان سے خوشبو پیدا ہو کر گلشن اور صحنِ گلشن سے باہر نکلتی ہوئی قرب و جوار سے گذر کر دور دراز تک اپنے اثرات پھیلا دیتی ہے۔ اور اس کے تاثرات خوش کن ہوتے ہیں۔ اسی طرح دیگر مذاہب جن کی بنیاد نیکی پر رکھی گئی تھی۔ مگر مابعد آنے والی نسلوں نے بنیادی نظریات کو فراموش کر دیا اور محض بندۂ

نفس ہو کر نفسانی خواہشات میں بٹ گئے۔ انہوں نے بھی اپنی راہ وہی بنا لی جو محض حصولِ منفعت ذاتی تک پہنچانے کا ذریعہ بن سکے۔

یہ سب قسم کے لوگ معاشی حالت کی بنیاد اقتصادیات پر رکھتے ہیں اور اقتصادیات چند افراد تک محدود ہو کر بڑی تنگ رفتاری سے معاشرے تک اپنے اثر و نفوذ کو جاری رکھتی ہیں۔ جس سے لوگ تنگ ہو جاتے ہیں۔ کمزور زیادہ کمزور اور طاقتور زیادہ طاقتور ہو جاتے ہیں شہر بارونق ضرور ہو جاتے ہیں۔ مگر عام لوگوں کے قلوب سخت نالاں ہوتے ہیں۔ ہر غریب اپنے زورِ بازو پر اپنی طاقت سے زیادہ کام کرتا ہے۔ مگر اسے معاوضہ بہت کم ملتا ہے۔ اس طرح آسائش غیر متوازن ہو کر چند گھروں کی لونڈی بن جاتی ہے۔ اسلام ایسی معیشت کی، جو بظاہر حسین ہو، مگر بباطن ناانصاف اور اذیت ناک ہو سخت ممانعت کرتا ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ خود جھونپڑوں میں رہو مگر عام لوگ خوش گذران سے آسودگی پائیں۔

اسلام نے جو نظامِ اقتصادیات کا درس دیا ہے وہ نہایت سادہ عام فہم اور آسودگی کی مساوی تقسیم کرتا ہے۔ اسلام میں ظاہر و باطن کے تمام معاملات اور معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی خوشحالی محض خدا کی رضامندی کے لیے بروئے کار لائی جاتی ہے۔ اس کے نزدیک بندگی کا پھیلاؤ نیّت سے زبان، زبان سے بدن اور بدن سے انفاقِ مال کے ساتھ ہے۔ وہ بندگی کے لیے زبانی صدق و صفا کے ساتھ حمدِ باری تعالےٰ بیان کرنے اور لوگوں سے میٹھی بات کرنے کا حکم دیتا ہے اور بدن سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ ایسی محنت و مشقت کی تعلیم دیتا ہے۔ جس سے لوگوں کی ضروریات میں مدد مل سکے۔ وہ انفاق مال

مرضیات خداوند ذوالجلال کے ساتھ اس طرح تقسیم کرتا ہے کہ اپنی ضروریات پورا کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی ضروریاتِ زندگی بھی پوری ہو سکیں۔

اسلام نے مسلمانوں کی زبان اور ہاتھ کو اذیت سے منع کیا ہے۔ اسلام کے نزدیک تحیاۃ لسانی کا اتمام بغیر نیکی کے مکمل نہیں ہو سکتا اور تحیاۃ بدنی بھی بغیر مجوزہ نیکیوں کے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتے اور انفاق مال بھی لوگوں کی خدمت کے بغیر انفاق صادقہ نہیں ہو سکتا۔ اسلام مومن کے دل کو نیت سے باندھ کر عالمِ روزگار میں نیک کاموں کے ساتھ معیشت درست کرنے کا حکم دیتا ہے۔

بصورت دیگر ایسی معیشت کو معیشت محض کہہ کر راہ حق سے الگ کر دیتا ہے۔ جہاں انسان کے خون و پسینہ کی قیمت کچھ نہ ہو۔ اور انسان کو معصوم بکروں کی طرح ذبح کیا جاتا ہو۔ جہاں انسان سے بیلوں اور حیوانوں جیسا سلوک کیا جاتا ہو۔ جہاں انسانی احساسات کو بری طرح کچل دیا جاتا ہو۔ ایسی معیشت سے اسلام میں الاماں کی تعلیم دی گئی ہے۔

# باب ہشتم

## رازِ زندگی

بندگی ایک ہمہ گیر رازِ زندگی ہے۔ محض ظاہری بندگی تو سخت ریا ہے اور ریا ظلمِ عظیم ہے۔ ریا صداقت باطنیہ کی قاتل ہے۔ ریا آئین کُش ہے۔ ریا خلاف فطرت ہے۔ ریا ہی نیّت کو خراب کرتی اور ظلم پر آمادہ کرتی ہے ریا دل سے اٹھ کر زبان، بدن اور مال و دولت کو نمود و نمائش پر آمادہ کرتی ہے۔

اس طرح انسان زادہ محض نمود و نمائش کا پتلا بن جاتا ہے۔ ریاکار ظالم بن جاتا ہے اور ریا، ظلم عظیم ظلم ہے۔ "الریاءلظلم عظیم" ظلم کو اسلام کی زبان میں ہیمنت تعبیر کیا گیا ہے۔ بندگی کا پھیلاؤ ارض و سما پر محیط ہے۔ حضور سرور کائنات ﷺ کی بندگی نے سینۂ گیتی میں خوشی کی لہر دوڑا دی اور عرشِ عظیم نے آپ کے قدوم میمنت لزوم کو چوما اور خدائے لم یزل نے آپ کو اپنا مہمان بنایا اور اپنے پاس بلایا۔ اور خود ہی میزبانی کے فرائض انجام دیے۔

یہ بندگی کا کمال تھا۔ بندگی جب صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین میں پھیلی۔ تو وہ سب مظہر خلق عظیم کی تصویر بن گئے۔ خداوندِ تعالےٰ مربی و محسن ہے۔ اس کی اس صفتِ پاک کا مظہر حضور نبی اکرم علیہ

الصلوۃ والسلام ہوئے اور متخلّق باخلاقِ باللہ ہو کر آپ نے انسانیت کی راہنمائی انسانی خدمات کے ساتھ کی اور صحابہ کبار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے آپ کے خُلقِ عظیم سے سبق لے کر انسانیت تک اس طرزِ اسلام کی آواز پہنچائی اور اسلامی طرزِ خدمت اور طرزِ عمل کے ساتھ معیشت کی بنیاد رکھی۔ عجم کے بلالِ حبشیؓ اور ایک عربی النسل میں کوئی فرق نہ چھوڑا محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔

یہ وہ طرزِ عمل ہے۔ جس کی تکمیل یا خدمت بندگی کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اللہ سے ڈر کر بندگی کرنا زبان، بدن اور انفاق کے مصرف کے صحیح ہونے پر نظر رکھنا اور آگے بڑھ کر دامنِ رحمت تھام لینا۔ یہ طرزِ حیات اپنے لیے ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے باعث طمانیت و سکون ہے۔ بندگی وہ ہے جو محض اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ بندگی کرنے والا ہر چیز کو معہ اپنی ذات کے ماسوا اللہ قرار دینے کے بعد ہی بندگی کا راز پا سکتا ہے۔

اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ استکبارِ نفسی ہے۔ بندگی کا مقصد ہر قسم کی بڑائی سے اجتناب کے ساتھ حصولِ عجزو نیاز ہے۔ اگر بندگی بھی حصولِ عجزو نیاز حاصل نہ کر سکے۔ تو یہ علامت ہے کہ اب تک خواہشاتِ نفسانی مخلصانہ بندگی میں مخل ہو کر اس کو داغدار کر دیتی ہیں۔ ایسی حالت میں بندہ کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس میں جھانک کر دیکھے کہ کیا اس میں کسی قسم کا تکبر آ گیا ہے۔ اس کو سمجھے اور سبب معلوم کرے۔ علاج کے لیے اہل اللہ کی طرف رجوع کرے۔

بہر حال استکبار کو اپنے جسم سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کرنا بندگی ہے تاکہ سبیلِ بندگی سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ سے دور نہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اور رسولِ مقبول ﷺ سے دور ہونا ہی گمراہی ہے۔

بندگی نے جب حکم الٰہی سے بصورت آخرالزمان سرور کونین علیہ الصّلوٰۃ والسّلام آغاز کیا تو اس وقت بندگی کی ادائیگی پر فرشتوں کو رشک ہوا۔ اس واسطے کہ انہوں نے آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش پر

نَحنُ نُسَبِّحُ بِحَمدِ کَ وَنُقَدِّسُ لَکَ

کہہ کر تعارض پیدا کر دیا تھا۔

مگر سرورِ کائنات نے اپنی بندگی کے ساتھ آخری عجزونیاز کا اظہار فرمایا۔ اپنی خدا داد بڑائیوں کو جو آپ کو افضل الخلائق کا مقام دیتی ہیں، خداوند تعالےٰ کے حضور میں سب کو بھول کر صرف لفظ عبد کو اپنے لیے پسند فرمایا اور اسی جذبہ بندگی کے ساتھ اس کی عبادت کے آخری فرائض انجام دیے۔

درحقیقت آپ کی آخری اور ختمی بندگی ہی اِنِی اَعلَمُ مَالَا تَعلَمُونَ کی عملی تفسیر تھی۔

اگر مخلوقات خدا میں کوئی مخلوق اپنی برتری پر اظہار فخر کر سکتی تھی تو یقیناً فخرِ موجودات سرورِ کونین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے اُولےٰ تر اور جائز تھا کہ وہ اپنی برتری پر بجا طور پر افتخار کرتے کہ وہ خداوند تعالےٰ کے ازلی ابدی اور سرمدی محبوب اور اس کے آخری رسول ہیں مگر آپ نے فرمایا اَلفَقرُ فَخرِی۔ بجائے اور قسم کے افتخار کے صرف اَلفقرو فخری پر ہی اکتفا فرمایا۔ مجھے اللہ کے حضور اظہار فقر میں فخر ہوتا ہے۔ یعنی اس کی بندگی

ہیں۔ یعنی مجھے خدا کی بڑائی کے سامنے صرف اور صرف اپنی عاجزی پر فخر ہے۔ آپ کی ذات باعث تخلیق کائنات تھی۔ آپ صفات میں بعد از خدا کا مرتبہ رکھتے تھے۔ مگر باوجود ان صفاتِ کریمانہ اور صفاتِ ختمیہ کے بھی آپ نے کبھی استکبار اً افتخار نہیں فرمایا۔

اگر آپ نے کہیں افتخار فرمایا تو صرف اپنی عاجزانہ بندگی پر آپ نے اپنی آخری فضیلت کا شکرانہ ہمیشہ اپنی زبان پاک سے اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرنے اور اپنے بدنِ پاک سے عبادت کرنے اور اپنے خداداد مال پاک کے خرچ کے ساتھ ادا کیا۔

حضور اکرم علیہ الصلوۃ والسّلام نے دن رات کے ہر ہر لحہ کے ساتھ اپنی پوری زندگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بندگی کو آخری طور پر مکمل فرمایا۔ شبہاشب اپنے پائے مبارک پر کھڑے ہو ہو کر عبادات انجام دیں۔ آپ کے پائے مقدسہ میں ورم آجاتا۔ یہاں تک کہ محبوبِ پاک ﷺ کی حالت پر اللہ تعالیٰ کو محبانہ رحم آگیا۔ اور فرمایا۔

یاایھاالمزمل قمِ اللّیلَ الّا قَلِیلاً نصفہ اَو نقُص منہُ قَلیلاً

اے کملی پوش حبیب پاک محمد مصطفٰے ﷺ آپ رات کی عبادت میں جو قیام فرماتے ہیں۔ وہ تھوڑا کر دیں۔ نصف رات یا اس سے کم و بیش۔

حضور علیہ الصلوۃ والسّلام نے ساری زندگانی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گذار دی اور اسی پر تبلیغ دین کا اتمام فرمایا۔

بندگی نے عقیدۂ توحید سے ابتداء کی اور عبادات و معاملات و معاشرت کی تکمیل اور اخلاقِ کریمانہ کا اتمام کرتی ہوئی اِنکَ لَعَلیٰ خُلُق عَظِیم

کے ساتھ معراجِ کمال تک فائز المرام ہوئی۔ یہ حضورؐ علیہ الصلوۃ والسلام کی بند گی تھی۔ جس نے انسانی تہذیب و تمدن کی بنائیں دلوں میں استوار کیں اور بازارِ انسانیت کو بہمہ وجوہ بند گی ہی بند گی بنا دیا۔

آپ کے تاثرات بند گی یہاں تک پھیل کر وسیع ہوئے کہ بڑے سے بڑے لوگ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور منکرین حق بھی توحید و رسالت کے نغمے گانے لگے ہر زبان پر الحمد اللہ سبحان اللہ کا ورد جاری ہو گیا۔ لوگ ہمہ وقت باوضو رہتے۔ رات باوضو سوتے تاکہ نیند میں بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہوں۔ عورتیں گھاٹ پر بند گی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ پردہ نشیں عورتیں پردوں میں عبادات الٰہی میں مشغول ہو گئیں۔ کوئی کام بے طہارت اور بغیر بسم اللہ کے نہ ہوتا۔ خلوت و جلوت میں ذکر و فکر کے مشغلے جاری ہیں۔ سفر میں حضر میں، دشت و جبل میں اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہو گئیں۔ جدھر نظر اٹھاؤ بس اللہ کے بندوں کی بند گی کے حسین و جمیل مناظر ہی نظر سے گزر رہے ہیں۔ گویا کہ یہ ساری بستی ہی پیکر بند گی ہو گئی ہے۔ بند گی کے اس پھیلاؤ نے بندوں کو چشم بینا و دل بینا عطا کر دیئے علم و عمل سے آراستہ کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے لوگ عرفانِ باللہ سے ہمکنار ہو گئے۔

اس منظر حقیقی کی پر تاثیر اداؤں سے اپنے تو اپنے غیر بھی اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ گویا کہ یہ لوگ آسمان بند گی کے تابندہ ستارے ہو گئے۔ جنھوں نے پوری انسانیت کو خدائے لم یزل کی طرف دعوت بند گی میں راہنمائی کے فرائض انجام دیے۔ اور مسلمان عشق خدا و عشقِ رسول میں

فنا اور مستغرق ہو گئے اور اکثر اللہ تعالےٰ کی بندگی کے ساتھ خدمت خلق کے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے۔ ان کے قول و عمل سے ثابت ہوا کہ مسلمان اگر پنج گانہ نماز کے ساتھ اسلامی معاملات کو بھی بندگی قرار دے کر فرائض بندگی ادا کریں تو نظریہ اسلام کی ہمہ گیر افادیت بنی نوع انسان کے سامنے آجائے۔

اسلام نے ایسے لوگوں کو ولی اللہ کہا یوم بلوغ سے لے کر تادم واپسیں ہر مسلمان مرد و عورت کو عبادات و معاملات کے ساتھ بندگی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسلام نے خدمت خلق کو حقوق العباد کا نام دیا ہے۔ جس سے معیشت کو کمال تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اسی واسطے بندوں کے حقوق کو بندوں کی معافی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اسلام میں انسانوں کے اتلاف حقوق کی معافی بغیر ان لوگوں کی معافی کے نامقبول قرار دی گئی ہے۔ جن کی حق تلفی ہوئی ہو۔ ایسے لوگوں کو معاشرے کا مجرم کہا گیا ہے اور ان کی بندگی کو بے سود کہا گیا ہے۔ جو بظاہر بندگی کرتے ہوں۔ مگر بندوں کے حقوق پامال کرتے ہوں یہ لوگ بخیل قرار دیے گئے ہیں کہ لوگوں سے جلب منفعت کریں۔ مگر لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے بجائے الٹا ان کی حقوق تلفی کریں۔ ایسے لوگوں کے متعلق فرمان ہے کہ اگر یہ لوگ بر و بحر کے زاہد بھی کیوں نہ ہو جائیں۔ بخشے نہیں جائیں گے۔

ہر مسلمان پر ضروری ہے۔ کہ وہ نماز کے ارکان یاد کرے۔ تاکہ نماز کی ادائیگی میں کوئی فرق پیدا نہ ہو۔ نماز اس بادشاہ مطلق کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ جس کی جلالت کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا۔ اتنے بڑے بادشاہ

کی نماز ادا کرتے ہوئے اگر اس کی بڑائی اور جلالت کو دل میں جگہ دی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ نمازی نماز کے لوازمات اور ارکان سے غفلت کرے مگر اس کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کا لازمی خیال رکھے۔

جس طرح کامل نماز کے لیے کامل طہارت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح کامل طہارت کے لیے کامل ایمان، کامل طہارت، کامل نماز اور کامل خدمت خلق کے جذبہ پر کامل بندگی کا اطلاق ہوتا ہے۔ مگر خواص کے لیے تفقہ کی بھی ضرورت ہے۔ وہ حلال و حرام کے باریک مسائل پر اور عبادات و معاملات پر عبور رکھتے ہوں۔ عبادات و معاملات کے روحانی مدارج پر بھی نظر رکھتے ہوں اور اپنے نفس اور عوام الناس کی خدمات کے عارف ہوں۔

یہ طریقہ بندگی کو خاص الخاص بنا دیتا ہے اور خاص الخاص بندے اپنے خدا کو دیکھ لیتے ہیں اور عام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے دل میں یہ گمان کریں کہ وہ جس خدا کی نماز پڑھتے ہیں، وہ ان کو دیکھ رہا ہے تاکہ ان کے دل میں خوف خدا موجود رہے اور جب خوف خدا موجود ہوگا تو وہ اپنی نماز درست کرنے میں باخبر رہیں گے اور حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی نگہداشت کریں گے۔

چھوٹے بچوں پر اسی طرح نماز اثر انداز ہو سکتی ہے۔ جب کہ گھر اور شہر کا ماحول اس انداز میں نماز پڑھ رہا ہو کہ گویا خداوند ذوالجلال کی حکومت کارفرما ہے اور یہ کہ ہمارے سب کاروبار زندگی صرف اللہ کے حضور نماز اور خدمت خلق کے لیے ہیں۔

اگر ہم اس مجوزہ بندگی کی ادائیگی نہیں کریں گے تو دنیا کے

سارے دھندے بے کار اور بے معنی ہو کر رہ جائیں گے اور ہماری ہستی کی قیمت خدا کے حضور میں ختم ہو جائے گی۔ اگر بندگی کا یہ سلسلہ اپنا تواتر جاری رکھ سکے تو ایک غریب کے جھونپڑے سے لے کر ایوانِ حکمران تک خشیت ربانی کے ساتھ تحریک کا باقاعدہ نفاذ ہو سکتا ہے۔

یہ وہ دستورِ اسلام ہے جس سے ایک طرف پوری ریاست بندگی کا مظہر ہو کر عالمِ انسانیت کے سامنے آ جائے اور دوسری طرف انسانی معاملات یعنی انسانی باہمی تعلقات خوف خدا پر استوار ہو کر ایک ایسی صالح تہذیب و تمدن کی صورت اختیار کرے جس کا نتیجہ خلقِ عظیم کی اطاعتِ اجتماعی کی تفسیر بن جائے۔ کتاب و سنت میں

مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُ وْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْاوَاتَّقُوْا اللّٰہ

کا یہ ترجمہ ہے۔

کہ جو کچھ تمہیں اللہ کے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملے اس پر عمل کرو اور جس کام سے وہ تمہیں منع فرمائیں اس سے باز آ جاؤ۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مسلمانوں کو نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ کے احکامات ملے ہیں کہ خدا اور رسول پر ایمان لانے کے بعد ان ارکان اسلام کی پابندی کرو۔ ان مذکورہ پانچ بنیادوں پر اسلامی ریاست کے تہذیب و تمدن کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ یہ وہ طرزِ تمدن ہے۔ جس کی بنیاد خوف خدا پر قائم ہوتی ہے۔ اولاً یہ کہ تم سب انسان خدا کی مخلوق ہو۔ دوئم یہ کہ تم سب کا پالنے والا ایک خدا وحدہ لاشریک ہے۔ سوئم یہ کہ وہ اپنی رحمت خاص سے تمہیں اس دنیا میں تدریجاً ترقی دے کر صلاحیتوں کے ساتھ کمال تک پہنچاتا ہے کہ اس کی رحمتِ خاص انجام کار بھی تمہیں کام آئے گی اور

یہ کہ دنیا و آخرت کا وہی مالک ہے۔ سزا و جزا کے دن کا مالک ہے۔ یہ صفات باری تعالےٰ جس تہذیب و تمدن کے ذہن میں جاگزیں ہوں۔ وہ بھلا کسی اور کی عبادت کرسکتا ہے؟۔

یقیناً اس تہذیب و تمدن میں دینی و دنیوی عروج محض سجدوں پر استوار ہو گا۔ ان کا معبود وحدہ لاشریک ہو گا۔ ان کی مستعانِ حقیقی وہی ایک ذات ہو گی۔ وہ اس کو ہادیٔ مطلق گردانتے ہوئے سب کام اسی کے لیے کریں گے۔ یہی ان کی صراطِ مستقیم ہو گی۔ جملہ انبیاء کا یہی مذہب تھا اور صدیقین و شہداء اور صالحین کا یہی مسلک رہا ہے اور اسی مسلک پر صراط مستقیم کا صحیح اطلاق ہوتا ہے۔ جس قوم کی معیشت ان بنیادوں پر تعمیر پا کر سامنے آئے۔ اس سے بہتر اور کون سی معیشت ہو گی۔ یہ کامل ترین معیشت جو مالک و مختار کے سامنے سجدہ ریز ہونے پر مرتب ہو۔ اس سے بہتر کوئی معیشت نہیں ہو سکتی۔ اقوام عالم میں جن قوموں نے خدا کے ساتھ کسی کو شریک بنایا۔ ان ہی لوگوں نے انبیاء کی ہدایت سے انکار کیا۔ اور انبیاء کرام سے انکار کے نتیجہ میں وہ شرکِ باللہ کی مجرم ہوئیں۔ ان کی تہذیب و تمدن نے جس معیشت کی تخلیق کی اس کا آغاز عیش سے ہوا۔ اور ان کا اختتام بھی اسی عیش نفس پر ہوا۔

ایسی قومیں اقبال مندی میں بھی نگاہ فطرت کی معتوب رہیں۔ ان کا زوال و ہلاکت بھی عتابِ الٰہی کے نتیجہ میں واقع ہوا اور اہل حق اقبال مندیوں میں بھی مقبول و منظور حق رہے اور کسی سخت آزمائش میں بھی انہوں نے اپنے مالک و مولا کی رضا جوئی و خوشنودی کو فراموش نہ کیا۔ وہ سخت شدائد میں بھی مقبول و منظور حق رہے۔

جس تہذیب و تمدن کا منشا صرف نفس کی خواہشات کو پورا کرنے کے ساتھ دل کو بہلانے تک ہو۔ اس تہذیب کے ضعف کا اندازہ وہی کر سکتا ہے۔ جس نے خدا کی لازوال قدرت پر ایمان کو مکمل کیا ہو۔

لہذا اسلام ایک آخری مذہب ہے جس نے دلوں کو راست بازی پر ایمان لانے اور راست بازی پر کاروبار دنیا چلانے، راست بازی پر مرنے اور راست بازی پر انجام حاصل کرنے کی تعلیم دی ہے۔

مسلمان اگر اسلام کو محض رسمی جان کر رسماً مسلمان ہونے کے عادی رہے اور اس پر یہ نہ سوچ سکے کہ یہ فلاح دارین کا ضامن ہے تو غالباً ملّتِ اسلامیہ کے لیے اس سے زیادہ دنیا و عقبیٰ میں کوئی المیہ نہیں ہو سکتا۔

مسلمان جب تک زندہ رہے۔ پہلے اپنے وجود کی تہذیب باطن کو تقوی پر استوار کرے اپنے نفس کو قابو میں لائے۔ حرص و ہوا سے بچے۔ نفس کی معرفت حاصل کرنے کے لیے خدا کی بندگی کرے۔ اور ریا، کینہ، حسد و بغض کو اپنے سینہ سے ختم کر دے۔ پھر دوسروں کو تادمِ زیست اللہ تعالیٰ کی بندگی کی دعوت دیتا رہے اور اسلامی تہذیب اخلاق کی ترجمانی کرے۔ اسلامی معاملات پر روشنی ڈالے۔ اسلامی معاشرت کا عملی درس دے۔ اسلامی اخلاقیات خود بخود ان احوال سے گذر کر سدھر جاتے ہیں۔ اخلاقِ اسلامی اس دنیا میں ثمر عمل ہے۔ جس طرح اچھے درخت سے اچھا پھل پیدا ہوتا ہے۔ بالکل اسیٰ طرح اچھے اعمال سے اچھا ثمر اخلاق حسنہ پیدا ہوتا ہے۔

بہر کیف ساری زندگی عاجزی، انکساری، بندگی، مروت، خدمتِ خلق اور وعظ و نصیحت پر گذارنی چاہیے۔ اس بندگانہ ماحول سے دل پر

بڑے بڑے نیک اور گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جو مومن کے جسم وجان کا خمیر بن جاتے ہیں۔

اس طرح سے تائید خداوندی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور انجام بالخیر ہونے کی امید ہو سکتی ہے۔ ورنہ دنیا دار فانی ہے۔ کوئی فرد یا قوم کتنی اعلیٰ معیشت کے مالک کیوں نہ ہو جائے۔ بغیر اسلامی نظریۂ حیات کے انجام کار سخت گھاٹا پائے گا۔

# بابِ نہم

## میر امتاعِ زیست
## اور
## والدین کی عاطفت

اپنے والدین کی عاطفت میں مجھے دینی تربیت کے ساتھ ساتھ جذبۂ ایمان ملا جس پر میں نے بندگی کی باریک تر راہ پر قدم اٹھایا۔ ان کے پندو نصائح اور بزرگانِ طریقت و شریعت کی صالحانہ تاریخ کی روشنی میں اس کتاب موسوم ابنِ عبداللہ لکھنے کے لیے اللہ تعالےٰ سے استعانت طلب کی اور اس باریک ترین اور احتیاط طلب راہ کو اختیار کیا۔ شاید کہ میں بھی اللہ تعالےٰ کی ہدایت کا کسی حد تک ترجمانِ باایمان ثابت ہو سکوں اور اہلِ ایمان سے دعائے خیر وصول کر سکوں اور یہ کتاب میرے لیے ذریعۂ نجات بن سکے اور اسلامی مصنفین کے بازار میں اس بڑھیا کی طرح خریداروں میں شامل ہو سکوں جو بڑے بڑے مالداروں کی موجودگی میں ایک معمولی سوت کی اٹّیہ لے کر حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خریداروں میں شامل ہو گئی تھی اور جن کا نام جریدۂ عالم کے خوش بخت خریداروں میں ابدالآباد تک روشن رہے گا۔

مجھے اپنے والدین کی نصیحت کے مطابق صرف اللہ تعالےٰ کی بندگی

اور حقوق العباد کی نگہداشت پر کار بند ہو کر ہی تحریر و تقریر کی اجازت ہے اور یہی میرا سرمایۂ حیات ہے۔ کسی مسلمان کے لیے اس سے بہتر کوئی سرمایۂ حیات نہیں ہو سکتا۔

قرآن و حدیث کی روشنی میں صالحینِ امت نے جو کردار ادا کیا وہ کتابِ حیات بھی ہو سکتی ہے اور کتاب ناطق بھی۔ اس کو صحیح معنوں میں سرمایۂ عملوا لصلحت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ احکاماتِ الٰہی انسانی حیات میں برائی اور بھلائی کا تعین کرتے ہیں اور ان ہی تعینات پر کار بند رہنے اور کار بند رکھنے کے لیے تصنیفات اور مکالمات کی ضرورت درپیش آتی ہے تاکہ احکاماتِ کے ذریعہ جو جو تعینات ہوئے، ان کو ذریعۂ نجات قرار دینے کے لیے زبان و قلم سے کام لیا جائے۔ اگر ذہنِ مصنف یا ذہنِ واعظ اس مطمحِ نظر سے ہٹ جائے تو اسلام میں ایسی بھٹکی ہوئی زبان و قلم کا کوئی اعتبار نہیں۔

ہمارے متقدمین صالحین اہلِ زبان و قلم نے جس پابندیٔ تسلیم و رضا کے ساتھ زبان و قلم کے فرائض ادا کیے۔ وہ قابلِ تقلید ہونے کے علاوہ اس میدان میں لاینحل عقدوں کی عقدہ کشائی بھی کرتے ہیں لہذا اُن کی متقیانہ طرزِ تصنیف کی اطاعت میں ہی کوئی تصنیفی آغاز کیا جائے تو وہ زیادہ مقام قبولیت پا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسولِ مقبول علیہ الصلوۃ والسلام اور اپنوں میں سے کسی پرہیز گار کی اطاعت ہی مسلمانوں کی صفاتِ اعمال کو قابلِ سند بنا سکتی ہے۔

فلہذا میں اپنی اس تصنیف کا موضوعِ اول حضرت والدہ بزرگوارہ

کی اس نصیحت کو بناتا ہوں، جس میں آپ نے مجھے خوفِ عاقبت اور موت کا درس دیا اور نماز کی تلقین فرمائی اور نماز کو ترک کر دینے اور خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کرنے پر قرآن مجید کے حوالہ سے اس المیہ کو آثارِ قیامت قرار دیا اور پھر قیامت کے چند اور آثار بھی بیان فرمائے۔ مگر چونکہ آپ کا مرکزِ پند و نصائح نماز تھا۔ اس واسطے کہ عقیدۂ توحید اور عقیدۂ ختمِ رسالت کے بعد مسلمان پر سب سے پہلے جو فرض عائد ہوتا ہے، وہ نماز ہے۔

نماز کے حقوق و ارکان کی حفاظت و رعایت پر ائمہ اربعہ نے کتاب و سنت کی روشنی میں مکمل روشنی ڈال دی ہے۔ ہر مسلمان پر ضروری ہے کہ وہ سب سے اول نماز کو اس کے ارکان کی حفاظت کے ساتھ ادا کرے۔

میری والدہ جن کا اسمِ گرامی غیر معروف تھا۔ چونکہ اطراف و جوانب پہاڑ کے لوگ مذہبی پیشواؤں کی باحرمت ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو ہمیشہ ادباً بی بی صاحبہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ بدیں وجہ اس ادبی رواج سے اکثر مذہبی پیشواؤں کی ماؤں کے نام لوگوں کے زبان زد نہ ہونے کی بنا پر غیر معروف رہتے ہیں۔ مگر اماں جان کی ہمعصر خواتین آپ کے نام سے جزوی طور پر آشنا تھیں۔ ان کا نام مبارک حافظہ آمنہ تھا۔ مگر وہ صرف حافظ جان کے نام سے ہی، جو پورے نام کا ایک حصہ ہے، روشناس تھیں۔

آپ مغلیہ خاندان کے ایک عالم و فاضل اور متقی گھرانہ میں موضع ساٸن، تحصیل مری میں پیدا ہوئیں اور علم و فضل میں اپنے وقت کی ایک وحید خاتون تھیں۔ قرآن مجید اور احادیث شریفہ کے تفسیری علوم صرف و نحو، منطق و معقول تک فضیلتِ علمیہ کی مالکہ تھیں۔ اللہ تعالےٰ نے آپ

کو بڑی ذہانت و فطانت عطا کر رکھی تھی۔ آپ نے دیول شریف کی سرزمین میں اکثر و بیشتر لوگوں کو تعلیم قرآن سے روشناس کرایا۔ آج بھی ان کے شاگردوں کی کثیر تعداد دیول شریف اور اکناف دیول شریف میں پائی جاتی ہے۔

آپ نے سلسلۂ تعلیم و تعلّم کے علاوہ تبلیغ دین کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ آپ نہایت منکسر المزاج، حلیم الطبع تھیں۔ کبھی آپ کی زبانِ مبارک سے غلیظ قسم کے الفاظ سننے میں نہیں آئے۔ بڑی بااخلاق، بڑی عابدہ و زاہدہ اور شاکرہ باللہ تھیں۔ آپ بڑی متوکل وقانع و بردبار واقع ہوئی تھیں۔ غریبوں، بے کسوں، غم زدوں، بیماروں پر تلطف فرماتی تھیں۔ حالانکہ خود آپ کا گھرانہ اتنا آسودہ حال نہیں تھا۔ نہایت مختصر ذرائع و وسائل کے ساتھ آپ نے ایثار کے طور طریقوں سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لوگوں سے حسنِ سلوک کا برتاؤ کیا۔ پڑوسیوں سے آپ کے حسنِ سلوک کا یہ عالم تھا۔ جیسے اپنی حقیقی ماں بچوں سے تلطف فرما رہی ہو۔

دیول شریف کی سرزمین علم و ادب اور اخلاق کا گہوارہ رہی ہے۔ وہاں کے مرد و زن بڑے معاملہ فہم اور نہایت سنجیدہ واقع ہوئے ہیں۔ یہ تدبر و فہم و فراست خاندانی طور پر صدہا برسوں سے ان لوگوں کی میراث میں چلے آئے ہیں۔ ایسی باشعور مجلس میں اپنے اخلاق و تدبر، حسنِ مروت، حسنِ سیرت، حسنِ علم و عمل کو منوانا سوائے ذاتی اور فطری شرافت کے مشکل ترین امور سے ہے۔

مگر وہاں کے باشندوں نے آپ کی صفاتِ ذاتیہ اور خدماتِ دینیہ

کے گن گائے۔ آپ کی تاریخ اخلاق اب بھی لوگوں کے ذہنوں میں ایک نیک اور خدارسیدہ خاتون کی صورت میں موجود ہے اور خاص و عام آپ کو یاد کرتے ہیں اور آپ کو دعائیں دیتے ہیں۔ شاید آپ کی یہ تاریخ بہت سے وجوہات کریمانہ کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے لوگوں کے دلوں میں محفوظ رہے۔ چونکہ فی الواقعہ آپ پارساء وقت تھیں جنہیں بھولے سے بھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ آپ کے بہت سے ایسے مقالات و کرامات ہیں جو قابل ذکر ہیں۔

والدہ بزرگوارہ کے زہدواتقا نے ایک خدارسیدہ خاتون ہونے کی حیثیت سے جو اثرات میرے دل پر ڈالے، وہ بھی ایک طویل ترین داستان ہے۔ جس کے لیے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ مگر آپ بعض سیدھے سادے فرمان اور بھولے بھالے نصائح اور عاجزانہ بسرِ اوقات، مفکرانہ نشست و برخاست، حلیمانہ برتاؤ، نرم کلامی، جود و سخا، کم گوئی، عفت و عصمت، حیا و نگوں سازی، علم و عمل، کتاب و سنت کی پیروی، خدا و رسول کی محبت، ہمہ وقت اولیاء امت کے تذکرے، اسلامی مسائل پر عام فہم تشریح، غریبانہ گذران، ایک ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں سنتِ عظیمہ کی تکمیل، حیات و موت کے درمیان استقامت بار بار عزتِ نفس کے خلاف نفرت آمیز کلمات کے ساتھ نصیحت، بار بار اللہ کے سامنے اپنے آپ کو حقیر و پر تقصیر سمجھنے کی تلقین، ہر خوشی و غم میں شکرانہ خداوند تعالےٰ کی بجا آوری، ہمہ وقت خندہ پیشانی، ہمہ وقت اللہ کے بارے میں گہری سوچ، ہمہ وقت محبتِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور نعتِ مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا درس، ایک درویشِ باللہ کے لیے جو صفات موزوں اور

ضروری ہو سکتے ہیں، ان سب کا ان میں پایا جانا وغیرہ۔ یہ وہ متاعِ زیست ہے۔ جو مجھے اپنی والدہ بزرگوارہ کی طرف سے میراث میں ملا ہے۔ مری گھٹی میں جذبہ انکسار ڈال دیا گیا تھا وہ یہ کہ میں کچھ نہیں نہ ہی میرا دعویٰ کچھ تھا۔ مگر مجھ پر اللہ تعالےٰ نے سب سے بڑا احسان یہ فرمایا کہ مجھے بندگی کی بلندیوں پر اڑنے کے لیے جو مقام ملا، وہ میرے والدین کی عاجزانہ اور درویشانہ زندگی کی عاطفت کے اثرات تھے۔

یہ وہ زندگی ہے۔ جو صفات فقر کی حامل تھی اور کرامات کا گھوراہ۔ ان کے خوارقات جو میں نے بچشم خود دیکھے، ان کے لیے بھی ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے مگر بطور یادگار نصیحت و ثواب مختصرات کی صورت میں کچھ پندو نصائح جو ان کی طرف سے مجھے ملے، بیان کرنا ذریعۂ نجات سمجھتا ہوں۔ شاید میرے لیے اور اہل اسلام کے لیے ذریعۂ ہدایت ثابت ہوں۔ والدہ بزرگوراہ نے مجھے بچپن میں جب کہ میں سات آٹھ برس کا تھا، قرآنِ مجید کا پہلا رکوع یاد کرایا اور آخر کی دس سورتیں یاد کرائیں۔ نماز کا سبق یاد کرایا۔ اس زمانہ میں ان کی اور نصیحتوں کے علاوہ جو نصیحت مجھے یاد ہے اور میرے ذہن میں جس نے زیادہ اثر کیا، وہ ذکر موت تھا۔ فرمایا کرتی تھیں موت ضرور آئے گی اور اللہ تعالےٰ نے ہر ایک کی موت کا ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ بڑی عمر پا کر ہی انسان مرتا ہے۔ فرمایا کسی کو موت چھوٹی عمر میں ہی آ جاتی ہے کسی کو جوانی میں اور کسی کو بڑھاپے میں۔ مگر یہ گمان کر لینا کہ موت صرف بڑی عمر میں ہی آتی ہے، ایک بڑی غلط فہمی ہے۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر چھوٹی عمر کے بچے بے خوف ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ان کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہو جاتا ہے کہ

بڑی عمر ہی میں مریں گے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ بلکہ چھوٹے اور بڑوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ موت کو اپنے سامنے رکھیں۔ تم نے دیکھا اور سنا بھی ہے کہ کتنے شیر خوار بچے شیر خواری کے ایام میں ہی مر جاتے ہیں اور کتنے ایسے بچے ہیں جو پانچ دس سال کی عمریں پاتے ہیں۔ بعض پندرہ بیس سال تک اور بعض اس سے اوپر، بعض چالیس سال تک یا اس سے بھی اوپر، بعض پچاس تک، بعض سو سال تک۔ گویا سیکنڈ منٹ بھی اس میں شامل ہیں۔ مگر یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالےٰ کا فیصلہ ہے۔ ورنہ کون ہے جو مرنا پسند کرے۔ اگر کسی طاقت کے بل بوتے پر انسان موت سے بچ سکتے تو بادشاہوں اور حکمرانوں اور ان کے شہزادوں پر موت کبھی نہ آتی اور اگر غربت سے موت واقع ہوتی تو غریب لوگ کس طرح اس دنیا میں اتنی طویل عمروں کے ساتھ زندہ رہ سکتے۔ یہ بالعموم دیکھنے، سننے میں آیا ہے کہ آج بھی ایسے غریب لوگ دنیا میں موجود ہیں جن کی عمریں سو سال سے بھی زائد ہو چکی ہیں۔ یہ دستور العمل قدرت کے اس فیصلہ کا قطعی اور علانیہ ثبوت ہے کہ موت امیر و غریب سب پر یکساں مسلط کر دی گئی ہے اور وقت مقررہ پر آتی ہے۔ جس میں ایک لمحہ آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ اٹل فیصلہ ہے جس سے کوئی تدبیر نہیں بچا سکتی۔

فرمایا اگر بچپن میں ہی یہ عقیدہ دل پر اثر انداز ہو جائے کہ خدا نے ہم کو پیدا کیا اور وہی ہم کو پالتا ہے اور اسی کے فیصلہ کے مطابق ہم پر موت ضرور آئے گی اور یہ کہ اس نے اپنی طرف سے اپنے نبی پاک کو ہماری ہدایت کے لیے بھیجا اور سچی ہدایت کا راستہ بتایا اور اللہ تعالےٰ نے اپنے سب سے برگزیدہ اور سب سے پیارے بندے سرور کائنات فخر

موجودات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت بنایا اور ان کے ذریعہ قرآن مجید جیسی آخری اور الہامی کتاب بخش دی جس میں ازل تا ابد سب کچھ لکھ دیا گیا ہے۔ جس کتاب مبین کے ذریعہ ہمیں دنیا میں اسلامی طریقہ پر رہنے سہنے کے جملہ طریقے بتا دیئے گئے ہیں اور اس کتاب کے ذریعہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ قیامت بھی ہو گی۔ جہاں سب مخلوقات کو خدا تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہو گی۔ اس دن صرف اللہ کی بادشاہی ہو گی یعنی سوائے اللہ تعالےٰ کے اس دن کسی کو کچھ اختیار نہ ہو گا۔

والدہ بزرگوارہ نے فرمایا۔ قرآن مجید نے جہاں قیامت کا ذکر فرمایا وہاں قیامت کے آنے کے کچھ آثار بھی بیان فرمائے اور آپ نے قرآن مجید کی ایک آیت پاک کا حوالہ دیا۔ گویا کہ وہ نشانی اس زمانہ میں پائی جاتی ہے۔ مجھے یہ سن کر خوف ہونے لگا۔ قرآن مجید کی وہ آیت پاک یہ ہے۔

فَخَلَفَ مِن بَعدِ ھِم خَلف اَضَاعُوا الصَّلوٰۃَ وَاتَّبَعُو الشَّھَوٰتِ فَسَوفَ یَلقَونَ غیًا۔

آپ نے ترجمہ کے طور پر فرمایا

کہ اس آیت میں پہلے بزرگوں کا ذکر کر کے فرمایا گیا ہے کہ ان کے بعد آنے والے ایسے لوگ ہوں گے جو نمازیں ضائع کر دیں گے اور نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ یہ علامت ہو گی کہ قیامت قریب تر ہے یا وہ بہت جلد اس سے مل جائیں گے۔

پھر آپ نے فرمایا۔ میرے نور نظر اگر غور سے حالات کا جائزہ لیا جائے تو اس آیت پاک کا ترجمہ بالکل سامنے آجاتا ہے کہ ہر گھر میں لوگ

خواہشاتِ نفسانی کی خاطر سب کچھ کر رہے ہیں۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اللہ کی صحیح نماز پڑھنے والے ہیں۔

اگر ایمانی سنجیدگی کے ساتھ نماز کے متعلق غور و حوض کیا جائے تو اہل دنیا کی اپنی حیات مستعار کے لیے محنت شاقہ ہی موجبِ نصیحت ہو سکتی ہے کہ وہ دنیا کے مشکل ترین کام ادا کر لیتے ہیں اور بار بار تاحین حیات کاروبار زندگی میں تکرار کرتے ہیں اور کبھی اپنی تھکاوٹ سے اکتاہٹ کا نام تک نہیں لیتے اور مسلسل حیات مستعار میں اپنے کاروبار کو جاری رکھتے ہیں۔ یہ کاروبار کتنے محنت طلب ہیں مگر پھر بھی دنیا دار لوگ بخوبی ان کو سرانجام دے رہے ہیں۔ اور ان کی انجام دہی میں بڑا فخر کرتے ہیں۔ مگر نماز پر نماز قضا ہوتی چلی جارہی ہے اور کہیں بھی اس المناک حالت پر کوئی افسوس تک کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔

برخلاف اس کے دنیاوی امور میں سے ایک معمولی سے خسارہ پر بھی کف افسوس ملا جاتا ہے۔ یہ علامت قیامت کے قریب ہونے کی ہے کہ لوگ اپنے پیدا کرنے والے سے زیادہ دنیا سے پیار کرنے لگے ہیں۔

قیامت تو قریب ہے مگر جب قیامت کے وہ آثار جو قرآن و حدیث کے ذریعہ ہمیں بتائے گئے ہیں ہمارے سامنے آجائیں تو یقیناً خوف و ہراس کو دل میں جگہ دینی چاہیے۔

اس زمانہ میں بہت سی چیزیں ایسی نمودار ہو چکی ہیں جو علاماتِ قیامت سے ہیں۔ چھوٹے، بڑوں کا ادب نہیں کرتے اور بڑے چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتے۔ مردوں میں عورتوں والے خصائل پیدا ہونے شروع ہو گئے اور عورتیں مردوں جیسا بننے کی نقل کر رہی ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے

انہیں مرد پیدا کیا ہے اور عورتیں کسی طرح بھی مرد نہیں بن سکتیں مگر مرد بننا چاہتی ہیں حالانکہ خالقِ فطرت نے مرد کو مردانگی کے لیے پیدا فرمایا اور عورت کو عورت ہو کر عورتوں والے فرائض سر انجام دینے کے لیے پیدا فرمایا۔

اسلام نے دونوں کو اپنی فطرت کی حدود میں رہ کر دینی و دنیوی امور سر انجام دینے کی تعلیم دی ہے مگر اسلامی تعلیمات میں عملِ صالح کی بنا پر ایک عورت انجام کار میدانِ حشر میں غیر صالح مرد پر درجہ لے سکتی ہے اور ایک مرد غیر صالح ہو کر میدانِ حشر میں عنداللہ عورت سے درجہ میں کم تر ہو سکتا ہے چونکہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ وہ درجات کی تقسیم اصناف پر نہیں کرتا۔ بلکہ درجات کی تقسیم نیک اعمال پر کرتا ہے اسلام نے مرد کو مرد رہ کر اور عورت کو عورت رہ کر اپنی اپنی حدود میں احکامِ اسلام کی بجا آوری کا حکم دیا ہے اور خلاف فطرت کسی بات کو پسند نہیں کیا فرض کیجئے کہ اپنی بیوی بچوں کی موجودگی میں اگر مرد کھانا، پکانا، سینا پرونا شروع کر دے اور عورتیں مردوں کے کام شروع کر دیں تو یقیناً دونوں کام کسی نہ کسی طرح ہونے شروع ہو جائیں گے مگر یہ فعل قانونِ فطرت کے خلاف ہے اور معیوب ہے۔ یقیناً اس گھر، اس بستی اور اس شہر اور اس ملک پر زوال آئے گا جہاں مردوں نے عورتوں کا طرزِ زندگی اختیار کیا اور عورتوں نے مردوں کی زندگی کو اپنایا۔

ہر چیز اور ہر پرزہ اپنے مقام پر رہ کر ہی صحیح کام سر انجام دے سکتا ہے۔ فطرت کے قرینوں کے خلاف جو بات یا کام وقوع پذیر ہو گا۔ یقیناً وہ ایک مہلک داستان بن کر اذیت بن جائے گا۔

عورتوں کا سرِ بازار مردوں کے دوش بدوش چلنا اور پھر بے حیائی اور عریانی پر خوف نہ کھانا اور مردوں پر سبقت لے جانے پر کمر بستہ ہونا ارشاد خداوندی کے مطابق قیامت کی نشان دہی کرتا ہے۔ چونکہ مرد و عورت کا یہ قرینہ خلافِ قانون فطرت ہے اس لیے جوں جوں مردوں اور عورتوں کے حالات زیادہ انحطاط پذیر ہوتے چلے جائیں گے۔ بس سمجھ لینا چاہیے کہ اہل زمانہ کو قیامت آواز دے رہی ہے۔ چاہیے کہ ان علامات کے ظہور پر مسلمان مرد عورتیں، مسلمان بچے اور جوان سب اللہ تعالےٰ سے ڈریں اور دین کی اطاعت کریں اور توبہ کریں۔

امیر غریبوں سے اچھا سلوک نہیں کرتے اور غریب امیروں کے خلاف غیبت کرتے رہتے ہیں۔ امراء اگر بدسلوکانہ روش کے ساتھ غیبت پسند بھی ہوں۔ تو گویا وہ بیک وقت دو گناہوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ غریب سے کام لے کر پس پشت اس کی اہانت کرنا معتوب خدا ہونے کی نشانی ہے۔ ایسے لوگ عذاب کو دعوت دیتے ہیں اور غریب اگر بجائے صبر و تحمل کے امیروں کی غیبت کرنا شروع کر دے۔ یعنی جب امیروں کے سامنے ہوں تو تعظیم سے سر تسلیم خم کریں اور جب ان سے اوجھل ہوں تو ان کی غیبت شروع کر دیں۔ یہ دونوں طریقے خلافِ اسلام ہیں۔

اس طرح امیر اپنے روحانی مقام حمیّت سے بیگانہ ہو کر صرف صاحب مال رہ جاتا ہے اور غریب ایسی حالت میں غریب ہو کر بھی خدا کو ناراض کرے گا۔ ایسا امیر عوام کی نگاہ میں اپنا مقام عزت و عظمت کھو بیٹھے گا۔ کیا تعجب کہ اسے کل ان ہی لوگوں کا محتاج ہونا نصیب ہو۔ جن سے کام لینے کے بعد وہ ان کی اہانت کرتا تھا۔

حق تو یہ ہے جسے اللہ عزت دے اسے سب سے زیادہ اپنے مالک و مولا سے ڈرنا چاہیے۔ چونکہ مالک و مختار نے اسے بہت کچھ دے کر اس کو اس کی اولاد اور اس کے خاندان کو معاشرہ میں معزز کر دیا ہے وہ نازو نعمت کے ساتھ اپنے بال بچوں میں زندگی بسر کرنے کا عادی ہو چکا ہے اور اتنی عزت و عظمت کے بعد اگر اسے عزت کی بلندی سے گرا دیا جائے تو یہ حالت نسبتاً غریبوں کی حالت غریبانہ سے کہیں زیادہ دردناک صورت بن جاتی ہے لہذا اس قسم کے لوگوں کو ان لوگوں کی تاریخ پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے جو بلندیوں سے گر کر اپنے چاکروں کے چاکر بن گئے اور انہیں نہایت ابتر حالت کا سامنا کرنا پڑا اور فطرت کی باز پرس نے ان کی بلند ہونے والی آنکھوں کو سر بازار عامتہ الناس کے سامنے نیچا کر دیا۔

اگر امراء ان عبرتناک حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی عزت کی حفاظت کریں اور ہمیشہ توبہ کریں اور اللہ کے حضور نماز، روزہ، حج و زکوۃ اور صلہ رحمی کی صورت میں شکرانہ بجا لائیں تو ان کی عزت محفوظ رہ سکتی ہے۔ ایسی حالت میں یقین ہونا چاہیے کہ ایسے امراء قوم کی عزت و برکت پشت ہا پشت تک سلامت رہ سکتی ہے اور اللہ تعالے ان کی ضرور تائید کرے گا اور عوام و خواص ان کو دعائیں دیتے ہیں۔ جن دعاؤں کی تاثیرات نسلاً بعد نسل صد ہا سال تک ان کا ساتھ دیتی ہیں۔

اگر غریب لوگ اپنی غربت پر صبر کریں اور غربت کو اللہ کی طرف سے دی ہوئی چیز سمجھیں اور ایمان رکھیں کہ رزاق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے زیادہ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے، تھوڑی روزی دیتا ہے اور یہ دونوں حالتیں امیر و غریب کے لیے

آزمائشی صورت میں اللہ کی طرف سے بھیجی جاتی ہیں تاکہ وہ اہل مال اور اہل عزت کی آزمائش کرے کہ کیا مال و دولت کے بعد یہ لوگ شکر گذار رہیں یا ناشکر گذار ہو گئے ہیں اور یہ کہ کیا غریب اور نادار لوگ خداداد ناداری سے مایوس ہو کر شکر گذاری سے بیزار ہو گئے ہیں اور میری راہ سے ہٹ گئے ہیں۔ ایسی حالت میں غریب لوگ اللہ تعالےٰ کی مرضی پر راضی رہ کر اپنی حلال کمائی پر اگرچہ وہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو، صبر کریں اور نماز روزہ کے پابند رہیں اور بار بار اللہ تعالےٰ کا شکرانہ ادا کرتے رہیں۔ جھوٹ، غیبت، چغلی، چوری، رہزنی، مردم آزاری سے بچتے رہیں تو یقیناً اللہ تعالےٰ ان کو غنی کرے گا اور وہ ایمان کے ساتھ عزت دنیا بھی پائیں گے۔ دنیا میں کوئی ایسا امیر نہیں ہے جو نسلاً بعد نسل امیر چلا آیا ہو۔ چند پشتوں تک بمشکل اگر آسائش ساتھ دیدے تو یہ غنیمت ہوتی ہے۔ مگر یہ امارت ناشکری کی بنا پر پھر ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ ایسے امیر پھر زوال کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس قسم کی اقبال مندیوں کے زوال پذیر ہونے پر لوگوں کو کوئی غم و اندوہ نہیں ہوتا بلکہ لوگ خوشی محسوس کرتے ہیں۔

البتہ ایسے لوگوں کا زوال لوگوں کے لیے سامانِ عبرت ضرور ہوتا ہے جو لوگ اقبال مندیوں کے ساتھ نماز، روزہ، حج و زکوۃ اور صلہ رحمی کرتے ہوئے مر جائیں یا کسی طرح ختم ہو جائیں تو ایسی حالت میں بھی لوگ ان کو یاد کرتے اور دعائیں دیتے ہیں۔ ان کی تاریخ لوگوں کے دلوں میں محفوظ و مامون رہتی ہے اور ایسے خاندان کا کوئی بچا کچھا آدمی پھر اللہ کے فضل و کرم اور لوگوں کی دعاؤں سے سر اٹھا لیتا ہے اور ایسے خاندانوں کو دوبارہ سامنے آنے اور عزت سے زندگی حاصل کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

# باب دہم

## فضیلت علماءِ اُمت

### عُلماءِ اُمّتی کَانبیاءِ بَنِی اِسرَائیل

دنیا میں سب سے لمبی تاریخ اور نہ ختم ہونے والی سیرت انبیاء و اولیاء کی ہے۔ وہ نسلی طور پر آگے چل سکیں یا رک جائیں، دونوں حالات میں ان کی تاریخ درخشندہ رہتی ہے۔ اس کی وجہ ان کی غیر مضر صالحانہ زندگی۔ اور اس میں اللہ تعالےٰ کی بندگی اور انسانیت سے حسنِ سلوک کی رواداری ہوتی ہے۔ جو ابدالآباد تک باقی رہنے والی ہے۔ لوگ ان کے آثار سے بھی محبت کرتے ہیں اور ان کی قبور کی مٹیوں سے اپنے جان و مال اور اولاد سے بھی کہیں زیادہ اظہار عقیدت و محبت کرتے ہیں۔ انسانی روح کی یہ قدیم عادت ہے کہ وہ ان انسانی شخصیات کے کریمانہ خصائل کو یاد رکھتی ہے، جنہوں نے راہِ راست پر چل کر فطری حقوق کی بنظرِ شفیقانہ حفاظت فرمائی ہو اور ان کی بجا آوری کے فرائض انجام دیئے ہوں۔ اس طرح گویا روحِ انسانی اپنے حافظۂ لطیف سے صفات پاک کی امین ہوئی۔ روحِ انسانیت نے ہمیشہ کریم الصفات لوگوں کے ذریعہ خدائے کریم کا سراغ لگایا۔ روح قفسِ عنصری میں ان ہی پاک باز لوگوں کے ذریعہ بالیدگی حاصل کرتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے جسم و جان کی محبتِ ذاتی کے معیار پر لوگوں کے

جسم و جان کی محبت کا اندازہ کرتے ہیں اور یہی معیارِ احساس ان کو شفیق بناتا ہے۔ دنیا کی ہر متاع، چاہے روحانی ہو یا مادی۔ کوئی صفات و خصائل کسی طرح بھی حاصل ہوں۔ جو انسان کو عطا کیے گئے ہوں اور انسانی صفات لاتعداد ہیں۔ جو گنی نہیں جا سکتیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سب صفات خدا کی عطا ہیں۔ صفات بری بھی ہوتی ہیں اور نیک بھی۔ بری صفات کا حامل صفاتِ شنیعہ کا موصوف ہوتا ہے۔ گمان کرنے اور اس کو دیکھنے سے ہی شریف انسان کی روح ناراضگی محسوس کرتی ہے اور نفرت کے ساتھ ان کی مذمت کرتی ہے۔

فی الحقیقت طبع انسانی پر صفات شنیعہ کے موصوف ایک قسم کا بارِ گراں بن جاتے ہیں اور روحِ انسانی اس کو بد اخلاق گردان کر نہایت حقارت کے ساتھ اسے ٹھکرا دیتی ہے۔ ہر صفاتِ بد کا موصوف ہر حالت میں طبعِ انسانی پر ناگوار، مکروہ اور خلل انداز بوجھ بن جاتا ہے۔ حتیٰ کہ صفات بد کا موصوف جب خود بخود اپنی شرافت کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ اپنی روح میں اپنے لیے ندامت محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کے ہم خیال یعنی یار و مددگار دوست بھی ایک دوسرے کے لیے اپنی صفات بد کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی تاریخِ بد کا جائزہ لینے کے بعد ایک دوسرے کے لیے طبعاً خفت آفریں، قلق و اضطراب بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی زندگی جہاں دوسروں کے لیے باعث رنج و ملال ہوتی ہے وہاں اپنے لیے اور اپنے حلقۂ اثر کے لیے بھی سخت ترین ہلاکتوں و خجالتوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے، جو انہیں جرائم اور معصیت پر مجبور کرتی رہتی ہے مگر روحانی طور پر اس قسم کے لوگ آسودہ حال ہوں یا غیر آسودہ حال، سخت

غیر مطمئن ہوتے ہیں۔

ان لوگوں کا علاج شرفائے صالحین کے ذمہ ہے۔ یہ عادت بد کے حاملین لوگ جسم انسانی کا ایک بیمار اور متعفّن حصہ ہوتے ہیں۔ وجود کا صحت مند حصہ ہمیشہ اپنے بیمار جسم کی پورے احساس اور ذمہ داری کے ساتھ اصلاح کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ بد قسمتی سے اگر جسم کا بیمار حصہ اصلاح پذیر نہ ہوسکے تو یہ اندازہ کرنا ضروری ہوجاتا ہے کہ یہ بیمار عضو جسم کے کس حصہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر بیمار حصہ کسی ایسی نازک جگہ واقع ہو۔ جہاں تک علاج کی رسائی نہ ہوسکے تو ماہرین اپریشن کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اگر اپریشن کا تجربہ بھی ناکام ہوجائے تو ایسی صورت میں جسم کا مریض حصہ عضوِ معطل ہو کر تادمِ زیست جسم و جان کے لیے وبالِ جان بن جاتا ہے۔ یا بصورتِ دیگر جسم و جان کے لیے مہلک صورت اختیار کرلیتا ہے۔

فطری طور پر انسانی جسم اخلاقی ایجادات کا منبع ہے۔ فطرت نے اس کو اخلاقِ حسنہ کے لیے ہی پیدا فرمایا تھا۔ انسان انفرادی حیثیت میں انسانی قوم کا ایک جز ہوتا ہے اور اجتماعی حیثیت سے مربوط ہو کر جسم قوم میں وحدانی کیفیت اختیار کرلیتا ہے۔ مگر باوجود اس صورت ظاہر یہ کے وہ فرد ہو کر قوم سے ربط کرتا ہے۔ جیسے قطرات کے اجتماع سے سمندر بنتا ہے مگر قطرات منتشر ہو کر سمندر نہیں بن سکتے بلکہ انفرادی طور پر قطرات ہی رہ جاتے ہیں۔

اسی طرح نسل انسانی من حیث الفرد و اجتماع اولادِ آدم ہے اور یہ سب مل کر انسانی قوم کہلاتے ہیں۔ ان کے روابط قلب و نظر سے وابستہ

ہیں۔ جسم محض مٹی ہے۔ اس میں جتنی خواہشات انگڑائی لیتی ہیں۔ وہ سب احساسِ روح سے پیدا ہو کر جسم و جان میں پھیل جاتی ہیں۔ اگر انسانی قلب و نظر عادت بد قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو یقیناً اثرات بدا قلیم وجود میں پھیل کر جسم و جان کو برائی سے متاثر کر دیتے ہیں۔

جب ایک کافر کا وجود کذب کی برائی کی گرفت میں آجاتا ہے تو وہ روحانی مریض ہو جاتا ہے۔ ایسے ایک جسم کے مریض ہونے کی حالت ایسے خلیے کی طرح ہوتی ہے جو خون میں بیمار ہو کر دوسرے خلیوں کو بھی بیمار کر دیتا ہے۔ اس طرح بہت سے خلیے بیمار ہو کر آہستہ آہستہ صحت مند خلیوں پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ آخر کار جسم کے لیے وہ باعث ہلاکت بن جاتے ہیں۔

کونسا ایسا جسم ہے جو اپنے ذاتی خلیوں یا ذاتی اعضا یا ذاتی جسم کی بیماری پسند کرتا ہو مگر باوجود اس ناپسندیدگی کے بھی لوگ اپنے افعالِ جسمانی خراب کر لیتے ہیں اور انجام کار انہیں پریشانی کا سامنا ہوتا ہے۔ جو جسم احتیاط کریں اور صلح العمل ہو جائیں اور طبیب سے مشورہ لیں اور اس پر عمل کریں۔ ان کے جسم کی بیماریاں کم ہو جاتی ہیں اور صحت بحال رہتی ہے۔ جو آسائش جسم و جان کے علاوہ ملک و ملت کے لیے بھی ایک صحت مند قسم کا معاون بن جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جسمانی اخلاق روح پر مرتب ہوتے ہیں۔ روح کے صحت مند ہونے سے اخلاق بھی صحت مند ہو جاتے ہیں۔

ایسے لوگ جو تزکیہ نفس کے ساتھ روح کو بالیدگی دیتے ہیں۔ وہ متقی اور صلح ہوتے ہیں۔ ایک متقی صلح سے کئی صلح لوگوں کا ایک گروہ بن

جاتا ہے اور ایک بااخلاق صالحین کا گروہ ایک معاشرے کو صحت مند بنا دینے کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔

اسی طرح قومیں صحیح نہج پر آکر اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ جو مظاہرہ نوعِ انسانی کو اپنے حسنِ کردار سے متاثر کرلیتا ہے اور انسانیت راہِ اخلاق پر آجاتی ہے۔

لہذا بداخلاق لوگوں کے علاج کی ذمہ داری صاحب اخلاق صالحین ملک وملت پر عائد ہوتی ہے۔ اگر صالحین ملک و قوم سے لاپرواہی کریں تو ان کی اپنی فردی صلاحیت تو باقی رہتی ہے مگر جود و کرم سے محروم ہو کر اپنی فردیت تک محدود ہو جاتی ہے۔

اسلامی تعلیمات میں ایسی صالحیت جو صرف اپنی ذات کے لیے ہو، بخل کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذاتی نیکی کے نفاذ کے لیے اپنے نیک بندوں یعنی انبیاء کے ذریعہ پوری انسانیت کو نیکی کی دعوت دی ہے اور نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ آخری نیکیوں کا مجموعی پیغام ساری انسانیت کو دیا اور قیامت تک متقی صالحین کا سلسلہ جاری رکھنے کا وعدہ فرمایا تاکہ نیکیوں کے تبادلے کے لیے صالحانہ تبلیغ کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے۔ صرف ایک صفت نیک کا موصوف ایک نیکی کا حامل ہوتا ہے اس کی تربیت نیک اعمال پر ہوتی ہے اگرچہ وہ جہاں سے نیکی کو پائے گا اس کو اخذ کرلے گا اور جہاں بدی کو دیکھے گا اس کی اصلاح کرے گا۔ نیک آدمی کی عادت ہے کہ وہ دوسروں کو نیک بناتا ہے۔ اجتناب عن المعاصی کا حکم دیتا ہے۔ معصیت سے خود بھی بچتا ہے اور دوسروں کو بھی بچاتا ہے۔ مگر اس طرح کہ اپنی ذات کو

برائیوں سے بچائے اور جہاں اور جس جگہ اصلاح طلب معاصی انسانی کردار کی صورت اختیار کر لیں وہاں خود کو معاصی سے اس طرح بچاتے ہوئے اصلاحِ معاشرہ کرے، جس طرح طبیب اپنے آپ کو مرض سے بچانے کی تدبیر بھی کرتا ہے اور مریض کا علاج بھی کرتا ہے تاکہ مرض کا قلع قمع ہو جائے۔ کوئی شفیق طبیب مرض سے ڈر کر بھاگتا نہیں بلکہ اس کا علاج کرتا ہے۔ اگر اطباء خوفِ مرض سے مریضوں کو چھوڑ کر بھاگ جائیں اور ترکِ علاج کر دیں تو یقیناً امراض بڑھتے بڑھتے پورے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے سکتے ہیں۔

اس طرح بھاگنے والے طبیب کو بھی وہ بیمار ہوائیں اور بیمار فضائیں ان کی خلوت گاہوں اور پناہ گاہوں میں جا کر پکڑ لیں گی۔ اس طرح فطرت بھاگنے والوں کا محاسبہ کرتی ہے۔ بالکل ایسے ہی صالح لوگ اگر گناہ گاروں کی اصلاح سے خوفِ گناہ کیوجہ سے باندازِ راہبانہ شہر چھوڑ کر جنگل کو بھاگ جائیں گے تو گناہ گار لوگ معاشرے کو بلا روک ٹوک زیادہ مجرم بنا دیں گے۔ پھر اسی معاشرے سے چور ڈاکو پیدا ہو کر اسی جنگل کو اپنی پناہ گاہ بنا لیں گے جس میں کوئی ایک قسم کا صالح خوفِ گناہ سے ڈر کر چھپ گیا وہ چور ڈاکو جنگل میں پہنچ کر اس کی متقیانہ زندگی میں خلل انداز ہو سکتے ہیں۔ قوم و معاشرے کے جرائم کی لپیٹ سے بھاگنے والے راہب و کاہن اور سادھو قسم کے لوگ گناہوں سے بچ نہیں سکتے۔ ہیضہ کی وبا اور چھوت کی دوسری بیماریاں دشت و جبل، شہر و بیابان میں لوگوں کو گھیر لیتی ہیں۔ اسی طرح انسانی جرائم ایک بیابانی جھونپڑے سے لے کر ایوانِ شاہی تک اور ایک معمولی شریف زادے سے لے کر ایک بڑے ولی اللہ

تک اپنے اثرات پھیلا دیتے ہیں۔ اس واسطے متقی صالحین پر لازم ہے کہ وہ صالحیت کی تنفیذ کریں اور اس کے نفاذ میں تسلسل اور تغافل اور تکاسل سے کام نہ لیں۔ اسلام میں نیکی کو پھیلانے کا یہی دستور العمل ہے جو جمیل ترین تبلیغ اسلام کی جمیل صورت ہے جو غیر مسلم کو بھی اسلام کی سچائیوں سے متاثر کر دیتی ہے اگر اس طرز تبلیغ سے ہٹ کر محض رطب اللسانی کو ہی رواج دیا جائے اور اسلام کی صداقتوں کو جمیل تبلیغ کے ساتھ لوگوں تک نہ پہنچایا جائے تو یہ محض رطب اللسانی یا محض شعلہ بیانی بن کر رہ جائے گی تو طبع انسانی کے نفسانی مفسدات کا رد عمل ہونے کی بجائے نفس امارہ الٹا صالحیت کے خلاف اپنا رد عمل شروع کر دیتا ہے۔

جب بھی متقی صالحین لوگ اپنی قولی و عملی تبلیغ روک دیتے ہیں تو ایسے حالات میں خشک دعوؤں کے ساتھ غیر صالح لوگ تبلیغ دین کا لبادہ اوڑھ کر میدانِ تبلیغ میں آ جاتے ہیں اور سرِ بازار قرآن وحدیث بیان کرتے ہیں جو سراسر تلبیس ہوتی ہے۔

تلبیس پسند مبلغین جب خود اپنے کہے ہوئے بیانات اسلامی کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو عوام الناس کے دل سے اعمالِ اسلامی کا احترام آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو جاتا ہے اور ایک مدت کے بعد عوام محض رسمی مسلمان ہونے پر ہی اکتفا کر لینا پسند کر لیتے ہیں۔

ایسے مبلغین کی تبلیغ دین سے ایک استفادہ ضرور ہوتا ہے کہ اسلام کی آواز بلند ہوتی رہتی ہے اور کسی نہ کسی طرح لوگ اسلام کے بنیادی مسائل سنتے رہتے ہیں اور علمائے امت کے نیک مسائل ان کے ذہن نشین ہوتے رہتے ہیں اور معاشرہ اسلام کی حدود کے اندر ہی رہتا ہے۔ کم

از کم اپنے آپ کو اسلامی معاشرہ سمجھتا رہتا ہے۔ اگرچہ معاشرہ بکمال اسلامی احکامات کی اطاعت نہیں کرسکتا مگر پھر بھی کسی نہ کسی طرح اسلام کو اپنے دل میں جگہ دیتا رہتا ہے اور اس سے مانوس رہتا ہے۔

علمائے امت میں بعض علماء تقویٰ کی بناء پر ولی اللہ ہو جاتے ہیں اور اپنے تقویٰ کی بناء پر وہ صاحب حال بھی ہوتے ہیں۔ جنکی تاثیرات تمام قسم کے علماء کو نورِ عرفان سے مستفیض کرتی رہتی ہیں۔ اس طرح گروہ علماء کا سلسلہ بار بار راہِ حق پر ابھر کر سامنے آتا رہتا ہے۔ پچیس (۲۵) فی صد علما حق کامل ولی ہوتے ہیں تبلیغ دین کے ساتھ جن کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اور ۷۵ فی صد علماء مائل بہ ولایت ہوتے ہیں جو علماء ولایت پر فائز ہو جاتے ہیں وہ صاحب دل، صاحب نظر اور صاحب بسط و کشاد ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب کرامات بھی ہو جاتے ہیں۔ پھر ان ہی میں سے ابدال اور چھوٹے بڑے قطب بنائے جاتے ہیں اور سب سے بڑے عالم دین کو قطب الاقطاب کے مقام پر فائز المرام کیا جاتا ہے پھر قطب الاقطاب سے بڑے عالم دین اور عالم روحانیت کو غوث وقت کا درجہ عطا ہوتا ہے۔ اللہ تعالٰی کی ذات ایسے مکرمین علماء حق کی بڑی تکریم فرماتے ہیں اور اپنی ذاتی نصرت کے ساتھ ہمیشہ ان کو سرفراز کرتا ہے اور ایسے علماء کی اہانت کرنے والا اللہ کو ناراض کرلیتا ہے۔ علماء و صوفیاء دونوں یکے بعد دیگرے اولیاء اللہ ہیں۔ ان سے جنگ کرنے والے خدا سے جنگ مول لے لیتے ہیں اور معتوب بارگاہ الٰہی ہو جاتے ہیں۔ اس گستاخی کی بنا پر ان سے برکتیں چھین لی جاتی ہیں۔ علمائے امت کے سامنے کسی غیر عالم دین کو اونچی آواز سے بات نہیں کرنی چاہیے۔ ان کے سامنے آہستہ چلنا چاہیے۔ ان

کی محفل میں دنیوی لہو و لعب کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ ان کے سامنے کسی قسم کی بے ادبی نہیں کرنی چاہیے۔ وہ جو کچھ فرما رہے ہوں اسے نہایت ادب کے ساتھ پوری توجہ اور غور سے سننا چاہیے۔ اگر کسی بات پر شک و شبہ گذر جائے یا ان کی نیک باتوں کے سمجھنے میں کسی مقام پر دقت پیش آ رہی ہو تو ان کے دورانِ کلام سوال نہیں کرنا چاہیے۔ اس واسطے کہ اس طرح ان کا موضوعِ کلام ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ سبیل تذکرہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ جس سے ان کے دل کو رنج و ملال ہوتا ہے دوسرے ان کے موضوع سے ہٹ جانے کی بنا پر ہونے والے مسائل کے سلسلہ وار بیان سے لوگ محروم ہو جاتے ہیں اور شیاطین کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی غیر عالم دین کے نفس کو جنبش دے اور اسے عالم دین کی وعظ و نصیحت پر برانگیختہ کرے اور پوری مجلس کو عالم دین کی نصیحت سے محروم کر دے۔

اکثر اولیاء اللہ نے فرمایا کہ جب علماء وعظ فرما رہے ہوں۔ یا اتقیا مصروفِ تکلم ہوں تو آہستہ سلام دے کر بغیر کسی کھڑکھڑاہٹ کے خاموش ایک جانب بیٹھ جانا چاہیے۔ سننے والوں کو اپنی جگہ سے اٹھانا نامناسب ہے اور جو لوگ مسائل سن رہے ہوں۔ انہیں بھی کسی نو آمد کی وجہ سے خلل انداز نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں اگر علماء کی مجلس میں کوئی دوسرا عالم دین یا بزرگ دین آ جائے اور علماء خود اس کے ادب کے لیے اٹھ رہے ہوں تو سب کو ان کی تقلید میں کھڑے ہونا لازم ہے۔ اگر کسی ضروری امر کے تحت مجلس سے اٹھنا ضروری ہو تو نہایت خاموشی سے اٹھ کر چلے جانا چاہیے۔ مگر بولنا نہیں چاہیے۔ یہی طریقِ ادب متقی صوفیائے امت کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ اس واسطے کہ متقی علمائے امت خاص لوگ ہوتے ہیں

اور متقی صوفیائے امت خاص الخواص ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ دینی علوم پر عمل صالح پاتے ہیں۔ اور تزکیۂ نفس کے ذریعہ متقی ہو جاتے ہیں اور بربنائے تقویٰ صاحب عرفان باللہ ہو جاتے ہیں۔

عام لوگوں کی دو آنکھیں ہوتی ہیں۔ جو خدا نے پیدائشی طور پر ان کے چہروں پر پیدا کر دی ہیں۔ اور علماء دین کی چار آنکھیں ہوتی ہیں۔ دو جسمانی، دو علمی۔ وہ جہاں ظاہری چیزوں کو ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہاں علمی طور پر ان کی معنویت کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ صوفیاء کی چھ آنکھیں ہوتی ہیں۔ جہاں وہ جسمانی و علمی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ وہاں صورتوں کے آگے بنظر عرفان معانی و بطون کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔

عندالاسلام اولیاء و علماء دونوں ولی اللہ ہیں۔ دونوں کے سامنے جب حاضری نصیب ہو تو دل سے پاک و صاف ہو کر حاضری دینی چاہیے۔ بعض دفعہ دل کی برائیاں ان لوگوں پر واضح ہو جاتی ہیں اور وہ سخت پریشان ہو جاتے ہیں۔ وہ بعض دفعہ انسانوں کو حیوان کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ اور انہیں سخت ملال ہوتا ہے کہ انسان ہو کر اس درجہ ذلیل بنا کہ حیوان سے بھی کمتر ہو گیا۔

چونکہ یہ لوگ متقیانہ احوال کے ساتھ صاحبِ مکاشفہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے حضرت اویس قرنیؓ کا ایک واقعہ بطور ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ حضرت اویس قرنیؓ کا ذکر ہے کہ وہ علماء باطن میں سے ایک ولی اللہ تھے۔ آپ صاحبِ دین و عرفان تھے۔ آپ بوجہ تعمیلِ شریعت ماں کی خدمت میں اتنے مصروف رہے کہ بوجہ دوریٔ منزل حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بھی بظاہر زیارت نہ کر سکے مگر باوجود اس کے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑا

مرتبہ بخشا اور حضور علیہ الصلوۃ والسّلام نے اپنے صحابہ کرام کو وصیّت فرمادی تھی کہ بعد از وصال میرا جبہ حضرت اویس قرنیؓ کو پہنچا دینا۔ چونکہ وہ اس جبہ کے بہ نسبت دوسروں کے زیادہ مستحق ہیں۔

اللہ تعالےٰ تو علیم بذات الصدور ہے۔ مگر حضور علیہ الصلوۃ والسّلام بھی آئینۂ نبوت کے ذریعہ ان کے احوال سے خبر رکھتے تھے۔ تب ہی وصیّت فرمائی کہ میرا جبہ ان تک پہنچانا۔ خاص کر خلیفۃ المومنین حضرت علی شیرِ خداؓ اور خلیفۃ المومنین حضرت عمرِ فاروقؓ کو یہاں تک وصیّت فرمائی کہ جب تم ان سے ملو گے تو ان کے پہچاننے کے لیے چند علامات ہیں جو یاد رکھنا۔

ان کی شکل و صورت اور ان کی سیرت تک بھی بتا دی۔ فرمایا۔ ان کی بستی کے لوگ ان کو حقیر جانتے ہیں۔ صورتاً بھی بظاہر وہ خوبصورت نہیں ہیں، فرمایا۔ ان کی آنکھیں بہت چھوٹی ہیں۔ پھر حضورؐ علیہ الصلوۃ والسّلام نے فرمایا کہ وہ اونٹ کے بالوں کا بنا ہوا ایک لمبا جبّہ پہنتے ہیں پھر فرمایا۔ اویس قرنی کے ایک کندھے پر برص کا سفید داغ بھی موجود ہے۔ فرمایا وہ بکریاں چرایا کرتے ہیں اور زیادہ وقت اللہ تعالےٰ کی عبادت اور ماں کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔

علیؓ و عمرؓ حسب فرمان محبوب کبریا علیہ الصلوۃ والسلام بعد از وصالِ پاک جبہ مبارک لے کر ان تک پہنچے تو ان کو من و عن ویسا ہی پایا۔ جیسا کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ان کے متعلق نشاندہی فرمائی تھی۔ جب یہ دونوں حضرات حضرت اویس قرنیؓ سے ملاقی ہوئے تو حضرت اویس قرنیؓ نے ان کو اپنی ظاہری آنکھوں سے پہلی مرتبہ دیکھا تھا مگر اپنی باطنی آنکھوں سے بھی

دیکھا اور کمال ادب سے ان حضرات کا خیر مقدم کیا۔

جب یہ تینوں حضرات باہم جلیس ہوئے اور گفتگو کا آغاز ہوا تو حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی جانب سے آپ کو سلام پیش کیا۔ پھر مفوضہ جبہ مبارک پیش کیا۔ آپ نے بہزار محبت و ادب اس جبۂ پاک کو وصول کیا۔ اس کو چوما سر اور آنکھوں سے لگایا اور پہن لیا۔

اس کے بعد تینوں میں کلام عارفانہ کا آغاز اللہ کے نام سے ہوا۔ زبانی تعارف ہوا۔ اور اَلمُؤمِنُ مِرْآۃُ المُؤمِن کا عملی ترجمہ ہونا شروع ہوا۔ آپ نے استفساراً استفہاماً عشقِ الٰہی اور عشقِ مصطفٰے کی صداقت کے اظہار کے لیے پوچھا۔ کہ کیا آپ اصحاب رسول کریم ہیں؟۔ دونوں حضرات نے جواباً فرمایا۔ بفضل اللہ ہم اصحاب رسول کریم ہیں۔ ہم نے زندگی کا بیشتر حصہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے ساتھ سفر و حضر میں اور مختلف حالات و غزوات وغیرہ میں گذارا۔

حضرات خلفائے عظام سے غایت اظہارِ محبت مصطفٰے ﷺ کے لیے دوبارہ پوچھا کہ آپ کے دہانِ مبارک میں آپ کے کتنے دانت موجود ہیں؟ دونوں حضرات نے اثبات فرمایا۔ ہاں ہمارے دانت ہمارے منہ میں سلامتی کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کے جواب میں حضرت اویس قرنیؓ نے فرمایا۔ کہ حضور سرورِ عالم ﷺ کے دندانِ مبارک و مقدس جب میدانِ احد میں شہید ہوئے تھے۔ تو تقاضۂ محبت رسول کریم کے مطابق میں نے تو اپنے سارے ہی دانت شہید کر دیئے تھے اور محبوب خدا کے دندانِ مبارک پر قربان کر دیئے تھے۔ میں غائبانہ حضور ﷺ سے اس قدر

پیار و محبت میں متبلا ہوں کہ مناسب نہ جانا کہ محبوب کے صدمہ کے بعد محب کے منہ میں دانت موجود ہوں۔ اس پر دونوں حضرات خلفائے ان کی غائیت محبت کی تصدیق فرما کر گویا ان کو سند عشق مصطفےٰ ﷺ عطا فرمادی۔

آخر میں ان دونوں حضرات نے دعائے مغفرت کے لیے سوال کیا اور فرمایا آپ ہماری مغفرت کے لیے دعا فرماویں۔ حضرت علی شیر خداؓ نے دعائے مغفرت کے ساتھ ساتھ یہ بھی دعا چاہی کہ جنگ جمل اور جنگِ صفین میں اللہ تعالیٰ میری مدد کرے۔ کیونکہ نبیٔ پاک ﷺ نے بوقت وصیّت یہ فرمایا تھا کہ اے علیؓ تم جنگ جمل اور صفین کے لیے دعا کرنا۔ چنانچہ آپ نے دعائیہ کلمات کے ساتھ فرمایا کہ جنگ صفین میں مجھے آپ کی اطاعت میں شریک جہاد ہونا ہو گا اور میں میدانِ صفین میں ہی درجہ شہادت پاؤں گا اور میرا مدفن بھی وہیں ہو گا۔ چنانچہ تاریخ ثابت کرتی ہے۔ کہ جنگ صفین میں آپ کی پیشین گوئی من و عن صحیح ثابت ہوئی اور آپ حضرت علی شیرِ خداؓ کی اطاعت میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ خلفاء رسول مقبول ﷺ کی استدعا کے بعد حضرت اویس قرنیؓ دعا کے لیے رب کریم کے حضور میں سجدہ ریز ہوئے۔ کچھ دیر کے بعد ان حضرات نے آواز دی۔ کہ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ آپ نے سر مبارک سجدے سے اٹھایا اور یوں گویا ہوئے۔ "اے حضرات خلفائے پاک حالت سجدہ میں میں نے نصف امت نبی پاک ﷺ کی بخشش کی دعا مانگی جو قبول ہوئی اگر آپ حضرات تعجیل نہ فرماتے تو اس وقت تک سجدہ سے سر نہ اٹھاتا جب تک ساری امت پاک کو نہ بخشوا لیتا۔ اولیاء اللہ کے مختلف تذکروں میں اویس قرنیؓ کا ایک واقعہ اَلمؤمن مرآۃ المومن کے ثبوت میں بیان کیا گیا ہے" ۔ کہ حضرت

اویس قرنیؓ یادِ الٰہی میں مختلف مقامات تک پہنچے۔ ایک مرتبہ آپ کی تلاش میں ایک شخص جس نے آپ کے مقبول بارگاہ الٰہی ہونے کا چرچا سنا تھا۔ آپ کی زیارت کے لیے اپنے گھر سے نکل پڑا۔ بڑی مشکل سے آپ کو ماوراء النہر علاقوں میں ایک جگہ پالیا یہ وہ شخص تھا جس کی حضرت اویس قرنیؓ سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی اور نہ ہی حضرت اویسؓ نے اس کو دیکھا تھا اس شخص نے لوگوں سے پوچھ پوچھ کر ان کی راہ تلاش کی تھی۔ آخر کسی نے بتایا کہ حضرت اویسؓ فلاں نہر پر موجود ہیں۔ تو وہ اس طرف بڑھا اور قریب سے جا کر دیکھا کہ ایک نہایت دبلا پتلا کمزور انسان نہر کی جانب اپنا منہ کیے ہوئے اپنی زلفِ مبارک میں کنگھی کر رہا ہے۔ اس متلاشی نے قریب ہو کر آپ کی جانبِ پشت کھڑے ہو کر اس طرح سلام دیا۔ اسلام علیکم یا ولی اللہ آپ نے بغیر پیچھے مڑے سلام کا جواب اس طرح مرحمت فرمایا۔ وعلیکم السلام یا عبداللہ۔ سلام دینے والے نے عرض کی حضرت آپ کو میرا نام کس طرح معلوم ہوا؟۔ فرمایا تم نے حدیث نبی پاک ﷺ سے یہ نہیں پڑھا کہ المؤمن مِرْآةُ المومن یہ کہ مؤمن مومن کا آئینہ دار ہوتا ہے اگر حدیث پر تیرا ایمان مضبوط ہے۔ تو پھر کسی مومن کو اس آئینہ داری پر کیا شک ہو سکتا ہے۔

یہ سن کر حضرت عبداللہ نے آپ سے عرض کی مجھے کچھ نصیحت فرمائی جائے۔ فرمایا۔ جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو۔ اور جب سونے لگو تو موت کو اپنے سرہانے رکھ کر سو جایا کرو۔ خدا کو پالو گے۔

حضرت عبداللہ واپس ہوئے۔ اور سوچنے لگے۔ موت کو کس طرح

سرہانے ڈالا جاسکتا ہے۔ چنانچہ جب رات آ گئی۔ تو آپ نے نمازِ عشا ادا کی۔ دعا و مناجات کے بعد بستر پر سونے کا ارادہ کیا۔ تو حضرت اویس قرنیؒ کی نصیحت یاد آئی۔ تو خیالاً اور ضمیراً اپنی موت کو اپنے سرہانے کے نیچے رکھنے کا تصور باندھا۔ جب اس خیال میں مستغرق ہوئے۔ تو سارا وجود مارے خوف کے تھر تھرا اٹھا۔ بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور سوچنے لگے کہ موت کو سرہانے رکھ کر بھی کوئی سو سکتا ہے۔ ساری رات اللہ تعالیٰ کی یاد میں گذار دی۔ اس کے بعد جب بھی سونے کا ارادہ فرماتے۔ اسی تصور سے وہ اپنی محبوب نیند کو ترک کر کے پھر اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عبداللہ نے صرف اتنی نصیحت پر ساری زندگی کروٹوں پر جاگ کر دن رات اللہ تعالیٰ کی عبادت کی اور ولی کامل ہوئے

# ترانۂ عقیدت

مزاج میرا ہے عارفانہ، میری نگاہیں ہیں طائرانہ
مگر بحق حضور اقدس مجھے عقیدت ہے والہانہ
نظر نظر جس کی تازیانہ، ادا ادا ہے قلندرانہ
قدم باندازِ خسروانہ، جلو میں شان سکندرانہ
ہزار خواب گراں تصدق تمہاری محفل کے رت جگوں پر
نگاہ و دل سے چھلک رہی ہے گئی سحر تک مئے شبانہ
کبھی کبھی تو حضور کا ہم رکاب بھی میں رہا ہوں لیکن
حضور قبلہ کی منزلوں سے میرا تعارف مقربانہ
یہ در ابھی جگمگا رہا ہے، جو آ رہا ہے وہ پا رہا ہے
یہ پیر دیول فقیر دیول ہے معرفت کا بھرا خزانہ
زباں زباں جنکی گفتگو ہے، دلوں دلوں جنکی آرزو ہے
یہی ہیں وہ لوگ مردِ کامل کہ جن کی ٹھوکر میں ہے زمانہ
تو فکر منزل سے کانپتا ہے، اندھیری راہوں سے خوف کیا ہے
ابھی ہے پیر مغاں سلامت، کھلا ہوا ہے شراب خانہ
تلاش میری میرا تجسس سخن کے سانچے میں ڈھل رہا ہو
معین کیا ہے کلام میرا، میری عقیدت کا ہے ترانہ

پیر روح الحسنین معین
خلف الرشید
شیخ المشائخ حضرت پیر صاحب دیول شریف

# گیارہواں باب

## مومن کے درجات

مومن عام ہو یا خاص، اس میں ایمان کی جھلک موجود ہوتی ہے۔ گناہ گار سے گناہ گار مومن بھی اس ساری مخلوقات سے بہتر ہے جو اسلامی ایمان سے محروم ہے۔ ان سب عام و خاص مسلمانوں پر دوسرے مسلمانوں کے درجات کی آئینہ داری ہوتی رہتی ہے۔ ہر مومن چھوٹے ایمان والا یا بڑے ایمان والا ہو۔ اسے چاہیے کہ اہل ایمان کی جب بھی مجلس کرے۔ تو پاکیزگی قلب و نظر کے ساتھ کرے اور یہ کہ اہل ایمان کی مجلس باوضو ہو، ورنہ ہر دل وسوسۂ شیطانی میں ملوث ہو جائے گا اور مجلس فضول ہو کر بے ہودگی کا شکار ہو جائے گی۔ اس قسم کی فردی یا اجتماعی بے ہودگیاں ہمیشہ ناپاک قلب و نظر رکھنے اور بے وضو رہنے کی بنا پر ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

حدیث کی رو سے عام مسلمانوں کے قلوب بھی بحالتِ ایمان ایک دوسرے کے روحانی ترجمان ہو کر ایک دوسرے کی آئینہ داری کر سکتے ہیں تو پھر علمائے صالحین اور اولیائے صالحین کی بصیرتِ عالمانہ اور بصیرتِ عارفانہ کا مرتبہ کتنا بلند ہو گا۔

اولیائے کرام نے فرمایا ہے۔ کہ ماں باپ علمائے صالحین اور اولیائے صالحین کی زیارت کے لیے باوضو ہونا ضروری ہے اور ان کے سامنے باادب ہو کر حاضری دینی چاہیے اور ان کی مجلس میں اپنے قلوب کو ہر

قسم کے غیر دینی شبہات سے پاک کر کے نہایت عجز و نیاز کے ساتھ بغرض ہدایت بیٹھنا چاہیے اور ان کی بڑائی اور بزرگی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ان کے مقابلہ میں اپنی کم مائیگی علم و عمل کا احساس بھی کرنا چاہیے۔

شریعت کی اطاعت میں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ ان حالات کی پابندی کرنے والے کا مقدر اگر برا بھی ہو گا۔ تو اس کی نیکیوں سے خدا کی رضا اس کے شاملِ حال ہو کر شاید اس کی تقدیر اچھائی کی طرف بدل دے اور وہ فلاحِ دارین پا سکے۔ ایسا کرنے والا دین و دنیا میں بامراد ہو گا۔

ماں باپ کی اور متقی علماء و اصفیاء کی دعائیں بڑی پرتاثیر ہوتی ہیں اور اہل درد کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ یہ حدیث شریف ثبوت ہے۔

"لَا یَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا بِدُعَاءٍ"

یعنی تقدیر نہیں بدل سکتی مگر دعا سے بدل جاتی ہے۔ دعا تو ہر ایک کرتا ہے۔ مگر ہر ایک کی دعا پر ماں باپ، علمائے صالحین اور اولیائے صالحین کی دعاؤں کو اللہ تعالٰے نے برتری بخشی ہے۔

چونکہ وسیلہ وہی کامیاب ہو سکتا ہے جو بر سبیلِ حق، پرتاثیر اور زود اثر ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ پابند اسلام علماء و صوفیاء شریعت کی اطاعت سے ہی تاثیراتِ نیک حاصل کرتے ہیں اور ایسی تاثیرات کا ہونا برحق ہے۔

عنداللہ و عندالرسول سب سے بڑا وسیلہ کلمۂ طیبہ ہے۔ پھر کامل نماز و زکوۃ ہے۔ پھر صوم و حج ہے۔ یہ اسلام کے بنیادی وسائل ہیں۔ ان وسائل کے بعد ہی ماں باپ، علمائے صالحین اور اولیائے صالحین کے وسائل مقبول اور پُر تاثیر ہو سکتے ہیں۔ یہ تاثیرات بالخصوص اہل ایمان کے لیے زود اثر ہوتی ہیں، مگر بالعموم ساری مخلوقات کو بھی متاثر کرتی ہیں۔

اہل ایمان ایسے برگزیدہ لوگوں سے استفادہ کر کے عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے ذریعہ کمال ترین درجات پا لیتے ہیں۔

گمراہی سے ہدایت کی طرف آنے کے لیے اولیٰ تر ہے کہ علمائے صالحین اور اولیائے صالحین کا تقرب حاصل کیا جائے۔ تاکہ اسلام کی طرف طبیعت مائل ہو کر پابند اسلام ہو جائے۔

تین قسم کے لوگ اپنے اپنے محل و درجہ کے لحاظ سے علماء و اصفیائے اسلام سے اپنے مراتب کے مطابق فیض پا کر راہِ ہدایت پاتے ہیں۔ ایک گروہ عامۃ المسلمین کا ہے۔ جو دو حصوں پر منقسم ہو جاتا ہے۔

ایک وہ مسلمان جو اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اور ایک وہ مسلمان جو مسلمان ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر پابندِ اسلام نہیں ہوتے۔

اول الذکر قبولیت تاثیر میں پہلا مقام رکھتے ہیں۔ ثانی الذکر کا دوسرا درجہ ہے۔ ان دو طبقوں کے علاوہ ایک وہ گروہ انسانیت ہے جو صفِ انسانیت میں تو شمار کیا جاتا ہے مگر قبولیتِ اسلام سے انحراف و اعراض کی بنا پر غیر مسلم ہوتا ہے۔

یہ غیر اسلامی گروہ نافرمانِ حق ہو کر زندگانیوں کو خلاف فطرت بنا لیتا ہے۔ ایسے گروہ کو جو اسلام قبول ہی نہیں کر سکا۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو مائل با اسلام تو ہوتے ہیں۔ مگر پرتاثیر دعوت کے نہ ملنے کی بناء پر محروم ہدایت رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو جب بھی اسلامی تبلیغ پرتاثیر قول و عمل کے ساتھ مل جائے تو وہ اسلام کی ہدایت کو قبول کر لیتے ہیں۔

اس گروہ کی دوسری قسم یہ ہے۔ جو قلباً و ذہناً دعوت حق کی قبولیت سے گریز کرتی ہے۔ مگر متقی ولی اللہ کے اقوال و اعمال جب منازل تقویٰ پر اللہ تعالےٰ کی دوستی حاصل کر لیتے ہیں۔ تو تائیدِ خداوندی ان کی زبان و قلم اور علم و عمل میں وہ وہ خوارقات پیدا کر دیتی ہے۔ جس سے سخت سے سخت ترین دل بھی پگھل کر موم ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ ایسی کرامات سے متاثر ہو کر مشرف با اسلام ہو جاتے ہیں۔ ایسے کامل لوگ ان لوگوں کو جو ابھی دعوت اسلام قبول نہیں کر سکے، اسلام کی طرف بلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اسلام ایسے ہی کریم العادات لوگوں کے ذریعہ اکنافِ عالم تک پہنچا اور آئندہ بھی ایسی ہی متقیانہ تبلیغ کے ساتھ علماء و اصفیاء دین اسلام کو انسانیت تک پہنچانے اور قبول کرانے میں کامیابی پا سکیں گے۔ تینوں گروہوں میں اول الذکر پابند اسلام مسلمانوں کے گروہ کو ایزادِ عمل کے لیے علماء و اصفیاءؒ کی مجلس کرنی ضروری ہے تاکہ انہیں مزید استقامت ملے اور ثانی الذکر مسلمانوں کے لیے پابند اسلام نہ ہونے کی بنا پر نیک تاثیرات لینے کے لیے علماء و اصفیاء کا تقرب حاصل کرنا اشد ضروری ہے تاکہ ان کی اصلاح ہو سکے اور ثالث الذکر غیر مسلمین ہدایت پا سکتے ہیں۔

یہ طرز تبلیغ انبیاء سے علمائے امت میں منتقل ہو کر عملی و علمی تبلیغ بنتی ہے۔ انبیا کی تعلیمات علماء کے ذریعہ انسانیت تک پہنچتی ہیں۔ انبیاء کی تبلیغ کے وارث علما ہوتے ہیں۔

حدیث شریف ۔ العلماءُ ورثۃُ الانبیاء

ترجمہ۔ میری امت کے علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ علماء ہی انبیاء

کے وارث ہوتے ہیں۔ علمائے امت ورثۃ الانبیاء ہونے کے اس واسطے حقدار ہیں کہ وہ علم دین کے فاضل ہونے کی بنا پر اللہ سے زیادہ ڈرنے والے ہوتے ہیں۔ دوسرا انبیاء کی وراثت کے لیے تین بنیادی شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ جو متقی علماء کے سوا کسی دوسرے گروہ میں نہیں پائے جاتے۔ ذاتی طور پر انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا مگر علمی وارث ہوتے ہیں اور یہ صفت علماءِ امت میں ہی زیادہ پائی جاتی ہے۔

البتہ کتاب و سنت آخری الہامی فیصلہ ہونے کے بعد علماء کا اعتقادی مذہب ہوتا ہے اور اسی کے مطابق ان کی تبلیغ ہوتی ہے۔ حضور کے دنیا سے جانے کے ساتھ ہی وحی کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اس کے بعد کرامات اولیاء کا سلسلہ تاابد باقی رہے گا۔

نبوت کے بنیادی ارکان تین ہیں۔

یہی تین ارکان مدار نبوت ہیں۔ ایک رکن بھی کم ہو تو نبوت کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ تمام انبیاء ان تینوں صفات کا مجموعہ تھے۔ اور یہ تینوں چیزیں حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی نبوت کے ساتھ تاابد ختم کر دی گئی ہیں۔ ایک اخبار بالوحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اور معجزات کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔ مگر تبلیغ دین علی منہاج نبوت و شریعت تابحد قیامت جاری رہے گی۔

فلہذا انبیاء کے وارث وہی علماء ہو سکتے ہیں جو کتاب و سنت کو آخری دین سمجھ کر اس پر عملاً پیروی کریں اور اسی کو ذریعہ تبلیغ بنائیں۔ جو عالم دین کتاب و سنت کی روشنی میں متقی ہو گا۔ اور اسی کے مطابق اپنے احوال و اقوال و افعال کو ترتیب دے گا۔ وہ ولی اللہ ہو گا۔ اور ولی اللہ

سے کرامات کی صورت میں خوارقات کا سرزد ہونا شریعت سے ثابت ہے۔

اس واسطے ایسے ہی باکرامت علمائے امت کی تبلیغ ملت اسلامیہ کو اجتماعی تنظیم دے سکتی ہے۔ اور خوارقاتِ متقیانہ کے ساتھ اپنوں اور پرائیوں کو اسلام کی طرف متوجہ کر سکتی ہے۔

یہ اسلام کے اعمال کے نتیجہ میں نورانی اور برہانی تبلیغ کہلاتی ہے۔ جو سلف صالحین کی تاریخ سے ثابت ہے۔

تمام اصحاب رسول کریم اولیاء اللہ تھے۔ ان کے علم و عمل نے انہیں متقی ہونے کا شرف بخشا تھا۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی تبلیغ نے صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین کو علم و عمل بخشا۔ جس سے وہ اولیا اللہ بنے۔ پھر تابعین و تبع تابعین میں وہ علم و عمل منتقل ہوا جس نے ان کو اولیاء اللہ بنایا۔

یہ تینوں گروہ علمائے وقت کی رہبری میں اسلامی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ اور ورثۃ الانبیاء کے مفہوم کو علماً و عملاً پورا کیا۔

مابعد کے علما تاابد اسی علمی و عملی روشنی میں ورثۃ الانبیاء ہوں گے اور ان کے علم و عمل کرامات کے حامل ہوں گے۔ جن سے دین پھیلتا رہے گا اور سخت قسم کے منکرین اسلام بھی ان سے متاثر ہو کر دعوتِ اسلام قبول کرتے رہیں گے۔

امت کے علماء میں سب سے آخری عالم دین جو ورثۃ الانبیاء ہو کر علماً و عملاً اتباع اسلام کا نمونہ پیش کریں گے۔ وہ مہدی موعود علیہ الصلوۃ والسلام ہوں گے جو علم و عمل میں سب سے بڑے متقی ولی اللہ ہوں گے

اور خوارقات کے حامل ہوں گے۔ اس زمانہ میں استدراج بھی اپنے آخری عروج پر ہوگا جس کو وہ کرامات منتقیانہ سے باطل کر دیں گے۔

اس طریقہ عمل کی پیروی کو اصطلاح اسلام میں اتباع رسول کہا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کی باکرامت تبلیغ سے اکثر غیر مسلمین بھی اہل ذکر علماء و صوفیاء کی قولی و عملی تبلیغ دین سے متاثر ہو کر مائل بہ اسلام و مشرف با اسلام ہوتے رہیں گے۔ اس طرح اسلام بنی نوع انسان تک پھیلاؤ حاصل کرتا رہے گا جس کا زندہ ثبوت تاریخ تصوف اور تاریخ علم و عمل کی صورت میں موجود ہے۔ قرونِ اولیٰ سے لے کر آج تک جس شعبۂ زندگی میں کسی مسلمان فرد نے اسلامی شہرت پائی۔ یقیناً وہ عالم دین تھا یا علماء کا مقرب تھا۔ علمائے امت نے مختلف شعبہ جات میں اسلامی خدمات انجام دیں۔ میدانِ رزم و بزم دونوں میں اعلیٰ عملِ صلح کا نمونہ پیش کیا۔ تجارت، صنعت و حرفت میں مختلف علوم و فنون کے ساتھ خدمات دین سر انجام دیں۔ خود سرور کائنات فخر موجودات علیہ الصلوۃ والسلام کو اللہ تعالےٰ نے علم الاولین والآخرین کا حامل فرمایا۔ آپ نے بذات خود ہر شعبۂ اسلام میں خدمات انجام دیں۔ آپ نے وہ جملہ فرائض انجام دیئے۔ جو عبادات و معاملات سے یا اسلامی معاشرت اور اخلاق سے متعلق تھے۔

آپ کے گھرانے کے جملہ نورانی افراد ذکور واناث نے آپ کے نقشِ قدم پر چل کر اسلامی بنیادی عقائد سے متعلق ہو کر علوم کی فضیلت کے ساتھ علم العبادات اور علم المعاملات، علم المعاشرت اور علم الاخلاقیات کی فضیلت کے ساتھ عملاً تقویٰ حاصل کیا اور ولی اللہ ہو کر ورثۃ الانبیاء کا درجہ حاصل کیا۔ یہاں تک کہ دین اسلام کی حفاظت و بقا کے لیے یہ سارا

گھرانہ راہِ حق میں قربان ہوا۔ اور فَدَینٰہُ بذبحٍ عَظِیم کی تکمیل فرمائی۔

خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالٰی علیہم اجمعین نے فضیلت علوم دینیہ کے ساتھ اسلام کی عملی تفسیر فرمائی اور ورثۃ الانبیاء کا علماً و عملاً ثبوت بنے اور مقرب اولیاء اللہ ہوئے۔

ترتیب سے تابعین و تبع تابعین نے علم دین کی فضیلت کے ساتھ تقویٰ اختیار کیا اور ورثۃ الانبیاء ہونے کا عملی ثبوت پیش کیا۔

خَیرُالقُرُونِ قَرنِی ثُمَّ الَّذینَ یَلُونَھُم ثُمَّ الَّذینَ یَلُونَھُم

یعنی صحابہ کو درجہ بدرجہ مراتب حاصل ہوئے ایک صحابہ، دوم تابعین اور سوم تبع تابعین یہ تینوں زمانے صحابہؓ کی نسبت سے خیرُالقرون کے نام مبارک سے موسوم ہوئے۔ ان کی نسبت قربت رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وجہ سے تمام امت پر ابدالآباد تک فضیلت پائی ان کے احوال و اقوال و افعال سب عندالاسلام کرامت ہی کرامت تھے۔ اگر انہوں نے تبلیغ دین کے فرائض تحریر و تقریر سے سرانجام دیے تو میدانِ رزم و بزم میں حکمت و موعظت کے ساتھ تبلیغ کے فرائض انجام دیے۔

جس جس طرح بھی علمائے امت نے بربنائے تقویٰ خدمات انجام دیں۔ وہ سب کراماتِ اسلامیہ کا ایک زندہ باب ہے اور اس باب کی تکمیل مہدی موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کریں گے۔ تا ابد یہ سلسلہ کرامات جاری رہے گا۔ جب کوئی بھی ولی اللہ نہیں رہے گا۔ تو قیامت بپا ہو جائے گی۔

والحمد للہ ربِّ العلمین

# بارہواں باب

## شاہکارِ زیست
## کا
## نقطۂ پرکار

تبلیغ اسلام نے صرف ایک ہی آخری ہستی کی قولی، عملی اور حالی تبلیغ سے اپنا آغاز کیا۔ وہ ہستیٔ پاک سلطانِ دو عالم، فخرِ موجودات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات اقدس ہے۔

جس ہستی پاک کو اللہ تعالےٰ نے نیکیوں کے لیے حتمی طور پر ہادیانہ صفات دیکر پوری انسانیت کی طرف بغرضِ ہدایت مبعوث فرمایا اور بعثت کے لیے جن حتمی لوازمات کی ضرورت تھی۔ وہ پیدائشی طور پر آپ کو تفویض کر دیئے گئے۔

آپ مرقعۂ ہدایت بن کر پیدا ہوئے اور اس مظہر ہدایت جسم و جان کو چالیس سال تک خود خالقِ فطرت نے اپنی مرضیات کے مطابق تربیت کے لیے مقبول و محبوب اور طاہر و مطہر راہیں اور وسائل، اسباب و ذرائع عطا فرمائے۔

آپ کی تاریخ پیدائش ایک ایسے عظیم المرتبت خاندان سے سفرِ حیات جاری کرتی ہے جس کا تعلق مذہبیات سے رہا۔ اور ہمیشہ سیادت و قیادت بھی اس خاندان کے ہمرکاب رہی۔ اس خاندان کا تعلق نسباً

انبیائے سابقین سے متعلق تھا۔ اس خاندان کی گھٹی میں نیک نامی کے کارنامے نسلاً بعد نسل سلسلہ وار چلے آرہے تھے۔ آپ کے والد گرامی حضرت عبداللہ، حضرت عبدالمطلب کے محبوب ترین بیٹے تھے۔ ماں حضرت آمنہؓ تھیں، جن کی نیک نامی ضرب المثل ہے۔

اللہ تعالےٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کو فطری ہدایت پر پیدا فرمایا۔ اور دنیا میں سب سے اعلیٰ حسب و نسب والے خاندان میں پیدا فرمایا۔ یہ خاندان تربیت گہہ عالم کی وہ پہلی دہلیز ہے۔ جس کو آخری محسنِ انسانیت کے لیے منتخب فرمایا گیا۔ جس پر حضور ﷺ کی ولادتِ پاک ہوئی۔

اصلاب وارحام کے بعد عالم اسباب میں آپ کی پیدائش پر آپ کو جو اولین وسائل عطا فرمائے۔ وہ حضرت آمنہؓ کی گود مبارک اور خاندان کے پاک باز لوگوں کی آواز تھی جو آپ کے گوش گذار ہوئی۔ جب آپ نے پہلی مرتبہ اپنی چشم مبارک کھولی تو نیک اور پاک ماحول دیکھا۔ آپ نے اپنے خاندان کے خوش نما، خوش خصال، خوش اخلاق، خوش گفتار، خوش کردار اور متبسم چہروں اور خوش نما پیشانیوں کو دیکھا۔

آپ نے اپنی پہلی معصومیّت کے ساتھ اس دنیا میں پہلے ورود مسعود پر جو پہلا ماحول پایا۔ آفرینش سے ابدالآباد تک ایسا خوش خصال ماحول سوائے آپ کے کسی اور کا مقدر نہیں بن سکا۔ اور بے مثال خاندانی ماحول کو تربیّت مصطفےٰ ﷺ کے لیے تجویز کرنا پھر عظیم انسان اور اس کی تربیت کا آغاز تربیت کا ظہور و صدور۔ پھر تربیت ثانیہ کے لیے دوسرے ماحول کا انتخاب جو حضرت مائی حلیمہؓ کی صورت دلنواز کے ساتھ سامنے

آیا- پھر ایامِ طفولیت کی منزلوں میں پاک سے پاک تربیت گاہوں کا بار بار نامساعد حالات میں قدرتی طور پر پاک و صاف ہو کر سامنے آنا اس بات کی بین دلیل ہے کہ آپ فطری طور پر ہدایت یافتہ تھے اور خالقِ فطرت نے سب خلائق سے زیادہ آپ کی تربیت کی طرف توجہ دی۔

آپ کی پوری تاریخ پر صحت مندانہ غور کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے نظام کائنات میں اللہ کی نگاہ پاک میں آپ کی ذات اقدس خدائے لم یزل کا وہ نقطۂ نظر تھا جو تخلیقِ عالمین کے لیے بجا طور پر نقطۂ پرکار حق تھا۔

اللہ تعالےٰ نے آپ کو ازل تا ابد پاک کر دیا۔ آپ کو مکہ معظمہ جیسے اعلیٰ ترین اور بے مثل و بے مثال مقام پر پیدا فرمایا۔ جو دنیا سے دور تر اور الگ تھلگ جگہ تھی اور معنوی طور پر بیت العتیق کا درجہ رکھتی تھی۔ جو زمانے کی منصوبہ سازیوں سے محفوظ و مامون تھی۔ ریگزاروں کو آپ کے لیے ولادت گاہ بنایا۔ عظمت و برکت کے لحاظ سے کائنات کے سب گھروں سے زیادہ عظمت والے گھر میں پیدا فرمایا۔ ارض کعبہ، جبل کعبہ، سماء کعبہ آب و ہوائے کعبہ، در و دیوار کعبہ، ظہور و بطونِ کعبہ، فرشتگانِ کعبہ کی معیت میں خود خدائے کعبہ نے آپ کی پیدائش کی گواہی دی ارض و سما اور ساری خلائق نے تبریک و تحسین کے ساتھ خوشیاں منائیں۔ اپنے اور بے گانے قدرتی طور پر خرم اور شاد کام ہوئے۔ حوروں، غلمانوں اور کروبیوں نے سلام کیا۔ اللہ تعالےٰ کی ذات خوش ہوئی کہ اس نے اپنی مخلوقات کے شاہکار کو تخلیق فرمادیا۔

بعثتِ نبوت تک آپ کی تربیت میں خدا اور اس کے خاموش و

پاکباز لشکر خفی و جلی انداز میں مصروف تربیت رہے۔ آپ کی بعثت کا منشاء تبلیغ دین تھا اور خدا کے سامنے پوری انسانیت کو سر بسجود کرنا تھا۔ چالیس سال کی عمر پاک میں آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ختم نبوت کے ساتھ اعلان نبوت کرنے کا حکم صادر فرمایا آپ پر آخری پیغامات قرآن و حدیث کی صورت میں نازل کرنے شروع کر دیئے۔ تئیس (۲۳) سال میں دینِ پاک مکمل ہوا اور انجام کار آپ کے ذریعہ آئین فطرت مکمل ہو کر انسانیت کے ہاتھوں میں دیدیا گیا۔ اور پروردگار عالم نے آپ کے پرخلوص عمل پر دین اسلام کی تبلیغی اور تنفیذی خدمات پر آپ کی عبادات پر آپ کے معاملات، آپ کی زندہ جاوید معاشرت، آپ کی کامل و اکمل اخلاقیات پر راضی ہو کر فرمایا۔

"اَلیَومَ اکملتُ لکُم دِینَکُم وَ اَتممتُ علَیکُم نِعمَتِی
وَرَضِیتُ لکُمُ الاِسلَامَ دِینًا"

یعنی آج کے دن میں نے آپ کے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعتموں کو آپ پر پورا کر دیا اور آپ کے دینِ اسلام سے مکمل طور پر راضی ہو گیا۔

اللہ تعالےٰ کی اس آخری بشارت میں جو اپنے محبوبِ پاک کے لیے ارشاد فرمائی اس میں کمالِ دین، اتمام نعمت، کمالِ رضا بالاسلام تین چیزوں کے ساتھ اپنے نبی کے لیے تکمیل دین کو محبت قرار دے دیا۔ گویا کہ اب ہمیشہ کے لیے نوعِ انسانیت پر اپنی حجتِ کاملہ بذریعہ ختم نبوت، دلائل و براہین کے ساتھ پوری کر دی۔

انسانی تمناؤں کے مطابق اس آئینِ فطرت کے ساتھ بنی نوع

انسان کو پھلنے پھولنے اور زندگی کے معراج کمال تک پہنچنے کا صحیح لائحہ عمل پیش کر دیا اور عقیدہ توحید اور عقیدہ ختم رسالت اور عقیدہ کتاب و سنت اور عقیدہ یوم آخرت کو مسلمانوں کے لیے صراط مستقیم بنا دیا۔ انبیاء و صدیقین، شہداء و صالحین کے منعم من اللہ ہونے کا اسی دین کو مثالی ذریعہ بنا دیا۔

اللہ تعالیٰ نے سید الانبیاء علیہ الصلوۃ والسلام کو ہدایت کی اس بلندی پر فائز المرام فرمایا۔ جس کی بلندی سے ان کی نگاہ پاک، اولین و آخرین تک کا بالمشاہدہ جائزہ لے سکے۔ آپ کی ذات کو اسی وجہ سے اولین و آخرین کا شاہد فرمایا گیا۔

ان ختمی اوصاف کی بدولت یوم میثاق پر جملہ انبیاء سے آپ کی ختم رسالت اور آپ کی نبوت کی تائید پر اقرار لیا گیا۔ اس دنیا میں انبیائے سابقین کو آپ کی خاطر راہ ہدایت ہموار کرنے کے لیے آپ سے پہلے بھیجا گیا تھا۔ تاکہ آخری پیغمبر کے لیے انسانی اذہان کو پہلے سے ہی قبول کرنے کے لیے تیار کیا جائے تاکہ انسانیت آخری آنے والے نبی کی بعثت سے اجنبی نہ رہے۔ اور استقبال کے لیے تیار رہے۔

تمام انبیائے کرام نے اس دنیا میں آپ کا استقبال کیا۔ آدم علیہ الصلوۃ والسلام کو آپ سے پہلے اس واسطے مبعوث کیا گیا۔ تاکہ وہ زمین پر بسنے والے انسانوں کے اذہان کو لفظ بعثت سے مانوس کر دیں۔ چنانچہ آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام تک سب نبیوں نے بعد از وصال اپنی قبور سے باہر آ کر بالاجتماع اس وقت آپ کا استقبال کیا۔ جب خدائے لم یزل کی دعوت پر آپ اپنے معراج کی تکمیل

کے لیے عرشِ عظیم کی طرف جا رہے تھے۔

یہ ظاہر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اہل قبور سے نہیں تھے بلکہ وہ آسمانوں کی بلندیوں پر تھے جہاں سے وہ بیت المقدس میں بجنس نفیس تشریف لائے تھے اور نبی اکرم ﷺ کی اقتدا میں نماز ادا کی تھی اور واپس آسمان پر چلے گئے تھے۔ آخر زمانہ میں زمین پر تشریف لائیں گے اور ان کی قبر شریف حضور ﷺ کی قبر مبارک کے ساتھ ہو گی۔

سفرِ معراج میں انبیاء کی ملاقات کا نکتہ یہ ہے کہ بڑے لوگ ہمیشہ بڑے کارناموں پر ہی سامنے آیا کرتے تھے۔

چونکہ ختم نبوت کے ساتھ معراج کمالات نبوت کا اظہار تھا۔ ایسے موقع پر تمام انبیاء و مرسلین اللہ کے حکم کے ساتھ اپنی اپنی قبور سے بجنسہ اٹھائے گئے اور ان سے عہدِ میثاق پورا کرنے کے لیے بیت المقدس میں برسبیلِ راہ معراج آخرالزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے استقبال و تائید کے لیے جمع فرمایا۔ تمام انبیاء نے آپ کی اقتداء میں نماز ادا کی اور آپ کے مطیع و منقاد ہوئے اور خدا کے ساتھ یوم میثاق میں جو مواعید کیے تھے، ان کو عملاً پورا کیا۔ منازلِ معراج میں انبیائے کرام نے آسمانوں پر بھی آپ کا استقبال کیا۔ پھر اللہ تعالےٰ کی ذات پاک نے بھی اپنی کمال رحمت و محبت سے آپ کا استقبال فرمایا۔ اور محب و محبوب کی ملاقات ہوئی۔

معراج کی تکمیل کے ساتھ ساتھ تبلیغ اسلام کو بھی مزید وسعت دی گئی اور انسانیت کی فلاح و نجات کے لیے مزید راستے ہموار ہوئے۔ معراج سے واپسی کے بعد آپ کی تبلیغ کا سلسلہ پہلے سے کہیں زیادہ منظم اور زور دار ہو کر سامنے آیا۔ آپ نے تکمیلِ معراج کے بعد نہیں فرمایا۔ کہ اب

میرے لیے تبلیغِ دین کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

بلکہ مزید شکرانۂ خداوند ذوالجلال کے ساتھ تکمیلِ عمل کے لیے عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق اسلامیہ کے لیے اپنی امت کو زیادہ عمل پیہم کے ساتھ اعمالِ اسلامیہ کو تیز کرنے کا حکم فرمایا۔

قرآن مجید نے آپ کے ازلی و ابدی ہدایت یافتہ ہونے پر آپ کی پیدائش اور ترسیل کو اس واضح انداز میں بیان فرمایا جس سے صاف طور پر وضاحت ہو جاتی ہے کہ آپ کی ذات نزولِ دین سے پہلے ہی دینی ہدایت کے ساتھ پیدا فرمائی گئی اور بعثت نبوت سے قبل بھی آپ کی روح و جسم دونوں دین پر عمل پیرا تھے اور آپ کو دین سکھا کر بھیجا گیا ہے۔

پھر اس کے بعد بوقتِ بعثت دین کو سند کے طور پر آپ کے ہاتھ میں دیا گیا۔ دین نے بزبانِ رسول اکرم علیہ الصلوۃ والسلام اعتبار حاصل کیا۔ اور دین نے ہی حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے دعوائے نبوت کی تصدیق کی۔ دین اسلام آپکے نظریۂ توحید اور آپ کے اخبار بالغیب کی تصدیق میں ایک کھلی گواہی بن کر آیا۔ آپ کی تبلیغ کا مظہر بھی دینِ اسلام ہوا۔

گویا دین ایک طرف آئینِ فطرت بھی ہے اور ایک طرف تاریخ رسالت بھی ہے اور ایک طرف ابدالآباد تک بحفاظتِ تمام ذریعۂ ہدایت بھی ہے۔

چنانچہ قرآن کریم نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی پیدائش و ترسیل پر اپنے دین حق ہونے پر جس اسلوب بیان سے ترجمانی کی ہے وہ ہماری ذہنی مشکلات اور ذہنی سوالات کا صحیح حل بن جاتا ہے۔

ارشاد باری تعالےٰ ہے۔

"ھُوَالّذِی اَرسَلَ رَسُولَہ بِالھُدٰی وَدِینِ الحَقِّ لِیُظھِرَہ عَلَی الدِّینِ کُلِّہ وَکَفٰی بِاللہِ شَھِیدًا"۔

ترجمہ۔ اللہ وہ ذات ہے۔ جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت یافتہ بنا کر بھیجا اور دینِ برحق کے ساتھ بھیجا تاکہ ادیانِ عالم پر اس کی سچائی واضح ہو سکے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ووافی ہے۔

یہ آیت چار حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولِ پاک کو پیدائشی طور پر ہدایت یافتہ بنا کر پیدا فرمایا۔ چونکہ لفظ اَرسَلَ کے معنی بھیجا کے آتے ہیں اور یہ بھیجنا آپ کی ذاتی ولادت سے لے کر بعثت نبوت تک اور بظاہر اس دنیا سے وصال مبارک تک اور ابدالاباد تک کے لیے ہے۔

اگر آپ کی بعثت سے آپ کی پیدائش کا تعلق نہ ہو تو بعثت کا ذریعہ معدوم العمل ہو جاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ذریعہ بعثت ذات محمد مصطفےٰ ﷺ ہیں تو بعثت کی مصداق صحیح حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی ذات ہی ہو سکتی ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول کو ازلی و ابدی ہدایت کے ساتھ آراستہ وپیراستہ کر کے بھیجا۔

گویا آپ کی ذات دینِ ناطق تھی اور دینِ مبین کتاب صامت کی صورت میں آپ پر نازل ہوا۔ اس کتاب صامت میں زبانِ وحی اور نطق رسول پاک علیہ الصلوۃ والسلام نے ترجمانی کے فرائض انجام دیئے۔ زبانِ وحی نے سرورِ کائنات کے سامنے اور سرور کائنات نے بنی نوع انسان کے سامنے کتاب اللہ کو پڑھا اور ترجمانی فرمائی۔

وَدِینِ الحقِّ آیت کا یہ ٹکڑا مضمون کا دوسرا متواصل حصہ ہے، جس کو رسالت کے ضمن میں بیان فرمایا گیا۔ یعنی رسول پاک کو بھیجا اور ان کے اعتبار نبوت پر دینِ حق کو بھیجا۔

ہر آسمانی دین ہمیشہ باعتبار نبوت ہی نازل ہوتا رہا نہ کہ باعتبارِ دین چونکہ دین تو اللہ و رسول کے اعتبار پر مرتب ہوتا ہے۔ اللہ کے رسول پہلے دعوئ رسالت و نبوت کرتے ہیں اور اپنے دعوے کے ساتھ دلیل کے طور پر اللہ کے بتائے ہوئے دین کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ہر آسمانی دین اخبارِ بالغیب پر مرتب ہوتا ہے۔ انبیائے کرام اللہ کی طرف سے مخبرینِ صادقین ہوتے ہیں۔ اور وہ خبریں جو انبیاء و رسل سے صادر ہوتی ہیں، وہی دین بنتی ہیں۔ انبیاء کی اخبار بالغیب پر دین کا مضمون مکمل ہوتا ہے۔ ہر نبی نے اپنے زمانہ کے مطابق جزوی طور پر اپنا دین مکمل کیا۔

ان آیات میں حضور ﷺ کی پیدائش، بعثت اور دینِ اسلام کا ذکر ہے۔ اور غلبہ دین کے اظہار کا ذکر ہے۔ چوتھا اللہ کی گواہی ختمِ رسالت کے لیے کفائت بنتی ہے۔ پہلے ارسالِ رسول کا ذکر آیا۔ ثانیاً دینِ حق، ثالثاً اظہار دین کا ذکر ترتیب سے بیان ہوا۔ یہ ترتیب سب کی سب پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے اعتبار نبوت کے لیے ہے اول کو ثانی پر درجہ دیا اور ثانی یعنی دین کو اول کے ساتھ معتبر کر دیا گیا۔ ایک سبب دین ہے۔ جس سے دین صادر ہو کر قول و فعل و حال کا جامہ پہن لیتا ہے۔ اگر دین قول و عمل ہی نہ بن سکے اور اس کا عملی ظہور ہی نہ ہو سکے۔ تو وہ محض کتابِ صامت کی صورت ہی رہ جائے۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ختم نبوت کو اپنی ذاتی مرسلانہ صلاحیتوں کے ساتھ اور دینِ اسلام کے ساتھ جامہ تکمیل پہنایا۔ اسی ہیئت مجموعیہ نبویہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کی صالح جماعت کی تشکیل کی۔ اگرچہ صحابہ نبی نہ تھے۔ مگر وہ محسنِ اعظم، محبوبِ رب العالمین کے ایسے تربیت یافتہ اور جاں نثار و فرمانبردار تھے۔ جنہوں نے قبولیت توحید و رسالت کے بعد دینِ اسلام کو قبول کیا اور اللہ و رسول دونوں کی خوشنودی کا ذریعہ دینِ اسلام کو قرار دیتے ہوئے اس پر اپنے اعمال کی تعمیر کی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے دین کی کسی چھوٹی بڑی چیز تک کو بھی اپنے قیاس ظنی پر تعبیر نہیں کیا۔ بلکہ دین کے جزو کل کو ہادی مطلق کی طرف سے بھیجے ہوئے ہادی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف سے قبول کیا اور اس کی عملی پیروی سے ثابت کر دیا کہ خدا کے نبی برحق ہیں۔ خدا کا پیغام بصورتِ دین، حق ہے اور اسی میں انسانیت کی فلاح و نجات ہے۔

اسی طرز عمل سے صحابہ کی جماعت نے اپنے زمانہ کے ساتھ خیر القرون کا مرتبہ پایا۔ یہ دستور تبلیغ تمام انبیاء کی تبلیغ کا نچوڑ بن کر بصورتِ نبی آخرالزماں اور تعمیل صحابہ کرام کی صورت میں اندازِ تبلیغ بنا، جس سے انسانیت نے استفادہ کیا۔

صحابہ کرام کی اس تسلیم و رضا سے تابعین متاثر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے صحابہ کرام کے لیے جو بشارت فرمائی۔ وہ راہِ اسلام میں صورتِ تبلیغ کی ترجمانی ہے کہ صحابہ تعمیلِ احکامات ربانی میں اس قدر فرمانبردار تھے کہ متاعِ زیست تک کو بھی قربان کر دینے سے گریز نہ کیا۔ اسی واسطے

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے صحابہ کے متعلق وہ درجہ متعین فرمایا جو مابعد ابدالاباد تک کسی دوسرے کو نہیں مل سکتا۔

آپ نے فرمایا۔

اَصحَابِی کَالنّجُوم بِاَیّتھِم اقتَدَیتُم اھتَدَیتُم

ترجمہ۔ میرے اصحاب پاک میرے آسمانِ نبوت کے درخشندہ ستارے ہیں۔ تم اگر ان میں سے کسی ایک کی بھی پیروی کرو گے تو ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے۔

"خَیرُالقُرُونِ قَرنِی ثُمّ الّذِینَ یَلُونَھُم ثُمّ الّذِینَ یَلُونَھُم "۔

سب زمانوں سے بہتر میرا زمانہ ہے۔ یہ نسبت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ کی طرف ہے۔ ثُمّ الّذِینَ یَلُونَھُم۔ پھر صحابہ کے ساتھ ملحق دوسرا زمانہ ہے۔ یہ نسبت تابعین کی طرف ہے۔ ثُمّ الّذِینَ یَلُونَھُم۔ یہ تیسرا نسبت ملحق زمانہ جس کی نسبت تبع تابعین کی طرف ہے۔

یہ تین زمانے بفرمانِ مصطفٰے علیہ الصلوٰۃ والسلام ابتداء آفرینش سے ابدالاباد تک جملہ زمانوں پر باعتبارِ الحاق ختم المرسلین افضل القرون ہیں۔ ان زمانوں کے افضل القرون ہونے کی وجہِ اول، قرابت والحاق نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے۔ وجہ دوم قرابت میدانِ تسلیم و رضا میں پروردگار عالمین کے بھیجے ہوئے دین کے احکامات کی تعمیل میں عقائد کی مضبوطی، عبادات کی تکمیل، حسنِ معاشرت اور حسنِ اخلاقِ اسلامیہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بندگی۔ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں سرفروشانہ استقامت تھی۔ سوم ان ہی خطوط پر تبلیغ دین کے فرائض کی انجام دہی، جس پر اللہ کے رسول نے نفاذِ دین فرمایا تھا۔ اسی حکمت و

موعظت کو انہوں نے ذریعہ تبلیغ بنایا جس کو حضور ﷺ نے ذریعہ رشد و ہدایت بنایا تھا۔

مَا آتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا۔

کا صحیح نقشہ پیش کرنے کے بعد ان کے زمانہ نے باعتبار تقویٰ تمام زمانوں پر تفوق و برتری حاصل کر لی۔

یہ زمانہ اسلامی کارناموں پر مرتب ہوا۔ ورنہ زمانہ تو کوئی بھی زمانہ کہلا سکتا ہے۔ تمام انبیاء بھی اپنے وقت میں صاحب زمانہ تھے۔ ان کے زمانوں کو بھی اپنے زمانوں پر فضلیت تھی۔ مگر ختمی مرتبت صلی اللہ تعالے علیہ وسلم چونکہ آخرالزمان تھے اور بعد الانبیاء تھے۔ اس واسطے آپ کا زمانہ سید القرون ہوا اور اسی سیادت کل کی بناء پر آپ کا دین سید الادیان ہوا۔ اور آپ کی امت سید الامم ہوئی اور بفرمانِ مصطفےٰ علیہ الصلوۃ والسلام

عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْل

کے مطابق علمائے امت سید الشیوخ ہوئے۔

اس حدیث میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا۔ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے مثل ہوں گے۔ یہ مرتبہ کسی نبی کی امت کو یا ان کے علماء کو یا ان کے دین کو نہیں ملا۔

تبلیغ دین اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم۔ پر تعبیر ہو کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر ضوفشاں ہوئی۔ انہوں نے اسی خُلقِ عظیم کو اپنا رہنما بنایا جس سے شش جہات عالم میں دینِ اسلام خلقِ عظیم کا مظہر بن کر ظاہر ہوا۔

قرآن مجید کا یہ فرمان کہ

"اُدعُ الیٰ سبیلِ رَبِّکَ باالحکمَتہ وَالمَوعظَت الحَسَنَتہ وَجَادَ لُھُم بِالّتی ھیَ اَحُسَن "۔

یعنی تم اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف لوگوں کو حکمتِ بالغہ اسلامیہ کے ساتھ اور موعظت الحسنہ یعنی میٹھی میٹھی باتوں کے ساتھ دعوت دو۔

جب ظلم کی حد تک لوگ پہنچ جائیں اور خدا کی مخلوقات پر ظلم و عدوان بن کر موجبِ تکلیف اور اہل حق کے لیے مہلک صورت اختیار کر لیں۔ تو مدافعانہ صورت اختیار کر لو۔ تاکہ تمہاری جنگ بھی اخلاقی نوعیت اختیار کر لے اور باطل کو راہِ راست پر لانے کے لیے حق کے ساتھ اٹھ کر حق کو دوام و قیام دو۔ اس جدال کو عدل و انصاف کے ساتھ رشد وہدایت کے لیے سخت اضطراری حالت میں لازمی قرار دیا گیا ہے۔

اسلام میں یہ جدال بر سبیل حق تبلیغ دین بن جاتا ہے۔

مذہب اسلام میں مسلمان کی زندگی ولادت سے لے کر جملہ اعمال کی انجام دہی تک تبلیغ دین کے لیے ہے۔ حتّٰی کہ اس کی موت بھی تبلیغ دین کے ساتھ ہی زندگی کا انجام مبلّغانہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔

قُل اِنّ صَلاتی وَنُسُکی وَمَحیَایَ وَ مَمَاتی للہ رَبِّ العٰلَمینَ

یہ کہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور موت پروردگار عالمین کے لیے ہے۔ ان سبیلوں کو سمجھنے اور ان پر چلنے کی زیادہ صلاحیت علمائے امت میں ہے۔

قرونِ اولیٰ سے لے کر آج تک اور تا بحد قیامت تبلیغ کا دارومدار علماء حق اور صوفیائے امت کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔ علمائے امت اور اولیائے امت دونوں کا احترام اس ایمان کے ساتھ کرنا چاہیے کہ یہ

دونوں اولیاء اللہ ہیں۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اس زمانہ تک کس طرح دینِ اسلام پہنچ سکتا۔

اولیاء اللہ نے فرمایا۔ جس نے فلاحِ دارین حاصل کرنی ہو۔ وہ مکرمین کے پاس بیٹھے اور نہایت تواضع کے ساتھ اُن کے پندونصائح سنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی سعی کرے اور ان لوگوں کی ہر ممکن خدمات انجام دے۔ ان لوگوں کی جس طرح بھی خدمت کرے گا، وہ خدمت عنداللہ ہدیہ ہوگی۔ ان لوگوں کی خدمت میں زکوۃ وصدقات پیش نہ کیے جائیں۔ مثلاً صدقہ و خیرات اور زکوۃ کا مال ان لوگوں کو نہ دے۔ بلکہ اپنی خاص کمائی ہوئی دولت سے مال و جنس بصورتِ ہدیہ ان کی خدمت میں پیش کرے۔

یہ لوگ اکثر سفید پوش ہوتے ہیں۔ جو عالمِ اضطرار میں لوگوں کی کم فہمی اور غفلت کی بناء پر اس قسم کے جنس ومال قبول تو کرلیتے ہیں۔ مگر یہ شیوہ اللہ و رسول کو پسند خاطر نہیں ہوسکتا۔ کہ دنیا دار تو اپنی کمائی سے کھائیں پئیں اور عیش کریں اور اہل اللہ کو زکوۃ وصدقات دیں۔

مگر اللہ تعالےٰ اس حالت میں بھی اپنے بندوں کی بزرگی میں کمی نہیں فرماتا اس حالت میں ان کے صبر و تحمل پر ان کے مرتبے کہیں زیادہ بلند فرماتے ہیں اور ان کے اجر میں اضافہ ہوتا ہے۔

# تیرہواں باب

## بَربنائے تقویٰ سلوک کی تعریف

میرے بزرگوار والدین نے اپنی بصیرت عارفانہ کے پیش نظر اور حضرت پیر صاحب بکوٹی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مخدوم علی شاہ صاحب سوہاوی علیہ الرحمۃ کی پیشین گوئی کے مطابق مجھے کسی مدرسہ میں اکتساب علم کے لیے نہیں بھیجا بلکہ بڑے استغنا کے ساتھ مجھے پرائمری سکول موضع دیول شریف میں داخل کرایا، جس میں قدرتی طور پر مجھے دلچسپی نہ مل سکی اور تیسری جماعت تک بڑی لاپرواہی سے پڑھا۔ پرائمری سکول میں تیسری جماعت غالباً رعایتی طور پر پاس کی۔ میری پرائمری تک تعلیم کے گواہ اکثر موجود ہیں۔ یہاں تک میری تعلیم کے اساتذہ محترم حاجی محمد صدیق صاحب جو کمال خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ دوم ماسٹر غلام نبی صاحب ملکوٹ ہزارہ کے رہنے والے، سوم ماسٹر محمد سلطان خان صاحب جن کی موجودہ سکونت ڈھلہ میں ہے۔ چوتھے ماسٹر مولانا محمد عالم ترمٹھیاں والے، پانچویں سید عباس علی شاہ صاحب دیول شریف تھے۔ بس اتنا ہی تھا کہ عالمانہ ماحول میں زندگی بسر کرنے کا موقع ملتا رہا جس میں والدین کی زبان سے نکلے ہوئے دینی مسائل میرے ذہن نشین ہوجاتے تھے۔

والدین کی فاضلانہ مجلس کی تاثیرات نے میرے قلب و نظر پر گہرے اثرات مرتب کرلئے تھے جس سے میرا ذوق دینداری کی طرف مائل تھا۔ مگر باوجود اس ذوقِ اسلامی کے مجھے اپنے ہم جول ساتھیوں کے ساتھ کھیل کود کا بڑا شوق تھا۔ بہرحال میرے والدین مجھے بہت کم ممانعت فرماتے اور میرے جذبات کے پیشِ

نظر بڑی مدبرانہ، مشفقانہ عادتِ کریمانہ کے ساتھ پندو نصائح کے ذریعہ میری اصلاحِ حال فرماتے رہتے۔

بزرگانِ دین کے اقوال سناتے اور وہی میرے لیے ایک پرتاثیر نصیحت کی صورت اختیار کر لیتے۔ ہمارے درودیوار سے عاجزی، فروتنی اور درویشی کے ہمہ وقت آثار ہویدا رہتے تھے جو مطلقاً ایک کچا جھونپڑا تھا اور ایک ہی کمرے پر مشتمل تھا ہمارے گھر کا سارا ماحول درویشانہ زندگی کی ایک مختصر سی دنیا تھی۔ جس میں ہمہ وقت دینی مسائل، نہایت سفید پوشانہ ماحول، حسب استطاعت جود و سخا کا منظر، اہل عقیدت کی باذوق مجالس میرے ضمیر میں داخل ہو کر میرے قلب و نظر کو اپنا مسکن بنا رہے تھے۔

میرے والد بزرگوار حضرت مخدوم علی شاہ صاحب سوہاوی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت بکوٹی رحمتہ اللہ علیہ سے رحمانی تعویذات کے اجازت یافتہ تھے۔ اس کے ساتھ لوگوں کو دعا دینے کی بھی اجازت تھی۔ چشتی قادری طریقہ سے آپ اجازت یافتہ تھے۔ آپ کی دعائیں مقبول تھیں اور آپ کے تعویذات پرتاثیر اور زود اثر تھے۔ آپ کو خاندانِ قادریہ اور خاندانِ چشتیہ سے خرقہ خلافت کے ساتھ بیعت عامہ کی بھی اجازت تھی۔ مگر آپ نے پوری زندگی میں صرف گیارہ آدمیوں کو اپنا مرید کیا۔ ان گیارہ میں سے ایک میں بھی تھا اور میرے دو بھائی حکیم محمد عبدالجلیل مرحوم اور ڈاکٹر عبدالخالق صاحب مرحوم تھے۔ مجھے بیعت کے ساتھ خلافت بھی عطا فرمائی۔

والدہ بزرگوارہ کو بھی دعا کرنے اور کلامِ الٰہی کے ساتھ بیماروں کو دم کرنے کی اجازت تھی۔ دونوں حضرات اپنے پندو نصائح کے ساتھ ان اجازات کی بناء پر حاجت مندوں کے لیے دعائے خیر بھی فرماتے اور تعویذات بھی دیتے اور کلام الٰہی کے ساتھ مریضوں کو دم بھی فرمایا کرتے تھے۔ ان کے ان فیوضاتِ درویشانہ سے اکثر لوگوں کو کافی فائدہ ہوتا تھا۔

روحانی استفادۂ عام کی بنا پر ہزارہ، مری، آزاد کشمیر اور کھوٹہ تک کے لوگ اور بیرون پہاڑ یعنی میدانی علاقوں سے بھی بکثرت لوگ آتے اور دینی و روحانی استفادہ حاصل کرتے۔ یہ لوگ ہجوم در ہجوم ہمارے درویش خانہ پر صبح و مساجمع رہتے اور میرے والدین بزرگوار بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ان کی خاطر و مدارات کرتے اور حسبِ توفیق ان کی خدمات انجام دیتے۔

آپ حضرات نے اس طریقِ تصوف کو تبلیغ دین کے لیے صرف کیا۔ حضرت والد بزرگوار تعویذ لکھتے ہوئے بھی اپنی وعظ و نصیحت جاری رکھتے عام لوگوں میں عام فہم نصیحت فرماتے اور خاص لوگوں میں خاص باتیں بیان فرماتے اور والدہ مرحومہ درسِ قرآن دینے میں زیادہ دلچسپی لیتی تھیں۔ نیز والد بزرگوار اہل علم لوگوں میں عالمانہ سطح پر گفتگو فرمایا کرتے تھے اور بعض دفعہ فلسفہ کی انتہاؤں تک آپ کا کلام بلیغ پہنچ جاتا۔

آپ کا کلام دینی تعلیمات کی روشنی میں معرفت ربانی کا ترجمان ہوتا تھا۔ آپ طرز طریقت میں امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت رومی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت غوث الاعظم جیلانیؒ کے مقلد تھے۔

میں نے بھی خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد اسی دستورالعمل کو ذریعۂ غور و فکر بنا لیا۔ چنانچہ اس زاویۂ نگاہ پر مجھے ریاضت کے دوران صحیح تفکر کرنے کا موقع ملا اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ آپ زیادہ سے زیادہ امثال حضرت رومی اور حضرت غزالی اور حضرت غوث الاعظم جیلانی رحمتہ اللہ علیہ اور بعض دفعہ حضرت سعدی رحمتہ اللہ علیہ کا کلام بھی بطور نصائح پیش کرتے اور نظریۂ توحید غوث الاعظم جیلانی قدس اللہ سرہ العزیز کے طریقہ پر بیان فرماتے۔ قصیدۂ غوثیہ اور قصیدہ بردہ شریف اور درود تاج کا زیادہ ورد فرماتے تھے اور دلائل الخیرات کے متعلق یہاں تک اظہارِ عقیدت فرماتے کہ اگر کوئی مسلمان مرد یا مسلمان عورت غایت آداب طہارت اور پاکیزہ جگہ پر رو بقبلہ بیٹھ کر اس کے اضراب یعنی آٹھ ضرب حسبِ

دستور پڑھے یہ کہ سوموار سے سوموار تک اضراب مکمل کرے تو یقیناً حضور سرور کائنات، فخرِ موجودات آخرالزمان حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کا اسے جاگتے ہوئے دیدار نصیب ہوگا، ورنہ اللہ تعالےٰ اسے بذریعہ خواب حبیب پاک علیہ الصلوۃ والسلام کی زیارت نصیب کرے گا اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کی ادائیگی میں کمی ہوگی اور اس حالت میں بھی انشاءاللہ وہ اپنی موت تک کسی نہ کسی طرح حضور ﷺ کا دیدار پائے گا۔

فرمایا۔ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی وہ امانت کبریٰ ہیں، جن کا نور ہر زمان و مکان میں بفضل اللہ موجود ہے۔ اس میں شبہہ نہ کرنا چاہیے۔ در حقیقت اس قسم کے عقلی شبہات ہی حائل دیدار پرانوار ہوتے ہیں۔ حضرت والد بزرگوار ادعیہ ماثورہ کے پابند تھے۔ آپ ان تمام اوراد و وظائف کے اجازت یافتہ تھے، جن کی تکمیل سلوک میں ضرورت درپیش آتی ہے۔ آپ نے ان ریاضات کو بھی پورا کیا جن کے پورا کرنے کی راہ سلوک میں تزکیۂ نفس کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔

راہ سلوک میں وہی سالک کامیابی پانے کا مستحق ہو سکتا ہے جو تمام خواہشات عقلی و نقلی سے قطعاً بیگانہ ہو کرے یگانۂ معرفت ہو جائے اور یہاں تک احتیاط لازمی ہے کہ کوئی صاحب ریاضت کشف و مکاشفات کا لالچ بھی نہ کرے۔ اس واسطے کہ اسلام میں مکاشفات مقصود نہیں ہوتے بلکہ رضاء الٰہی مقصود ہوتی ہے۔ چونکہ مکاشفہ غیر ہے، مقصود نہیں۔ بعض صوفیاء بغرض مکاشفہ تزکیۂ نفس کرنے کی سعی کرتے ہیں اور انہیں انجامِ کار مکاشفہ بھی نہیں مل پاتا۔ جس کی بناء پر وہ مکاشفات کے انکار پر اتر آتے ہیں۔ حالانکہ مکاشفہ کا حصول بربنائے تقویٰ تھا مگر چونکہ اپنی ریاضت کی بنیاد غلط ہونے پر وہ مکاشفہ سے بے بہرہ ہو جاتا ہے۔ یہ مکاشفہ کی غلطی نہیں ہوتی اور نہ ہی خدا کی جانب سے نعوذ باللہ تغافل ہوتا ہے۔ اور نہ ہی کلام الٰہی میں کوئی فرق ہوتا ہے۔ فرق صرف یہی ہوتا ہے کہ سالک جب مرضیات الٰہی سے ہٹ کر مرضیاتِ نفس پر اتر آتا ہے۔ تو سلوک کا باطنی زاویۂ نگاہ

بنیادی طور پر غلط ہو جاتا ہے۔

چونکہ معرفت کا تعلق علیٰ وجہ بصیرت عارفانہ منازل سلوک کو طے کر کے نصابِ ریاضات پورا کر کے اپنے وجود کو ریا، کینہ، کپٹ، حسد و بغض اور فسادات نفسانیہ سے بچا کر مرضیات خدا اور رسول کے مطابق اور مرضیات کتاب و سنت کے مطابق اور مرضیات مرشدین کاملین کے مطابق وجود کو ایسا تربیت یافتہ بنانا مقصود ہوتا ہے، جس طرح ایک سدھایا ہوا سوار سدھائی ہوئی سواری پر منزلِ مقصود کی طرف لگام تھام لے۔ جب چاہے اور جس طرف چاہے لگام موڑ لے، سواری اسی طرف چل پڑے اور سوار و سواری میں کسی غلط تربیت کی بناء پر تصادم واقع نہ ہو۔ اگر سوار تربیت یافتہ ہو اور سواری غیر تربیت یافتہ ہو یا سواری تربیت یافتہ ہو۔ مگر سوار غیر تربیت یافتہ ہو۔ تو کسی طرح بھی رختِ سفر نہیں باندھا جا سکتا۔ نہ منزل مقصود میسر آ سکتی ہے۔ خدانخواستہ ایسی حالت تضاد میں کوئی سفر کرنے پر بضد ہو جائے تو اسے سفر راہ میں سخت خفت اور ندامت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

بالکل بعینہ انسانی روح اپنے جسم کی سوار ہے۔ اور جسم انسانی اپنی روح کی سواری ہے۔ روح ہمیشہ راکب اور جسم مرکب ہوتا ہے۔ اسلامی طرزِ سلوک میں تزکیۂ نفس کا منشاء اسلامی تقویٰ ہے جو روح کی صلاحیتوں کو رفعت انسانیہ کے آسمانوں پر تابناک کرتا ہے۔ جس طرح صاف شفاف آسمان کے ستارے صاف حوض، صاف دریا اور صاف سمندر میں اپنا عکس ڈالتے ہیں بالکل اسی طرح صاف و شفاف روحانیت عالمِ امر سے قلبِ مومن پر اپنا نورانی عکس ڈالتی ہے۔ جس کو اصطلاح تصوف میں واردات عالم امر سے تعبیر کیا جاتا ہے جو بعد میں وارداتِ قلبی بن جاتے ہیں۔

وارداتِ قلبی کا انعکاس طبعِ انسانی پر ہوتا ہے۔ اور طبع انسانی کا انعکاس وجود کی اندرونی صلاحیتوں پر ہوتا ہے اور سب صلاحیتوں کا مجموعی انعکاس انسانی عقل اور دل ونگاہ پر ظاہر ہو کر تحریک باطن کا اظہار کرتا ہے۔ اگر سالک ایسا کرنے سے پہلے

اپنے نفسانی تزکیہ میں کچھ لالچ کر بیٹھے کہ مجھے صاحب کشف و کرامات ہو جانا چاہیے تو اس کا صاف ترجمہ یہ ہو گا کہ وہ لوگوں پر بر سبیلِ کشف و کرامات غلبہ چاہتا ہے اور اس قسم کی حرص و ہوا پیدا وار نفس ہوتی ہے۔

گویا کہ اس نے قرآن مجید کی تلاوت کی اور نماز، روزہ، حج اور زکوۃ ادا کیے۔ تہجد کی نماز ادا کی، نوافلِ اشراق پڑھے۔ اوابین کی پابندی کی۔ ادعیہ ماثورہ ادا کیے اور ان سب کا مصرف خواہش نفسانی پر مرتب کیا۔ بصورت دیگر مطلب و مفہوم یہ ہوا کہ گویا وہ نماز پڑھ کر شراب خانہ میں چلا گیا یا نیک بن کر نیکی کو بدی پر صرف کر رہا ہے۔ روشنی بن کر بجھ جانا چاہتا ہے۔

سلوک کی راہ پر وہی لوگ صاحب کشف و کرامات ہو سکتے ہیں جو کشف و کرامات کو بھی اللہ کی راہ میں نفی کر سکنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ بر سبیل راہ حق ایسے ہی لوگوں کو کشف و کرامات سے نوازا جاتا ہے۔ مگر اہل دل اور اہل نظر کشف و کرامات کو ایزاد رحمت خداوند ذوالجلال سمجھ کر وصول کر لیتے ہیں اور اس کی روشنی میں مزید راہِ حق تلاش کر لیتے ہیں، جس سے ان پر ہدایت کی باریکیاں واضح ہوتی رہتی ہیں اور وہ اللہ تعالٰے کے سچے دوست بن جاتے ہیں۔ اور ان کی دوستی کی راہ انبیاء و صدیقین، شہداء و صالحین کی راہ سے مختلف نہیں ہوتی۔

اگر کوئی ان کی راہ سے مخالف کسی دوسری راہ کو راہ سلوک بنانا چاہے تو کروڑہا برس میں بھی وہ راہ سلوک کی ایک جھلک تک بھی دیکھنے کا مجاز نہیں ہو سکتا۔ ایسا شخص عملیات کا عامل کہلا سکتا ہے مگر مرد کامل نہیں بن سکتا۔ بس عامل و کامل میں زمین و آسمان کا فرق ہے کہ خلاف اسلام مخترع تصورات پر تو کوئی غیر مسلم بھی عمل کر کے عامل کہلا سکتا ہے اور شعبدہ بازوں میں شمار ہو کر صاحب استدراج بن سکتا ہے۔ مگر ایسے عامل پر متقی سالکِ راہ کا قطعاً اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگوں کو ولی اللہ کہنا بھی جرم ہے۔

سلوک عملوا الصلحت سے ماخوذ ہے جس کا تعلق اسلامی شعائر سے ہے اور اس

میں کسی قسم کی داخلی یا خارجی تاثیرات تسخیر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نیک کام کی انجام دہی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تعمیل احکام کے ضمن میں آتی ہے۔ اس کے سوا جتنے عمل بھی کیے جائیں۔ وہ سب اسلام کے خارجی اور اختراعی عملیات ہیں ان سے مراد نفسانی خواہشات اور تکمیل اغراضِ نفسانی کے سوا کچھ نہیں۔ اسلام میں ان عملیات پر عمل کرنے کی کوئی اجازت نہیں۔ ایسے لوگ تضیعِ اوقات کرتے ہیں۔ لوگوں کو توہم پرست بناتے ہیں۔ اور گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایک گناہ خلافِ اسلام اختراعی عملیات پر یقین کرنا اور اس پر اپنے قیمتی اوقات کو صرف کرنا۔ دوسرا گناہ یہ کہ لوگوں کو اختراعی عملیات کے ذریعے توہم پرست بنا کر اسلامی اعمالِ صالحہ سے ان کو غافل کرکے دور رکھنا۔ اس طرح یہ عملیات بدعت شنیعہ بن کر قوم میں سستی، جہالت، غفلت شعاری، تن آسانی اور توہم پرستی وغیرہ پیدا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں۔

علمائے سلف صالحین اور صوفیائے سلفِ صالحین نے قرآن مجید کے جزو کل کو شفاء امراض کے لیے استعمال کیا۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔

یعنی ہم نے قرآن مجید کو من کل الوجوہ اہل ایمان کے لیے روحانی اور جسمانی شفاء کی صورت میں نازل فرمایا۔

اس آیت کی روشنی میں دلیل کے طور پر کلام الٰہی کو اور انبیاء و مرسلین کے اوراد وظائف کو نیز اسمائے الٰہیہ کے ساتھ بیماروں کو دم کرنا پھونکنا، اور لوگوں کے لیے اللہ کے حضور اقدس میں گڑگڑا کر دعا مانگنا وغیرہ جائز امور ہیں۔ اور حضور ﷺ کا کلامِ الٰہی کے ساتھ اور اسمائے الٰہیہ کے ساتھ دم کرنا، پھونکنا اور دعائے خیر کرنا کتاب اللہ اور کتاب رسول اللہ سے ثابت ہے اس کے بعد ان کی تقلید و اطاعت میں خلفائے راشدین اور اصحابِ کبار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا دم کرنا پھونکنا اور دعاء کرنا اور سلسلہ وار تابعین، تبع تابعین اور علمائے صالحین اور

اولیائے صالحین کا بوقت ضرورت ان طریقوں پر عمل پیرا ہونا اور جمہور علمائے امت کا اس پر عمل جاری رکھنا تمام متقی علماء و اولیائے متقدمین کی تقلید و طریقت کتاب و سنت کی پیروی تھی اور اس طریقت پر چلنے کا نام اسلامی اعمالِ صالحہ کے تاثیرات کے ساتھ تبلیغِ دین ہی مراد تھا۔ نہ کہ جلب منفعت یا تشہیر نفسی۔

ان صالحین کی ہر ادا، چاہے وہ قولی تھی یا فعلی، چاہے ان کے احوال سے متعلق تھی، سب کا منشاء ایک ہی تھا وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی شفاء و ہدایت دینے پر قادر رہے۔ جب تک کوئی مومن اللہ و رسول کا فرمانبردار نہ ہو گا۔ اس سے فیوض و برکات بصورت کرامت سرزد ہونے محال ہیں۔

کرامت کا اطلاق اسلامی تقویٰ پر ہوتا ہے۔ خلاف تقویٰ کوئی عمل بھی کرامت نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں میں جب سے عجمی تصوف نے رواج پکڑا اور ان میں مجہول قسم کے صوفیوں نے جنتر منتر وغیرہ کو اپنے معمولات میں داخل کر لیا تو یہ سب کے سب ناجائز ہو گئے۔ یہ وہ نام نہاد صوفی تھے۔ جو علوم اسلام سے بے بہرہ ہونے کی بنا پر اسلامی اوراد و وظائف اور اعمال کے حصول میں ناکام تھے۔

انہوں نے غیر مسلمین کے جنتر منتر اور مسمریزم قسم کے عملیات کو اپنایا اور بظاہر نماز و روزہ کے پابند ہو کر اظہار تصوف کرتے رہے۔ اور بباطن ہندوؤں، سادھوؤں کے بتائے ہوئے مروجہ جنتر منتر کو استعمال میں لاتے رہے۔ اور اپنی جاہل اولادوں اور ہم نشینوں میں ان کو نافذ کرتے رہے۔ جو ان کے مرنے کے بعد بھی نسلاً بعد نسل رواج پکڑتے گئے۔

اکثر جاہل لوگ ان طریقوں کو جادو وغیرہ پر محمول کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں لفظ جادو نے ان ہی توہمات پر رواج پکڑا حتیٰ کہ رحمانی قسم کے تعویزات اور رحمانی قسم کے معمولات کو بھی جادو پر محمول کرنے لگے یہاں تک بھی دیکھا گیا کہ بڑے بڑے ولیوں کے پاس جانے والے لوگوں کو بھی متہم کیا جانے لگا کہ وہ ولیوں کے پاس جا کر جادو کراتے ہیں۔ حالانکہ ولی اور جادو اس طرح دو متضاد چیزیں

ہیں جس طرح کفر اور اسلام آپ میں متضاد ہیں۔ اسلام کے فیصلوں کے مطابق جادو کرنے والا اور کرانے والا دونوں کافر ہیں۔ تو پھر کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ولی اللہ جادو گر ہو سکتے ہیں ولی اللہ کا جادو کرنا محال ہے۔ اگر وہ جادو کر بیٹھے تو وہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور پھر اس پر ولی اللہ ہونے کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ اس واسطے اہل سنت والجماعت کے لیے لازم ہے کہ وہ اولیاء اللہ کو جادو گروں میں شامل نہ کریں۔ بڑے بڑے مشہور پیرانِ عظام کو اس شک کی نگاہ سے دیکھنا بہت بڑا گناہ ہے ہمیشہ کافروں کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ انبیاء و مرسلین کو جادو گر کہتے تھے۔ جس کی اللہ تعالیٰ نے تورات، انجیل، زبور فرقانِ حمید اور دیگر صحائف سماویہ میں سخت مذمت فرمائی اور ایسے لوگوں کے لیے عذاب جہنم کی وعید سنائی۔

چونکہ غیر مسلمین ان مخترع عملیات کو اپنا اکتسابی علم سمجھتے ہیں۔ مگر ہمارے اسلاف علمائے صالحین نے ہر میدان میں ایسے مصنوعی صوفیوں کا اسلامی تصوف کے ساتھ مکمل اور باقاعدہ ردِ عمل کیا۔ ورنہ برصغیر کے مسلمانوں پر جس طرح ساہو کارانہ سود نے تسلط جما لیا تھا۔ اس طرح ہندو قوم کے اس سادھو آنہ ازم کا بھی تسلط ہوتا اور مسلمان بھی سادھو بن جاتے تھے۔

حضرت خواجہ غریب النواز اجمیری علیہ الرحمتہ سے لے کر جملہ اکابر علمائے صالحین سے اس وقت تک کے صاحب علم و فراست متقی اصفیائے امت نے اپنے متقیانہ کردار سے اسلامی کرامات کا جس انداز عالمانہ کے ساتھ اظہار فرمایا۔ ان صالحین کی کراماتِ اسلامیہ بالکل اسی طرح نمایاں ہو کر سامنے آتی رہیں۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے معجزۂ پاک سے اختراعی عملیات کے سانپ عصائے موسوی نے چاٹ لیے تھے

اور استدارج فرعونیہ اس معجزہ سے لرزہ براندام ہو کر مسترد اور نابود ہو گیا تھا۔

ہمارے اسلاف نے یا تو آیات قرآنیہ کو جو مناسب حال تھیں، با اجازت مرشدینِ طریقت دم کے لیے استعمال کیا یا تعویذات لکھے۔ یا پھر احادیث شریفہ کی روشنی میں اولیائے امت کے تجربہ میں آئی ہوئی دعاؤں پر عمل کیا۔ ان کی دعائیں ان کے اوراد و وظائف ان کے دم ان کے جملہ تعویذات، کتاب و سنت کی روشنی میں عمل میں لائے گئے تھے۔ بعض آیات طویلہ کے اعداد سے چھوٹے قسم کے تعویذات بصورت نقش بھی جاری کئے گئے تاکہ وہ بہت بڑے تعویذ نہ بن جائیں۔

سورۂ اخلاص کی تکسیر، سورۂ فاتحہ کی تکسیر سورۂ یٰسین کی تکسیر، سورۂ مزمل شریف کی تکسیر اور بعض بڑی بڑی صورتوں کی تکسیر طرقِ اربعہ سب سے منقول و مروج ہے۔

اسماء صفاتِ باری تعالی کی تکسیر بالعدد اور اسمائے رسولِ کریم علیہ الصلوۃ والسلام کی بالعدد تکسیر پر حضرت مخدوم علی شاہ صاحب سوہاوی رحمتہ اللہ علیہ کا بڑا عبور تھا۔ آپ نے بڑے تزکیہ و ریاضت کے بعد ان کو حاصل کیا تھا۔ جن کی اجازت ہمارے خاندان میں عملاً جاری ہے۔ اس قسم کے تمام اسلامی اور ادو وظائف اور دعاؤں اور تعویذات اور دم و درود کرنے کی اجازت عرب و عجم میں مروج ہیں۔ میرے والد بزرگوار کو طرقِ اربعہ سے ان اوراد و وظائف اور اسلامی تعویذاتِ کی اجازت تھی اور یہ سلسلہ ہمارے اجداد سے بھی تواتر کے ساتھ جاری رہا۔

حضرت فقیر اللہ صاحب بکوٹی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی والد بزرگوار کو ایسی بیش بہا اجازات عنائت کر رکھی تھیں۔ چنانچہ مجھے اپنے والدین کی طرف سے گیارہ فیوضات، جو انہیں اپنے اسلاف سے سلسلہ وار ملے تھے، ان کی مجھے اجازت دی گئی۔ بقول ان کے یہ اجازات نادرہ ہیں اور سینہ بسینہ چلی آنے والی ہیں۔ مجھے اپنے والدین کی اسلام پسندانہ طریقتِ اسلامیہ کا نہایت سادگی اور فروتنی سے اپنے دامنِ فقر میں محفوظ رکھنے کا طریقہ نہایت پسند خاطر ہوا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو دیندار رکھنا اور طریقت کی مذہبی روایات کے ساتھ رکھنا میرے لیے ایک عظیم تدریسِ دین کا کام سرانجام دے رہا تھا۔

مجھے والدین نے ہمیشہ ایسے تصوف سے اجتناب کی ہدایت کی جو دین کے خلاف ہو۔

# چودھواں باب

## والد بزرگوار کے دینی مشاغل

والد بزرگوار کو اپنی پوری عمر میں تین قسم کے جلیس میّسر آئے۔ ایک وہ لوگ جو آپ کے بچپن کے ساتھی یعنی ہم عمر تھے۔ دوسرے وہ لوگ جو آپ کے زمانۂ رشد وہدایت میں جوان ہوئے۔ تیسرے وہ لوگ جو آپ کی آخری عمر میں جوان ہوئے۔

یہ تینوں قسم کے لوگ کچھ ہم وطن اور کچھ دور دراز علاقوں کے رہنے والے بھی تھے۔ موضع دیول شریف میں آپ نے ہمیشہ امامت وخطابت کے فرائض انجام دیئے۔ یہ سلسلہ دیول شریف میں دادا جان سے شروع ہوا۔ آپ نے جب دیول شریف میں بغرضِ تبلیغ دین سکونت اختیار فرمائی تو ساتھ ساتھ امامت وخطابت کو ہی ذریعہ تبلیغ بنایا۔

چونکہ ایک عالم دین کے لیے اس سے بہتر کوئی دوسرا مشغلہ زیبا نہیں ہو سکتا۔ بڑی محبت و پیار سے میرے دادا جان اور میرے والد بزرگوار نے اس فریضۂ دینی کی انجام دہی کی اور ساتھ ساتھ اپنے روحانی فیوض و برکات سے بھی عوام و خواص کو فیضیاب کرتے رہے۔ آپ کی مجلس سے فیضِ اول پانے والے وہ لوگ تھے جو آپ سے کم عمر تھے۔ اور آپ کے ہم عمر لوگ تقریباً سارے ہی مذہب پسند تھے اور نماز روزہ، حج و زکوٰۃ کے پابند تھے۔ ان میں سے اکثر لوگ روسائے دیول شریف تھے۔ یہ

لوگ بڑی صفات کریمانہ اور شجاعت عظیمانہ کے پیکر تھے۔ جن کی تاریخ کے لیے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہو گی۔

مجلسِ ثانی، جو آپ کو رشد و ہدایت کے متوسط زمانہ میں ملی یہ پہلے لوگ اور مجلس، جدید تعلیم سے روشناس ہو کر سامنے آئے۔ مگر اسلاف کی روایات پر سختی سے کار پابند ہونے کی بناء پر آپ کی مجلسِ عالمانہ و عارفانہ سے باقاعدہ اکتساب فیض کرتے رہے۔

مجلس ثالث میری ہم زمانہ تھی جو مزید جدید رجحانات سے آراستہ ہو کر سامنے آئی۔ مگر یہ مجلس بھی اپنی روایات کی پابند ہونے کی بناء پر والد بزرگوار سے مانوس رہی اور ان سے پندو نصائح سنتی رہی اور حضرت والد بزرگوار کے اخلاقِ کریمانہ سے بے حد متاثر ہوئی۔ اس مجلس کے افراد بڑے بڑے عہدوں پر فائز المرام ہوئے۔ یہی تین قسم کی مجالس آپ کے وصال مبارک کے بعد میرے حصہ میں بھی آئیں۔

پہلے بزرگوں سے جو حضرت والد بزرگوار کے ہم عصر تھے، ان میں سے زیادہ لوگوں کی زیارت کرنے کا مجھ عاجز کو بھی شرف نصیب ہوا۔ ان سب بزرگوں نے مجھ سے بڑی مروت اور تلطف کا برتاؤ کیا۔ ان کو دیکھ کر مجھے والد بزرگوار کی یاد تازہ ہو جاتی۔ ان لوگوں کا تلطف میری ذاتی پریشانیوں میں ایک مسیحائی کا کام سر انجام دیتا تھا۔ میرے حوصلے بلند ہو جاتے اور میں اپنی ریاضتوں میں اور زیادہ مصروف ہو جاتا۔ خدا ان سب کو غریقِ رحمت کرے۔ یہ سب لوگ والد بزرگوار کے جلیس خاص تھے۔

ان میں سے چند بزرگ ابھی تک اپنی گونا گوں برکتوں کے ساتھ بقیدِ حیات ہیں۔ اور سرزمین دیول شریف پر اپنی شفقت و رافت کے

ساتھ نئی پود کو توانائی بخش رہے ہیں۔ یہ لوگ دیول شریف کی عظمت کا نشانِ باقیہ ہیں۔ میرے ہم عمر نوجوان طبقہ نے اپنی روایات کے مطابق میرا ساتھ ہر منزل سلوک میں اس محبانہ اور مخلصانہ طور پر دیا جس کو میں اپنے راہ سلوک میں بنیادی تائید سمجھتا ہوں۔ حتیٰ کہ دیول شریف کے ہر خورد و کلاں صغیر و کبیر نے میری پوری پوری حوصلہ افزائی کی۔ جس کو میں فضلِ الٰہی سے تعبیر کرتا ہوں۔

والد بزرگوار ہمیشہ دوران کلام فرمایا کرتے کہ اہالیان دیول شریف کو پروردگار عالم نے بڑی خوبیوں اور خصوصیات مفکرانہ سے نواز رکھا ہے اور اس زمین کی مٹی بھی اکسیر ہے۔ یہاں کی آب و ہوا دل آویز ہونے کے علاوہ روحانیت کو شگفتگی اور شیفتگی بخشتی ہے۔ ایک دفعہ فرمایا۔ ارضی جغرافیائی کیفیت اور سلسلوں نے اسے کثیر خوبیوں کی بناء پر مرکزیت کا مقام دے رکھا ہے۔ ان خوبیوں میں ایک واضح خوبی یہ ہے کہ یہاں کہ بسنے والے لوگ بڑے غیور، حمیت پسند، مردم شناس، اعلیٰ معیشت کے مالک ہیں اور بڑے ذکی الحس اور دانا قسم کے لوگ ہیں۔ ہزارہ، مری اور آزاد کشمیر کے عباسیہ خاندان، قوم ڈھونڈ کا مرکزی اور اصلی مقام دیول شریف ہے۔

فرمایا بکوٹ شریف سے لے کر دیول شریف تک اور پوٹھہ شریف سے دیول شریف تک اور موہڑہ شریف سے دیول شریف تک، کوہالہ سے دیول شریف اور مری سے دیول شریف کی منازل کم و بیش برابر ہیں۔ کوئی وقت ایسا آئے گا کہ ابنائے دیول شریف کا بخت سکندری دیول شریف کو اپنی تاریخ میں ایک عظیم مقام دے گا۔ بیں

الاقوامی شہرت کے مالک سر اٹھائیں گے اور دیول شریف پہاڑ کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہو گا۔ یہاں سے ہر صدی میں اس پایہ کے اہل دانش پیدا ہوا کریں گے۔ جن کی شہرت دور دراز تک پہنچے گی۔ اہل دیول میدانِ رزم و بزم، دونوں میں ید طولیٰ حاصل کریں گے اور ہر شعبۂ زندگی میں اپنی نمایاں تاریخ مرتب کریں گے۔ فوجی فوج میں ید طولیٰ پائیں گے۔ سیاسی لیڈر سیاست میں اعلےٰ مقام حاصل کریں گے۔ یہاں کے ایک معمولی ذہن کے آدمی میں بھی قیادت کا مادہ موجود رہے گا۔ یہ لوگ معاملہ فہم اور صلح جو ہوں گے۔ ان کی باہمی خصوصیات ان کے لیے اعلیٰ صبح و شام لائیں گے۔ ان کا مستقبل تابناک ہے۔

فرمایا۔ پہلے بزرگ اپنی اعلیٰ خصوصیات کی اس قدر پائیدار بنائیں قائم کر گئے ہیں جن میں تزلزل نہیں آئے گا۔ چونکہ ان لوگوں نے یہ بنا نے تہذیب اسلامی تقویٰ اور خاندانی حمیت پر رکھی ہے۔ اور جس تہذیب و تمدن کی اساس اسلامی تقویٰ اور خاندانی شرافت پر رکھی جائے۔ وہ دیرپا ہو کر رہتی ہے۔

دیول شریف عقل و دانش اور علم و عرفان کا بہتا ہوا چشمہ ہے۔ یہ دیول شریف کے ایسے صفات ہیں۔ جنہیں ہر دور میں نمود حاصل ہو گی۔ اس طرح دیول شریف کی تاریخ اعلیٰ اخلاقی قدروں کے ساتھ پھلتی پھولتی رہے گی۔ دیول شریف کی مذہبی، ملی، سیاسی، اقتصادی تاریخ بین الاقوامی شہرت کی حامل ہو گی۔

ایک دفعہ فرمایا۔ کہ میرے پاس اچانک ایک مرد خدا کشمیر کی طرف سے بصورت مہمان ایک دن اور ایک رات کے لیے قیام پذیر

ہوئے۔ ان کی آنکھوں میں نور عرفان تھا دبلے پتلے وجود والے اس مردِ خدا نے فرمایا۔ کہ میں الہاماً آپ کے پاس آیا ہوں۔ اور آپ سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ میں حضرت فقیر اللہ بکوٹی رحمتہ اللہ علیہ سے مل چکا ہوں۔ میں نے عالم مکاشفہ میں دیول کا مرتبہ بلند و بالا دیکھا ہے۔ میں آپ کی پیشانی میں نور عرفان کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ میں نے دیول شریف کے محراب و ممبر میں ایک ہمہ گیر نور پایا ہے۔ میں نے دیول کو دیول شریف کی صورت میں پایا۔ میں نے دیول کے لوگوں کو آسمانِ عزت کے ستاروں کی صورت میں درخشندہ اور تابندہ دیکھا ہے۔ یہاں کی سرزمین میں بڑے بڑے اولیا اللہ مدفون ہیں جن کا نور آفتاب و مہتاب کی طرح چمکتا ہے۔ ان میں اکثر بڑے مرتبے کے اولیاء اللہ ہیں اور بعض قطبیت کے مقام تک اور بعض نے غوثیت تک رسائی حاصل کی۔ میں نے کچھ تامل سے جواب دیا کہ بفضل اللہ میں ان حقائق پر اطلاع رکھتا ہوں اور آج مزید تصدیق ہو گئی ہے۔ شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔

اس کے بعد وہ صاحب عالم استغراق میں گم ہو گئے۔ جب ذرا سکون پایا تو حمد باری تعالے بیان کی اور درود پاک کی تلاوت فرماتے ہوئے دعاء شروع کی کہ اے اللہ تعالے میں ان پہاڑوں میں بسنے والوں کے لیے تجھ سے بوسیلہَ دیول شریف دعائے خیر مانگتا ہوں۔ اے اللہ بتصدیقِ سرزمین دیول شریف میرے گناہ معاف فرما۔ میرا انجام بالخیر فرما۔ یہاں کہ لوگوں اور ان کی اولادوں اور ان کی نسلوں کو ابدالآباد تک شاداں و فرحاں فرما۔ اس پہاڑمیں بسنے والے لوگ دائمی عزت و آبرو پائیں۔ ان کو ارضی و سماوی آفات سے نجات دے۔

والد بزرگوار نے فرمایا کہ میں نے اس بزرگ سیرت مردِ خدا کی زبان سے پہلی مرتبہ دیول کے نام کے ساتھ شریف کا نام سنا۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی اور میں نے استفساراً پوچھا۔

فرمایا۔ دیول کو دیول شریف ہی کہنا چاہیے تھا۔ مگر اس کی شرافت کے اظہار کے لیے جس دلیل کی ضرورت ہے وہ اس کی گود میں پیدا ہو گی۔ جس کی بنا پر یہ دور دراز تک شریف کہلائے گا۔ فرمایا یہ سرزمین عجوبہ روزگار ہے۔ اور اگر میں دوسرے امور پر مامور نہ ہوتا۔ تو اس سرزمین کو اپنا دائمی مسکن بنالیتا۔ کتنے خوش بخت ہیں وہ لوگ جو اس زمین کے مکین ہیں۔ صبح جب رخصت ہونے لگے تو تھوڑی سی مٹی لے کر اپنے دامن میں باندھ لی۔ اور فرمایا۔ اس مٹی کو میں حصولِ برکت کے لیے ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا۔ خدا کرے کہ یہ مٹی میری قبر میں میرے ساتھ جائے۔ اور اپنی مبارک نظریں اٹھا کر سارے پہاڑ پر دوڑائیں۔ اور سارے پہاڑی علاقہ اور اس کے دشت و جبل کو سلام کیا۔ اور رخصت ہو گئے۔

آج تک وہ فقیر میرے دل میں آباد ہے اور اس کی یہ التفات آمیز باتیں میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ حضرت والد بزرگوار اور حضرت والدہ بزرگوارہ جہاں صاحبِ علم و عمل، صاحب اتقا اور صاحبِ فہم و فراست تھے، اور دوسری گونا گوں صفات دینیہ کے حامل تھے وہاں یہ دونوں پاکباز ہستیاں اپنے دامنِ عفیف میں کشف و کرامات جیسے بزرگانہ صفات بھی رکھتے تھے۔ جن کا میں بگوش و ہوش گواہ ہوں۔ مگر ان کرامات و مکاشفات کا بہت کم اظہار کرتے تھے۔

چونکہ اس کتاب کے ذریعہ مجھے اپنے وطن، اپنے والدین کا اور

اسلامیات کے ان معارف کا تعارف کرانا مقصود ہے۔ جو میرے لیے ذریعۂ سلوک بنے اور مجھ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ میں اپنے منبع و مصدر کی تعریف تاریخی طور پر لکھوں لہذا میری مقدور بھر یہی کوشش ہو گی کہ جو کچھ مجھے صحیح یاد ہے، اس کو من و عن ضبط تحریر میں لاؤں اور ہر قسم کی مبالغہ آرائی سے بچ سکوں۔ نیز یہ کتاب ابنِ عبداللہ کے نام سے میرے والد بزرگوار کے نام پر میری پہلی اساسی جنبشِ باطن ہے۔ اور میں نے اپنے والد بزرگوار جن کا نام مبارک محمد عبداللہ تھا۔ اور میں عاجز ان کا فرزند ہوں لہذا اسی نسبت پدری کے اسم مبارک کے ساتھ اس کتاب کا نام ابنِ عبداللہ دیولی رکھا۔ یہ میرے لیے باعث خیر و برکت ہو گا۔ نیز اس نام کی وجہ تسمیہ میرا ایک خواب بھی جو اس کتاب کے پیش لفظ میں ہے۔ مذکور ہے

نیز یہ کتاب دیول والوں کو اپنے سابقہ جلیل القدر سالک راہَ حقیقت و فاضل دین اور بزرگ سیرت، عالم و پیشوائے دین کی یاد تازہ کرنے کا ذریعہ بن سکے گی۔ آنے والی نسلیں اس پر خوشی پائیں گی اور دعائے خیر سے یاد کریں گی۔ میرے والد بزرگوار کا طرہ امتیاز یہ تھا کہ آپ نے پوری زندگی دیول شریف کی جامع مسجد میں خطابت کے فرائض انجام دیئے۔ وہ ایک فقیر، ایک عارف باللہ درویش اور ایک عظیم عالم دین تھے۔

# پندرہواں باب

## خوارقات قولی و عملی

میں تقریباً سات یا آٹھ سال کی عمر میں تھا۔ ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ والد صاحب مجھے سورۃ مزمل شریف کی اجازتِ خاص دے رہے ہیں اور والدہ بزرگوارہ چاندی کے برتن میں مجھے دودھ پلا رہی ہیں اور ساتھ ساتھ باآواز بلند درود پاک تلاوت فرما رہی ہیں۔ پھر میرے سینے کو حضرت والد بزرگوار نے اور ان کے بعد حضرت والدہ بزرگوارہ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے تھپکایا اور دعاء کی کہ اللہ تعالے ہمارے اس غریب بیٹے کو اپنا بندہ بنا اور اسے صاحب دین و عرفان بنا تاکہ یہ ہماری عاقبت میں ذریعہ نجات ہو۔ دنیا و عاقبت کی سند بھی ہو اور ذریعہ نجات بھی ہو۔ یہ دعا فرماتے اور ساتھ ساتھ مبارک آنسو بہا بہا کر بار بار اسی دعا کا تکرار فرماتے۔ صبح کو جب میں بیدار ہوا تو چائے پینے کو بعد وہی باتیں زیرِ بحث آئیں۔ جو میں نے خواب میں دیکھی تھیں۔

والد بزرگوار میری والدہ کو مخاطب فرماتے ہوئے فرمانے لگے کہ میرے پاس سورۂ مزمل کی وہ خاص برکتیں موجود ہیں، جن کو میں نے حضرت مخدوم علی شاہ صاحب سوہاوی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا اور اس کی نیک تاثیرات میرے سینے میں ایک گنجِ مخفی کی صورت میں موجود

ہیں۔ میری تمنا ہے۔ کہ وہ میں اپنے اس بیٹے کو تفویض کر دوں۔ زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو ہمیشہ کے لیے مجھے سخت ملال ہو گا۔ ابھی تو یہ بہت کم سن ہے اگرچہ یہ اس اجازت پر عملاً پورا اترنے کے قابل نہیں۔ تاہم اس سورہ پاک کی اجازت تو دی جا سکتی ہے۔ ان عطایات کا شائد متحمل نہ ہو سکے تاہم اس سورہ پاک کی اجازت تو دی جا سکتی ہے۔ اس میں چند نکتے ہیں۔ چند راز اور چند لطائف ہیں جن کو یہ آسانی سے یاد کر سکتا ہے۔ پھر فرمایا اگر چاندی کا برتن مہیا ہو سکے تو اس میں دودھ ڈال کر سورہ مزمل شریف پڑھ کر دم کر کے قبل از اجازت اس کو اگر پلا دیا جائے تو اس کا سینہ اس اجازت کا متحمل ہو سکے گا۔

آپ کا یہ فرمانا ہی تھا کہ حضرت والدہ ماجدہ اٹھیں اور لکڑی کے ایک پرانے بکس سے ایک چاندی کی چھوٹی سی کٹوری لے آئیں اور تازہ وضو کرنے کے بعد اس کو گرم پانی سے تین بار دھویا۔ پھر کلمۂ تمجید پڑھتے ہوئے اس میں نیم گرم دودھ ڈال کر حضرت والد بزرگوار کے ہاتھ میں درود شریف پڑھتے ہوئے پیش کیا۔

حضرت والد بزرگوار نے سورۂ مزمل پڑھ کر اس پر دم کیا۔ اس کے بعد والدہ ماجدہ نے بھی دم کیا اور مجھے قبلہ رو بیٹھ کر دورد شریف کے ساتھ پینے کی تلقین فرمائی۔ مجھے اس سے قبل مکمل وضو کرنے اور پاک لباس پہننے کی تلقین فرمائی گئی تھی۔ میں باوضو اور ایک سادہ سے پاک لباس کے ساتھ حسب الارشاد منتظر تعمیل تھا۔ چنانچہ میں نے حسب الارشاد دو زانو رو بقبلہ بیٹھ کر درود پاک کی تلاوت کی اور تیسرا کلمۂ تمجید پڑھا اور چاندی کے کٹورہ کو دائیں ہاتھ میں پکڑا۔

فرمایا دونوں ہاتھوں سے پیالہ تھام کر تین دفعہ اعوذ باللہ اور بسم اللہ کے ساتھ اس کو نوش جاں کر لو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ جب دودھ پی چکا۔ تو مجھے چارپائی پر لیٹ جانے کی تلقین فرمائی گئی میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ پہلے حضرت والد بزرگوار نے تین مرتبہ اپنے دست راست سے میرے سینہ کو تھپکایا۔ اس کے بعد حضرت والدہ ماجدہ نے بھی اپنے دستِ راست سے میرے سینہ کو تین مرتبہ تھپکایا۔ اس کے بعد میرے لیے وہی دعا فرمائی جو میں نے گذشتہ رات عالم خواب میں سنی تھی۔ اسی خواب والی رات کی پہلی صبح کو میری خواب کی تعبیر کا من و عن عملاً سامنے آنا یقیناً میرے لیے ایک عجیب و غریب واقعہ تھا۔ جس نے میری روح پر اپنے بزرگ والدین کے لیے والہانہ عقیدت کی راہ کھول دی۔

اگرچہ میں اپنے اظہارِ عقیدت کے لیے اپنے پاس متاع الفاظ یا متاع گفتار میں کم مایہ تھا اور اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح نہ کر سکتا تھا۔ جس کی ادائیگی کوئی صاحبِ کلام کر سکتا ہے۔ مگر میرے دل کے خفی جہانوں میں اپنے والدین کے لیے عقیدت اس طرح طلوع ہو گئی۔ جس طرح مطلع تاباں سے آفتاب طلوع ہو کر دنیا کو بقعۂ نور بنا دیتا ہے۔

میرے دل نے پہلی مرتبہ اپنے والدین کے متعلق صحت مندانہ عقیدت کی روشنی پائی۔ جو قلب و نظر پر ثبت ہو گئی۔ جس نے میری روح میں دینی انقلاب پیدا کیا اور مجھے اسلامی تعلیمات پر عملاً تقویٰ حاصل کرنے کے عملی نتائج سے میدانِ بندگی میں قدم رکھنے کا موقع فراہم کیا اور مجھے ایمان و ایقان کی دولت سے بہرہ ور کیا۔ اس کے بعد والدین نے مجھے نصیحت فرمائی۔ کہ ابھی تم کم سن ہو۔ صرف تمہیں سورۂ مزمل کی اس کے

چند باریک نکاتِ عارفانہ کے ساتھ اجازت دی جاتی ہے۔ الحمد اللہ۔ کہ اس تفویض پر تمہارے جسم و جان میں استقامت برقرار رہی۔ ورنہ اس کی تفویض بدن کو رعشہ براندام کر دیتی ہے۔

فرمایا۔ جب تمہاری عمر بیس برس سے اوپر ہو گی تو اس وظیفہ پاک پر بطریقِ سلوک عمل پیرا ہو کر اس کی تکمیل کرنا اور اس سے پہلے کہ تم اس پر عمل پیرا ہو کر کامیاب نہ ہو جاؤ۔ اس کو اپنے سینہ میں ہی مخفی رکھنا۔ تاکہ یہ امانت بحفاظت تمام تمہارے کام آسکے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں متقیانہ سلوک سے ہمکنار کر سکے۔

فرمایا۔ اگر اطاعت دین سے رو گردانی کرو گے تو اللہ تعا۔ لے تم سے یہ امانت چھین لے گا اور قبل از وقت اس کا راز فاش کرو گے تو بھی اس کے ضائع ہو جانے کا احتمال ہو گا۔ پھر نصیحت فرمائی۔ کہ اگر زندگی نے وفا کیا تو سلسلہ وار وہ جملہ تفویضات جو ہمیں چشتی، قادری نقشبندی طریقوں سے اور اپنے اَبّ و جدّ سے ملی ہیں، انشاء اللہ تمہیں ان کی اجازت ملتی رہے گی۔

پھر فرمایا۔ دنیا کی زندگی مستعار ہے۔ یہ کوئی کہانی نہیں۔ فی الحقیقت اس دنیا میں ہر مسلمان کو حسب استطاعت اور حسبِ علم و دانش پروردگارِ عالم کی بندگی کے لیے پیدا فرمایا گیا ہے۔ جن مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے حسبِ استطاعت خلوصِ نیّت سے اللہ تعالیٰ کی بندگی کے فرائض انجام دیئے اور قضائے الٰہی سے اپنے وقت موعودہ کے مطابق دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔ وہ ناجی ہیں۔ انہوں نے زندگی کے راز کو پالیا اور وہ کامران ہوئے اور حیاتِ جاوداں کی راحت کو پالیا۔ ان کی جیت

ہے اور عالمِ فانی کی مستعار لذات میں جنھوں نے وقت ضائع کیا۔ وہ نفس شیطان کے ہاتھوں ہار گئے۔

اس کی اجازت کے بعد میں نے اپنی روحانیت میں یوماً فیوماً ارتقا پایا اور تدریجاً میری روح اسلام کی طرف اور احکامات اسلام کی اطاعت کی جانب مائل ہونی شروع ہو گئی۔ میرے خواب بھی نتیجہ خیز ہونے شروع ہو گئے۔ مین اپنے خواب جب بھی والدِ بزرگوار کے سامنے بیان کرتا۔ تو آپ سکوت فرماتے اور تھوڑی دیر بعد فرماتے۔ کتاب و سنت کی موجودگی میں اپنے خوابوں کا سہارا لینا ترک کر دو۔ خواب ظنی ہوتے ہیں اور کتاب و سنت کے حوالہ جات قطعی ہیں۔ قطعی فیصلہ جات ربانی کی موجودگی میں اگر تمہارا ذہن ظنی خوابوں کی طرف مرکوز ہونا شروع ہو گیا تو تم یقیناً توہم پرست ہو جاؤ گے۔ اور یہ توہم پرستی تمھیں اہلِ مساہلہ کی طرح سہل پسند بنا دے گی اور تم شعائر اللہ کی پابندی میں تغافل شعار ہو جاؤ گے۔

فرمایا۔ میں تمھیں خاص نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے خواب زیادہ مخفی رکھو اور اگر کوئی خواب بیان کرنا ضروری ہو۔ تو اسے کتاب و سنت کے پیمانہ میں ماپ لو۔ اگر کتاب و سنت سے اس طرح اجازت ملے کہ خواب لوگوں کے لیے عبرت و موعظت کا باعث ہے۔ تو بغرض ہدایت بیان کرو۔ ورنہ سکوت اختیار کرو۔ یہ اولیٰ ہے۔

آج تک میں نے خواب بیان کرنے میں احتیاط برتی۔ اگر کوئی اچھا خواب نظر آئے تو شریعت کے مطابق کبھی کبھی بیان کر دیتا ہوں۔ مگر والد بزرگوار کی نصیحت کے بموجب میں نے تجربتاً دیکھا، سنا اور اندازہ کیا کہ عام لوگ اتنے زیادہ خواب بیان کرتے ہیں۔ کہ خواب کی وہ عظمت جو

سابقین میں تھی۔ وہ زیادتئ گفتار کی وجہ سے کم ہو رہی ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اچھے خواب باطن کی اچھائی کی علامت ہوتے ہیں۔ اچھے خواب اتقیاء کو آتے ہیں۔ جو نتیجہ خیز بھی ہوتے ہیں اور خوابوں کی تعبیر علمائے صالحین اور عارفینِ باللہ ہی کر سکتے ہیں جو شعائر اللہ کے پابند ہوتے ہیں۔ لہذا جب تک راہِ سلوک کو شریعت حقہ کے مطابق نہ بنایا جا سکے اور علمائے صالحین کا تقرب نہ حاصل ہو سکے۔ اپنی خوابوں پر نہ ہی یقین کرنا چاہیے اور نہ ہی مظنون تعبیر پر اترانا چاہیے۔ اکثر جاہل قسم کے غیر متشرع اور غیر متقی لوگ بڑی پائے کی خوابیں جو بڑے اولیاء اللہ کے شایانِ شان ہوتی ہیں، بیان کرتے ہیں اور پھر اس طرح اندھا دھند تعبیرات کرتے ہیں کہ مارے شرم و ندامت کے اللہ والوں کا جسم خاکی لرز اٹھتا ہے۔ بعض لوگوں نے تو یہ رواج بنا لیا ہے کہ وہ طرح طرح کی خوابیں بیان کرتے ہیں اور پھر ان کی من گھڑت تعبیرات کرتے ہیں۔ جن خوابوں اور تعبیرات کو اگر کسی صالح عالم دین کے سامنے بیان کیا جائے تو یقیناً وہ ایسے خوابوں کو کذب پر محمول کرے گا۔

بعض دفعہ نیک نیت جاہلوں کو بھی اعلیٰ خواب نظر آجاتے ہیں۔ مگر ان کو عام طور پر اپنے خواب بیان کرنے کی اسی واسطے اجازت نہیں دی گئی کہ وہ غلط تعبیرات سے توہم پرست ہو جائیں گے۔ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنے علاقہ کے صالح علماء دین کی طرف رجوع کریں۔ اور اپنے خوابوں کی تعبیر ان سے حاصل کریں۔ وہ اگر مناسب سمجھیں گے تو تعبیر دیں گے۔ ورنہ ان کا سکوت ہی بہتر جواب ہو گا۔

بعض لوگ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دیدار پر انوار کے متعلق

اس طرح عامیانہ خواب بیان کرتے ہیں۔ جس سے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی عظمت خدا داد کی اہانت ہوتی ہے۔ اہل اللہ کے نزدیک ایسا کرنے والے کبیرہ گناہ کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ نبی اکرم علیہ الصلوۃ والسلام کی عام قسم کی اہانت بھی خدا کو کبھی گوارہ نہیں ہو سکتی۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام اپنی حیات طیبہ میں اپنے خدائے برحق کی طرف تمام قسم کے توہمات باطلہ کی تردید کرنے اور پوری انسانیت کو دینِ فطرت کے مطابق ہدایت دینے کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے۔ چونکہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے زمانہ تک راہبوں، کاہنوں، جوگیوں اور مختلف اختراعی عملیات وغیرہ کرنے والوں نے انسانیت میں توہم کو اس قدر رواج عام دے رکھا تھا کہ ایک غریب کی جھونپڑی سے لے کر ایوانِ شاہی تک ان توہم پرستوں کا تصرف و تسلط تھا اور یہ انسانی قلوب و اذہان پر بھوت کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ پہلے نبیوں کی تعلیمات کو ان توہم پرستوں نے کہانیوں کی صورت دے رکھی تھی اور ان کی تبلیغی سرگرمیوں کو اور کریمانہ شفقتوں کو ان کے معجزات و خوارقات وغیرہ کو بھی اپنی توہم پرستی پر محمول کرنا شروع کر دیا تھا۔

سیدالکونین علیہ الصلوۃ والسلام نے ایسے غیر دینی توہمات کی دینِ حق کے ساتھ اسلامی دنیا سے ہمیشہ کے لیے بیخ کنی کر دی تھی۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا کوئی خواب ایسا نہیں۔ جس کو الہام سے خارج سمجھا جائے۔ آپ کے اور جملہ انبیائے کرام کے خواب مِن قبیلِ وحی تھے جن کے ذریعہ انسانی فطری حقوق کی حفاظت ہوتی رہی۔

انبیائے کرام کے خواب رویائے صادقہ کہلاتے ہیں۔ اور قطعی

ہوتے ہیں۔ مگر اولیاء اللہ کے خواب رویائے صالحہ تو ضرور ہوتے ہیں۔ مگر ان پر قطعیت کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ پس اولیاء اللہ کے خواب والہام وغیرہ من قبیل وحی نہیں ہوتے مجہول الخیال لوگ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے دیدار کے متعلق اپنے خواب عامیانہ طور پر جہلا میں بیان کرتے ہیں۔ ان کو چاہیے کہ وہ ایسا خواب علمائے صالحین کے سامنے بیان کریں تاکہ وہ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی تعبیر دیں اور اس کے بعد جو نصیحت کریں۔ اس پر عمل کرنا چاہیے۔

اہل اللہ نے تاکید فرمائی ہے کہ علمائے صالحین کے بغیر خواب کی تعبیر کسی سے نہیں لینی چاہیے۔ خواب بیان کرتے وقت بعض ایسے ذی شعور لوگ بھی مجالس میں موجود ہوتے ہیں۔ جو بار بار کاذبوں کی کذب بیانی سے اس قدر تنگ آچکے ہوتے ہیں کہ وہ ایسے خوابوں وغیرہ کو سننے کے متحمل ہی نہیں ہوتے۔ ایسے بیانات سے ان کی سخت دل آزاری ہوتی ہے۔

آج کے مسلمان پر سب سے بڑا احسان اسی مبلغ کا ہو سکتا ہے جو ذاتی شرافت و نجابت کے قصائد اور رطب اللسانی سے درگزر کرتے ہوئے صرف اللہ و رسول ﷺ کی تعریف بیان کرے اور احکامات الٰہیہ کی روشنی اور سنتِ خیر الانام کی روشنی میں ایسے سادے اور واضح انداز میں عام فہم مسائل دینیہ بیان کرے کہ لوگ ان مسائل کو سمجھ کر توہم پرستی سے بچتے ہوئے دامنِ اسلام میں پناہ لے کر عافیتِ ایمان پائیں۔

خواب اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ مگر محض ظاہری بزرگی کے طالب اختراعی لوگ ہوتے ہیں جو اختراعی خوابوں پر اتر آتے ہیں۔

ایسی مصنوعی اور خیالی خوابوں والی ولایت کا دعویٰ کوئی زید و بکر و عمر بھی کر سکتا ہے مگر حقیقی ولائت کے لیے قرآن و حدیث اور جمہور علمائے امت اور صلحائے امت نے جو جو شرائط عائد کی ہیں ان سے ذرا بھر بھی انحراف اسلامی ولائت اور اسلامی تقویٰ کے خلاف ہے۔

# سولھواں باب

## اہل حال
## کو
## علماء کی نگرانی میں رہنا چاہیے

علمائے امت مختلف اندازِ فکر کے ساتھ توحید و رسالت اور کتاب و سنت کے ترجمان ہیں اور اشاعتِ حق میں شدید ہیں۔ ان کی سخت گیری کو ذریعۂ نجات سمجھنا چاہیے۔

صاحب حال اگرچہ صاحب کرامت ہی کیوں نہ ہو۔ اسے اپنے حالاتِ سلوک میں علمائے ظاہر کی نگرانی میں رہنا چاہیے۔ ورنہ بعض حالات کا دین کے خلاف سرزد ہونے پر اس کا حال عند اللہ بد حال ہو سکتا ہے۔

حال اس وجدان و کیف و استغراق کا نام ہے۔ جو علیٰ منہاج سلوک، فراوانیٔ محبت خدا پر مرتب ہو کر صاحب سلوک کے سہو کو سکر میں بدل دے۔ یعنی اس کے حواس خمسہ کو عارضی طور پر مجذوب کر دے۔ اگر سالک راہ کا سکر اس حد تک پہنچ جائے۔ کہ نماز کا وقت بھی ضائع ہو جائے تو باشریعت سالکین کاملین کے نزدیک ایسا سکر قابلِ مواخذہ یعنی قابل گرفت ہے۔

کاملین کے نزدیک ایسے صاحب سکر کو رجعت الیٰ اولیٰ کرنی چاہیے۔ یعنی پھر از سر نو اس کو ابتداء کی طرف آنا چاہیے۔ ورنہ وہ اپنے اس تار کا نہ

حال پر بضد ہو کر اپنے غلط اور غیر متشرعانہ حال کے ساتھ ترک ارکان کو تعمیل احکامات پر ترجیح دینے کا عادی ہو جائے گا اور انجام کار نہ تو وہ سالک راہ طریقت رہ سکے گا اور نہ ہی مجذوبِ راہ حقیقت وہ بدعت قبیحہ کا شکار ہو کر اسلام اور اس کی سعادتوں سے ہی محروم ہو جائے گا۔

ہر عام و خاص کو علمائے صالحین کی نگرانی سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ وہ صوفیاء جو علماء سے گریز کرتے ہیں۔ یہ گریز ان کی اپنی روحانی کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ سب کے سب علماء حق امت کے محتسب ہوتے ہیں۔ طالبین راہ حق اگر محتسبین سے اعراض کریں گے تو پھر ان کا احتساب کون کرے گا۔ بغیر احتساب کے حرام موت مرنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ احتساب کرنے کا حق تو عنداللہ علمائے امت کو پہنچتا ہے۔ کوئی مخلص سالکِ باللہ احتساب سے اجتناب نہیں کر سکتا۔ محبوب کی منزل کا مسافر راہِ محبوب کے راز معلوم کرنے کے لیے ہر کس و ناکس کی راہنمائی چاہتا ہے اور اس راہنمائی میں تسکین پاتا ہے۔ اور راہِ محبوب سے بھٹک جانے پر ہر قسم کی سخت سے سخت تنقید کو اپنے لیے موجبِ رحمت گردانتا ہے۔ اگر عالم مجاز کے طالبین بھی راہ مجاز میں درِ نیاز تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کسی نرم و گرم آواز کو گراں نہیں سمجھتے۔ تو راہِ حقیقت پر چلنے والے طالبینِ حق اہل علم و دانش لوگوں کی راہنمائی کو بار گراں جانیں تو یقیناً وہ راہ حق کے سالک نہیں ہو سکتے۔ بلکہ محض تلبیس کے طور پر وہ احوال کا تصنع کر لینے والے ہو سکتے ہیں۔ میں نے مختلف اولیاء امت کے تذکروں کی نصیحت پر عمل کرنے کی اللہ تعالٰے سے امداد چاہی حتی الامکان میں نے اس راہ کو احتیاط سے اختیار کیا۔

ہوتا ہے کہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس پر تعبیرات کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ وہ اپنے انسان ہونے کے بعد مسلمان ہونے کا شکرانہ ادا کرے۔

مسلمان کے لیے کلمۂ طیبہ ہی سب سے بڑی نعمت ہے۔ مسلمان کے لیے صرف ایک کلمۂ طیبہ کا نصیب میں آنا اتنی بڑی نعمت ہے۔ جس کا شکرانہ وہ تا بحد قیامت ادا نہیں کر سکتا۔

تحیّات لسانی، تحیات بدنی، اور تحیّات مالی کے ساتھ اگر کسی نے بکمال شکرانہ ادا کیا تو ختمیٔ مرتبت سلطان العالمین علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی ذاتِ ستودہ صفات ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد ادائیگی شکر کا مقام اہل بیت اطہار اور اصحابِ کرام اور مابعد کے متقدمین کے نصیب میں آیا۔ ہم متقدمین کے متقیانہ تشکر کی گردِراہ بھی نہیں بن سکتے۔ پس عاجزی کے ساتھ اپنے پر تقصیر ہونے کا اعتراف کرنے میں ہی سالکینِ حقیقت کی عافیت ہے۔ کہیں بھول کر بھی کوئی سالک عجب کر بیٹھے تو ظلماتِ نفسانی، اور ظلمات دنیوی اس پر امڈ آتی ہیں۔ پھر اگر تائب نہ ہو تو یہ اندھیرے اس کے باطن پر بھی مسلّط ہو کر نور بصیرت کم کر دیتے ہیں۔ زیادہ عجب و فکر میں نورِ بصیرت کا چراغ بالکل ہی ماند پڑ جاتا ہے۔ اہل اللہ کی چند اقسام ہوتی ہیں۔

صوفیاء کاملین کے درجات کا تعین بہر طور اسلامی تقویٰ پر ہی مرتب ہو کر درجۂ ولائیت بن سکتا ہے۔ مگر اس کے بعد ان کی نسبتِ سلوک کے مطابق اللہ تعالیٰ انہیں کسی خاص شعبۂ زندگی کی اصلاح کے لیے مامور کرتا ہے۔

ہر ولی اللہ کی نسبت سلوک کسی نبی اللہ علیہ السلام کے ساتھ متعلق ہوتی ہے یا خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے کسی ایک خلیفہ کے مزاج سالکانہ کے ساتھ اس کی نسبت سلوک متعلق ہوتی ہے۔ بعض اہل بیت اطہار کی نسبت سے وابستہ کر دیئے جاتے ہیں۔

انبیاء کرام میں بعض نسبتِ عشق کے حاملین تھے۔ بعض جمالی، بعض معتدل بعض بالکل عاجزانہ طور پر نسبت عشق پر راہ سلوک نسبت سنت رسول سے طے کرنے والے تھے۔ مگر حضور سرورِ کون ومکان صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مجموعۂ صفاتِ انبیاء و مرسلین تھے۔ آپ کا جلال و جمال سنت اللہ کا مظہر ہوتا تھا اور دینِ فطرت کے مطابق اعتدال پر قائم رہتا تھا اور آپ کے جلال کا اظہار جلال بندگی کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا اور آپ کا جمال جمالِ بندگی کی صورت میں ہویدا ہوتا تھا۔ اسی واسطے آپ کا جلال، جلال الٰہی اور آپ کا جمال، جمال الٰہی اور آپ کا علم، علم الٰہی کے تابع ہوتا تھا۔

وہ اہل اللہ جن کی نسبت رسولی ہو، وہ سب ولیوں پر برتری حاصل کر لیتے ہیں وہ متخلق باخلاقِ رسول اللہ ہو کر یعنی اللہ و رسول کی اطاعت کے ساتھ بندگی کے فرائض انجام دیتے ہیں اور حقوق العباد کی نگہداشت کرتے ہیں اور اسوۂ حسنہ ہی ان کا متاع سلوک ہوتا ہے۔ یہی سلوک حقیقت میں دینی سلوک کہلاتا ہے اور اس پر صحیح سلوک ہونے کا اطلاق ہوتا ہے۔

دوسرے درجے کے وہ اہل اللہ ہیں۔ جو کسی نبی کی جلالی و جمالی نسبت عشق سے متعلق ہو کر نبی آخرالزمان علیہ الصلوۃ والسلام کے امتی ہونے کا شرف پائیں اور سنت خیر الانام کی بجا آوری کریں۔ اور سنت رسول کو ہی ذریعۂ سلوک بنا کر روحانی ارتقاء حاصل کریں۔ اس قسم کے

سالک عالم امر سے متعلق ہو کر عالم خلق میں اپنے اعمال آسمانی ہدایت کے مطابق ترتیب دیتے ہیں اور اسلام کو آخری ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں۔

تیسرے درجے کے وہ اولیاء اللہ ہیں۔ جو علمائے ظواہر و علمائے بواطن کی صورت میں اللہ تعالے کی بندگی اور نبی اکرم ﷺ اور صحابہؓ کرام کی اطاعت کرنے کی عادت رکھتے ہوں۔ ان کی نسبت عشق منقسم ہوتی ہے۔ مگر یہ لوگ اطاعت شعار ہوتے ہیں۔ انسانی آبادیوں میں اسلام کا غلغلہ انہی نفوس قدسیہ کے ذریعہ بپا ہوتا ہے اور چمن انسانی میں یہی لوگ اللہ تعالے کے ذکر و فکر اور نعت مصطفےٰ علیہ الصلوۃ والسلام اور تحریر و تقریر کے ساتھ تبلیغ دین کے فرائض انجام دیتے ہیں اور گلستانِ اسلام کی طوطیانِ خوش نوا یہی لوگ ہیں۔ جن سے چمن اسلام ہمیشہ آباد رہتا ہے۔ ان کی آوازِ حق لوگوں کو دعوت اسلام دیتی ہے۔ نیز یہ جماعت لوگوں کو راہِ اسلام پر تازہ دم رکھتی ہے اور ان کی ندائے حق اسلام کی راہیں انسانیت کے لیے ہموار کرتی رہتی ہے۔ یہ لوگ اعلانیہ جاہد فی سبیل اللہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دین کی راہ میں ہر قسم کی سختیاں برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

آگے ان کی چار قسمیں ہو جاتی ہیں ایک صاحبانِ جلال، ایک صاحبانِ جمال، ایک صاحبانِ علم و تواضع، ایک صاحبانِ عجز و انکسار۔ صاحبانِ جلال علماء و سالکین سخت گیر ہوتے ہیں اور اپنی جلالت عارفانہ کو عدل و انصاف پر صرف کرتے ہیں اور صاحبان جمال بے حد متبسم اور صلہ رحمی کرنے والے عفوو درگذر کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور اس جمالی ذوقِ سالکانہ کو راہِ حق پر عبادات و معاملات کے ساتھ جاری رکھتے ہیں۔ یہ لوگ

بڑی روکھی طبائع کو بھی مائل با اسلام کرنے کی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں ان کا متبسمانہ ترحم اہل جلال کے مقابل ایسا ہوتا ہے۔ جیسے غروب آفتاب کے بعد بر و بحر پر چاند کی چاندنی اپنے نتیجہ خیز اثرات مرتب کرتی ہے۔ نیز کونپلیں پھل پھول اور اثمار وغیرہ اس کی نورانیت سے اثر پذیر ہو کر میٹھے میٹھے سماں کے ساتھ نمود و نمائش پاتے اور رنگ و روپ اور ذائقے حاصل کرتے ہیں چاند کی جمالی چاندنی سے اصلاب وار حام میں خون اور ندغے حالات کے مطابق اثر انداز ہوتے ہیں اور نمود پاتے ہیں۔

اہل جمال علمائے صالحین اور اولیائے صالحین انسانوں کے جہانِ انفس میں ایسے ایسے اثرات مرتب کرتے ہیں جس سے انسانی باطنی فکری صلاحیتیں اور نیکیاں باطن سے نمود پا کر عقل و دل اور نگاہ پر نمودار ہو جاتی ہیں۔ نیک لوگ ان کے حالات کے نیک اثرات کو اس طرح قبول کرتے ہیں جس طرح خربوزہ خربوزے سے رنگ پکڑتا ہے۔ یقیناً اہل اللہ کی مختلف سالکانہ نسبتیں اپنے مقربین کو اسلامی بندگی میں رنگ دیتی ہیں۔

اہل علم و رضا سالکین کی حلیمانہ نسبت عشق حلم نبی پاک ﷺ، اہل بیت اطہار اور صحابہ کرام کے حلیمانہ طرزِ سلوک سے متعلق ہو کر عاجزانہ بندگی کے ساتھ منزل سلوک پر چلتی رہتی ہے۔ پھر وہ اس قسم کی صلاحیتوں کو تبلیغ دین کے لیے صرف کرتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے صابرین و شاکرین اور متبحرین ہوتے ہیں۔ ایسے حلیم قسم کے سالک لوگ طبائع انسانیہ پر کسی طرح بھی گراں بار نہیں ہوتے۔

رات دن ذکر و فکر میں گذراتے اور لوگوں سے حسن و مروت سے پیش آتے ہیں۔ بڑے خوش پوش خوش گفتار اور خوش کردار ہوتے ہیں۔

اہل عجز سالکان راہ حقیقت کی نسبت عشق آخرالزمان علیہ التحیۃ والتسلیم کی بندگی سے والہانہ وابستگی رکھتی ہے۔ وہ ہر قسم کی انانیت ذاتی سے گریز کرتے ہیں۔ وہ اپنے کرامات کو مخفی رکھنے میں زیادہ تسکین پاتے ہیں۔ مگر خدا ان کی کرامات کو ظاہر کرتا رہتا ہے۔ یہ لوگ اپنی طرف سے مخفی و مستور رہنے کی پوری کوشش کرتے ہیں مگر خداوند ذوالجلال ان کی مخلصانہ اور معترفانہ حقیقتوں کو اظہار کے لیے بار بار باور کرتا رہتا ہے۔

یہ لوگ "ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا و ترحمنا لنکونن من الخسرین" کو اپنا ورد زبان رکھتے ہیں۔

ایسے سالکوں نے یہ اعتراف اسلامی تعلیمات سے اخذ کیا اور معصوم عن الخطا انبیاء کے معصومانہ اعتراف سے لیا۔ وہ اسلام کے اس فیصلہ پر یقین رکھتے ہوئے کہ انبیاء معصوم عنِ الخطا ہیں۔

مگر اولیاء اللہ کبھی معصوم عنِ الخطا نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ اولیاء اللہ کو اللہ تعالٰی کبیرہ گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ مگر ان کا اعتراف اتنا بلند ہوتا ہے۔ کہ ایسے عاجز بندگانِ خدا حسنات الابرار سیئت المقربین کے مصداق ہو جاتے ہیں۔ اور حصولِ تقرّب پر ان کا اعتراف اس درجہ مقام کمال حاصل کر لیتا ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احسانات کے مقابلے میں اپنی نیکیوں کو بھول جاتے ہیں۔ اور ان کو اپنی نیکیاں خدا کی نیکیوں کے سامنے اس طرح معلوم ہوتی ہیں۔ جس طرح سورج کے سامنے چراغ ہو۔ یہ عاجز قسم کے سالکینِ طریقت ہر قسم کے غیر دینی قول و عمل سے حتی المقدور اجتناب کرتے ہیں۔ مگر پھر معاً خوفِ انجام سامنے آجاتا ہے۔ اور رحمت خداوند ذوالجلال اور اس کی غفرانیت یاد آجاتی ہے۔ تو لرزہ براندام ہو کر

اس طرح اعتراف کرتے ہیں۔

استغفر اللہ العظیم واتوب الیہ

اے اللہ میں اپنے خفی و جلی گناہوں سے توبہ کرتا ہوں اے اللہ میں سچی توبہ کے ساتھ تیری طرف لوٹتا ہوں۔ اے اللہ مجھے کیا خبر کہ کون انجام کار بخشش پائے گا۔ اے اللہ تیری رحمت وسیع ہے اور تیری ذات اپنی رحمت سے غفار الذنوب ہے۔ اے اللہ تو بڑے سے بڑے گناہ گاروں کو بخشنے پر قادر ہے۔ اور بڑے سے بڑے مدعیان ولایت کو بلعم باہور کی طرح محروم ولایت کرنے پر بھی قادر ہے۔ اے اللہ تو حضرت لوط علیہ السلام کی زوجہ کو جہنمی بنانے اور زوجہ فرعون کو جنتی بنانے پر قادر ہے۔ اے اللہ ہم اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ اے اللہ تو ہماری توبہ قبول فرما۔ اے اللہ ہمیں گناہوں سے دور رکھ، اور لوگوں سے بجائے اجتناب کے حسنِ سلوک کے ساتھ دعوت دینے کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ تو ہماری ہر حال میں مدد فرما۔ تاکہ ہم خود بھی گناہوں سے بچیں اور لوگوں کو بھی بچائیں۔

اس قسم کے علماء و فقرائے صالحین کی تبلیغ بڑی کامیاب رہی ہے۔ یہ لوگ کسی کو بددعا وغیرہ کی دھمکی نہیں دیتے اور نہ ہی خشمگیں ہوتے ہیں۔ درحقیقت یہ لوگ انسانیت کے لیے نورانی و برھانی تسکین ہوتے ہیں۔ یہ لوگ محسنینِ اُمت ہیں۔

# سترہواں باب

## پیشین گوئی والد بزرگوار

والد بزرگوار نے فرمایا۔ اسلامی تبلیغ ہمیشہ علمائے ظواہر اور علمائے بواطن کی مرہون منت رہی ہے۔ علماء وصوفیاء میں رقابت کا باعث خارجی قسم کے بے دین لوگ ہوئے ہیں جنہوں نے علماء وصوفیاء کے رنگ میں جامہ سالوس زیب تن کیا اور غلط تاویلات کے ساتھ عالمانہ کردار ادا کر کے صوفیاء میں علماء کے خلاف تنفر آمیز لہجوں کے ساتھ بد دلی پھیلائی اور بعض نے اولیاء اللہ کے لبادہ میں مکروہ قسم کے صوفیانہ کردار سے اسلامی علمائے حق کے دلوں میں تصوف کے خلاف مصنوعی اور غلط کہانیوں کے ساتھ بد دلی پھیلائی۔ اس باہمی تنفر میں غیر مسلم مخالفین کی سازش کارفرما رہی۔

بعض تن آسان حکمرانوں نے بھی اس تنفر میں حصہ لیا اور اپنی نفسانی سیاسیات کی تکمیل کے لیے ان صالحین میں تفریق پیدا کرنے کے لیے سیاسی کوششیں کیں اور سیاسی جال پھیلائے۔ بعض عام قسم کے مفکرین نفسیات بھی تھے۔ انہوں نے بھی اپنی تحریر و تقریر کو باہمی تنفر پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا۔ مگر ایسے لوگوں کو کیا خبر تھی کہ ان لوگوں کی باہمی چپقلش بعد میں ایک اجتہادی صورت بن کر سامنے آجائے گی اور اس

طرح وہ مشکل ترین مسائل جو لاینحل تھے، وہ بھی حل ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی تنفر آمیز تاویلات کو تیرہویں صدی ہجری کے نصف خصہ سے ابھرنے کا نسبتاً زیادہ موقعہ ملا اور مسلمانوں پر خارجی بے دینوں کا دباؤ بڑھنا شروع ہو گیا۔

انگریز کی دو صد سالہ نفسیاتی حکمتِ عملی نے بھی صفِ اسلام میں کافی افتراق پیدا کیا اور یہ افتراق جہاں ہمارے باہمی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے میں مصروف تھا، وہاں اس نے ہمارے نیم خواندہ مسلمانوں کے ذریعہ ہماری دینی اصطلاحات کو بھی پامال کیا۔ اور ہماری اسلامی تہذیب و تمدن کے نقوش کو بھی مٹانے کی مسلسل کوشش کی۔ اور ان سرگرمیوں کو انگریز نے امکانی حیلہ سازیوں کے ساتھ جاری رکھا ہماری اسلامی معیشت کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ مسلمانوں میں سے ہی ایسے ضعیف الایمان لوگوں کا انتخاب کیا۔ جن کے ذریعہ اسلام کے بنیادی حقائق کو پامال کرنے کی کوشش جاری رکھی گئی قرآن مجید کے مجموعہ صادقہ پر بھی اعتراضات کرائے گئے۔ احادیث شریفہ کی صداقت پر بھی ملت اسلامیہ کے بعض منافق لوگوں کے ذریعہ مذموم حملے کرائے گئے۔ پھر انگریزوں نے ایسے لوگوں کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی ختم نبوت کے فلسفۂ ہمہ گیر اور لافانی نظریۂ اسلام پر بھی اعلانیہ اور عملاً تقابلی حملے کرائے گئے۔ اور ظلی و بروزی نبوت کا مماثلی تقابل کرایا گیا اور ایک بے وزن اور غیر معقول دلیل کے ساتھ ایک ہی زبان کو مسیح علیہ الصلوۃ والسلام کی وفات پر بولنے کے لیے تیار کیا گیا۔ یعنی مسیح علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں پھر اسی زبان سے فوت شدہ مسیح کی جگہ اپنے آپ کو مسیح موعود ثابت کرایا گیا۔

جس زبان سے یہ دعویٰ کیا گیا تھا۔ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کی زبان تھی۔ جس نے اپنی زبان اور قلم سے ایک دن جس نظریہ کا انکار کیا۔ دوسرے دن نہایت چابکدستی کے ساتھ تلبیاً اس کا اقرار کر لیا۔ مرزا غلام احمد کی تضاد بیانی ان کی مختلف تصنیفات کی صورت میں موجود ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے جملہ انکار و اقرار اسلام کے نام سے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے سوچے سمجھے ہوئے طور طریقے تھے جو انگریز کی ایما پر ظہور پذیر ہوئے۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے جس زبان و قلم سے مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات ثابت کی، اس کا مدعا مسلمانانِ عالم کے اس عقیدہ کو پامال کرنا مقصود تھا۔ جس عقیدہ کا تعلق احادیث شریفہ کی روشنی میں مسیح الدّجال کے نزول کے ساتھ ہلاکت دجال اور مہدیٔ موعود علیہ السلام کی آمد کے انتظار سے متعلق تھا۔ اور احادیث شریفہ میں مہدی موعود علیہ السلام کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے اور مسیح الدّجال کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

جمہور علمائے امت اور اجماعِ امت کا بھی ان بشارتوں پر یقین کامل تھا۔ دین حنیف کے پیروکاروں کی برصغیر میں کثرت تھی۔ اس کثرت رائے کی موجودگی میں روایات اسلامیہ پر مسلمانوں کی اعتقادی و عملی پابندی انگریز کی متعصبانہ اور کینہ پرور سیاست کی راہ میں سختی کے ساتھ حائل تھی۔ بعجلت ان معتقدات سے عامۃ المسلمین میں تبدل و تغیر ناممکن العمل تھا۔ چنانچہ قلیل المیعاد منصوبہ کو انگریز نے طویل المیعاد منصوبہ کے ساتھ بدل دیا اور برصغیر کے مسلمانوں کی ذہنی زمین کو ہی اپنے

اس منصوبہ کو جامہ عمل پہنانے کے لیے تجربہ گاہ بنا لیا اور مرز غلام احمد جیسی متضاد الخیال شخصیت کے قلم و زبان کے ذریعہ لفظ ظلّیت و بروزیت کے منحوس نام سے مصنوعی نبوت کا بیج بویا گیا۔ اس بیج بونے کے لیے بے دین قسم کے ذہن جو انگریز کے معلوم ذہن تھے، انہیں ہموار کیا گیا اور زر کثیر کے صرف کے ساتھ ان ذہنوں پر نفسیاتی اور سیاسی دباؤ ڈالے گئے۔ ایسے لالچی ذہنوں نے جن کا کوئی دین و ایمان نہ تھا، مرزا غلام احمد کی جماعت قادیانہ میں شمولیت اختیار کی اور انگریز نے اس جماعت پر زرِ کثیر خرچ کیا۔ جس سے مرزائیت کو سر بازار اعلانیہ اندھا دھند خلاف اسلام اشاعت کرنے کا موقعہ کھلے بندوں مل گیا۔ اور لاتعداد کتابچوں کی صورت میں مختلف لٹریچر سامنے آئے۔ اخبارات، رسالہ جات وغیرہ کے لیے اس جماعت کی کھلے بندوں تائید و اعانت ہوئی۔ جس پر علی الاعلان مرزا غلام احمد اور اس کی جماعت نے ختم نبوت کے خلاف اپنے منصوبہ پر مسلسل عمل کرنا شروع کر دیا۔ ایسی کھلی گمراہی پر سوادِ اعظم کی موجودگی میں ایسے دعویٰ بے عمل کے ساتھ ایک لمحہ کے لیے بھی چلنا ناممکن العمل تھا۔

مگر مسلمانانِ برصغیر کی دو صد سالہ غلامی اس نہایت نازک دور میں آڑے آئی۔ اس منصوبہ کے رد عمل کے لیے جہاں اور جس جگہ بھی علمائے ربانی نے سر اٹھایا انگریز کی حاکمانہ قوت نے نقص امن کا نام دے کر ان تبلیغی سرگرمیوں کو روک دیا اور حق پر چلنے والوں کو روکنے کا رواج بھی اسی زمانہ انگریز سے شروع ہوا اور بدقسمتی سے اسی طریقہ کو جنگِ آزادی کے زمانہ تک اسی قانون کے دھیمے مگر خطرناک اور مہلک لفظ نقصِ امن کے قانونی نام سے ہی نافذ العمل رکھا گیا۔

اسی دستور انگریز کے مطابق ہر دور میں باغیان اسلام کی تائید کی گئی اور مسلمانوں کی صالحانہ سرگرمیوں کو روکنے کے لیے ایک حربہ کے طور پر نقص امن کے لفظ کو استعمال کیا جاتا رہا۔ علماء ربانی کی ہر تقریر اور تحریر کا رد عمل بھی نقص امن کے لفظ کے ساتھ کیا گیا۔

جنگ آزادی من حیث القوم نہیں بلکہ من حیث المذہب لڑی جا رہی تھی، جس کا منشاء برصغیر کی دو مذہبی قوموں کی آزادی تھا ایک قوم کا مذہب اسلام تھا اور دوسری قوم کا مذہب ہندویت تھا یہ دونوں قومیں متحدہ طور پر انگریز کے خلاف جنگِ آزادی لڑ رہی تھیں۔ دونوں کی آزادی کا منشاء قومی مذہبی روایات کی بقاء و سلامتی تھا۔ مسلمان حصولِ آزادی کے ساتھ اسلامی نظام جمہوریت چاہتے تھے اور ہندو اپنے مذہب کے مطابق جمہوری حکومت کے متمنی تھے۔

چنانچہ ان دونوں قوموں کے جذبات باطن ایک مرحلہ پر نکھر کر بین الاقوام کے سامنے آ گئے۔ جب ہندو قوم کے متعلق مسلمان راہنماؤں کو اشتباہ ہوا اور یہ شبہ جب یقین کی صورت اختیار کر گیا کہ ہندو قوم مسلمانوں کو اپنی مذہبی عصبیت کی بھینٹ چڑھا دینے پر پوری طرح آمادہ کار ہے۔ تو ایسے عالم میں بلیغ النظر سیاسی قائدینِ اسلام اور راسخ العقیدہ علمائے اسلام، صاحبان بصیرت، مشائخ اسلام نے جنگ آزادی کا دھانہ جداگانہ ریاستِ اسلامیہ کے مطالبہ کے ساتھ موڑ دیا۔

اس طرح مسلمانانِ برصغیر کی جنگ آزادی ایک الگ ریاستِ پاکستان کے حصول کے لیے اسلامی راہ پر چل پڑی کہ اس طرح ملتِ اسلامیہ کو اسلام کے ساتھ اپنی عظمت رفتہ پھر میسر آئے گی اور مشرق سے

اعلائے کلمتہ الحق ہو گا۔

اس جذبۂ اسلام کی تعریف ادباء ملّت، فاضلینِ دین، مشائخ اسلام، ملک کے شعراء نے بڑے درد مندانہ انداز میں کی۔ باوجود اس کے کہ جنگ آزادی من حیث المذہب لڑی جا رہی تھی، مگر اس کے ساتھ ساتھ ارتداد کا سلسلہ بھی سیاسی رنگ ڈھنگ میں ملت اسلامیہ کے ساتھ ساتھ دوش بدوش، قدم سے قدم ملا کر میدان آزادی کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

جنگ آزادی کے بعد ریاست پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو دشمنان اسلام کا ٹولہ بھی منافقانہ اندار میں شریک سفر ہو گیا۔

اگر مرتدین اسی طرح ملت اسلامیہ میں مخلوط رہے تو ایک بڑے پھیلاؤ کے ساتھ وہ یقیناً الگ ریاست کے حصول پر اتر سکتے ہیں بصورت دیگر اپنے آپ کو شریک مملکت بنا کر ریاست کے شہری بن جائیں گے۔ اگر بد قسمتی سے انگریز کی طرز حکومت بھی جاری رہی تو انہیں کھلے بندوں تاویلات کے پھندے ڈالنے کا موقعہ بھی ملتا رہے گا۔

ابتداً ہندو مسلم کی متحدہ آواز کے ساتھ جنگ آزادی میں اہل ارتداد بھی اپنے قدم مضبوط کرنے میں مصروف رہے اور جب دونوں قومیں آزاد ہو گئیں اور مسلمان دو ریاستوں میں تقسیم ہو گئے تو اس انداز تقسیم میں اہل ارتداد دونوں ریاستوں میں اسلام کے نام پر اپنی جڑیں مضبوط کرنے لگ گئے اور کلیدی آسامیوں پر بھی تسلط جمانے لگے۔ چونکہ وہ اپنی اقلیت کے تحفظ کے لیے اس سے زیادہ مؤثر طریقہ نہ پانے کی بنا پر مختلف شعبہ جات میں بٹ گئے اور کلیدی مواضع کو پر کرنے کی منظم سعی شروع کر دی۔ جو ایک مدت کے بعد اسلامی ریاست میں بسنے والے مسلمانوں

کے لیے ایک داخلی وبال یا آفت جان بھی بن سکتی ہے۔

اگر انگریز کے اس مروجہ قانون کے سہاروں پر پاکستان حسب سابق چلتا رہا اور مذہب کے لیے حفظ ماتقدم پر بھی لفظِ نقص امن کا سلسلہ جاری رکھا تو کوئی وجہ نہیں کہ نئی پود ارتداد کا شکار نہ ہو جائے۔ حالانکہ اجتماع اسلام کو اس قسم کے حربوں سے پامال نہیں کیا جا سکتا۔ نیز فتنۂ انکار حدیث اور فتنۂ انکار ختم نبوت اور فتنہ انکار تقلید اور فتنہ انکار ولایت قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے فتنے مزاجِ اسلام کے خلاف ہیں۔ اگر انگریز کا یہ منصوبہ کامیاب رہا تو ریاست پاکستان کے مسلمان بار بار ارتداد کا نشانہ بنتے رہیں گے۔ ان کو بے روزگار کیا جائے گا۔ ان کے تعلیمی میدان اسلامی نصابِ کامل سے بار بار محروم ہوتے رہیں گے. اور قوم کو بنیادی علوم کے فلسفہ سے بے بہرہ رکھا جائے گا۔ اس طرح مسلمانان پاکستان کی رائے عامہ غریب مفلوک الحال مجبور و بے بس کی طرح جہاں بھی پیٹ پالنے کے ذرائع پائے گی، وہیں پناہ لینے پر مجبور ہو جائے گی۔

اگر ارتداد نے ملک میں قلمدان حکومت پر بھی تصرف حاصل کر لیا تو یہ اسلامی اقتدار کے علاوہ ریاست کے استحکام کے لیے مرگ مفاجات ثابت ہوں گے۔

آزادی کے بعد تقسیم ملکی کے زمانوں میں جب دونوں ملک اپنی بجی مصروفیات میں منہمک ہو گئے۔ تو ارتداد کو اپنی بنائیں ڈالنے کا موقع مل گیا۔ ملتِ اسلامیہ کے سیاسی شعور حاصل کرنے کی مدت تک انگریزی طرز زندگی اختیار کرنے والے لوگ ہی برسرِ عزت رہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ غیر دینی شعور رکھنے والے عزت و اقتدار کے سائے میں ارتداد کو

پھلنے پھولنے کا وسیع وقت مل سکے گا۔

## (پیشین گوئی)

اگر ان ارتدادی قوتوں کا سد باب نہ ہوا۔ تو آئندہ زمانہ قریب تک ہی فتنۂ انکار حدیث اور فتنۂ ختم نبوت مذکورہ سہاروں پر تقویت پا کر حکومت در حکومت کے منصوبہ پر کامل دستگاہ حاصل کرے گا اور برسرِ ممبر کتاب و سنت کی توہین ہو گی۔

اگرچہ علمائے ربانی اس دور میں حکمت اسلامیہ کے پیشِ نظر کچھ مدت خاموش رہے اور ارتداد کو یہ گمان ہو گیا کہ نشاۃ ثانیہ ان کے ہاتھ میں ہے اور یہ کہ وہ جو چاہیں گے کر سکیں گے۔ مگر اس کے آنے تک علمائے ربانی اپنے دینی افکار و عزائم کو درست و آراستہ کر لیں گے اور اس دوران میں ہی ان کی آواز متحدہ طور پر ارتداد کے خلاف بلند ہو جائے گی اور علماء جب دیکھیں گے کہ صرف سیاسی سہاروں پر ہی اقتدار کی معیت میں ارتداد آگے بڑھ رہا ہے۔ تو ایسی ناگزیر صورت حال میں علماء وقت سیاست ملی میں بھی حصہ دار بننا شروع ہو جائیں گے۔ ان کی یہ تبدیلی فیصلۂ خداوندی ہو گا۔ اس طرح جس میدان میں خفی و جلی طور پر اہل ارتداد پہنچیں گے، وہاں علمائے ربانی بھی پہنچ جائیں گے اور ہر مجلس اور ہر شعبۂ زندگی میں ذیلی اور بالائی ایوانوں میں علمائے ربانی رسائی پا کر ارتداد کا سیاسی اور مذہبی طور پر ردِ عمل کریں گے۔ اس رد عمل سے بچنے کے لیے اہلِ ارتداد دوبارہ علماء میں تفرقہ سازی کا جال پھیلائیں گے۔ اس طرح فسادات کا احتمال بھی ہو گا۔ مگر تین چار المناکیوں کے بعد ملتِ اسلامیہ کے شعور سنبھل جائیں

گے اور ارتداد پسندوں میں زوال شروع ہو جائے گا اور اسلامی اقدار کی پھر حفاظت ہونی شروع ہو جائے گی۔ اس دوران ملکی سیاست میں بڑی تبدیلیاں آئیں گی۔ اور یہ تبدیلیاں سہل پسندانہ حالات کے رد کے لیے بروئے کار آئیں گی۔ ریاست کی حفاظت اللہ تعالےٰ کریں گے۔ کتاب و سنت کی آوازیں بلند ہوتی رہیں گی۔ تن آسان لوگ دین کے خلاف نئی پود کو برانگیختہ کریں گے۔ ہر نئی نسل ایک نئے ذہنی زاویۂ نگاہ کے ساتھ سامنے آئے گی۔ اور نماز، روزہ، حج و زکوۃ کو اہل ارتداد اس نئی پود کے سامنے اپنے مخترع دلائل کے ساتھ بارِ گراں ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور ان احکامات کو زائد قرار دیں گے۔ اہل ارتداد سہل پسندانہ تصنیفات کے ذریعہ دین کو سہل تر بنانے کی سعی بھی کریں گے۔ اور تکلفات دینیہ پر تکلفات مادّیہ کو ترجیح دیں گے۔ یہ کہ دنیا کے کام کاج کرو۔ ترقی پاؤ اور اقوام عالم کے دوش بدوش چلو۔ اور تکلفات دینیہ کو دنیوی زندگی میں سنگِ گراں ثابت کرنے کی ناکام کوشش کریں گے۔

یہ وہ دور ہوگا، جس میں علمائے ربانی کی راہنمائی کے لیے جرّی و بہادر اور نڈر علمائے ربانی میدانِ عمل میں آئیں گے۔ اور کچھ سیاسی راہنما بھی ان کے ہم خیال ہو کر ان کا ساتھ دیں گے۔ پڑھے لکھے لوگ بھی ان کے ہمنوا ہو جائیں گے۔ قدرت اپنی حکمت بالغہ سے مسلمانوں کو اسلامی احکامات کی تعمیل میں نشاۃ ثانیہ کا موقعہ فراہم کرے گی۔ یہ وقت ارتداد کی خفیہ سازشوں کا زمانہ ہوگا اور علمائے ربانی بڑی بڑی آزمائشوں سے دوچار ہوں گے اس کے بعد پرامن انقلاب آئے گا اور کچھ مدت سکون رہے گا۔ اور اس سکون میں پھر شورش پسندانہ تحریک پیدا ہوگی۔ یہ شورش دین،

ملک اور عوام کو راہِ راست پر لانے کے لیے پھر راہ ہموار کرے گی۔

اگر علماء کی صفوں میں اتحاد رہا تو وہ فوز عظیم پانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ورنہ دین کی گتھیاں سلجھانے کے لیے پھر ایک عرصہ تک انتظار کرنا پڑے گا۔ ایک مسلمان مرد بینا خود آگاہ کو اللہ کے فضل و کرم سے سامنے آنے کا موقعہ دیا جائے گا۔ اس دوران اسلام کی وہ اصطلاحات جو ارتداد کے ذریعہ لوٹی جا چکی تھیں، ملتِ اسلامیہ میں پھر لوٹ آئیں گی۔ علماء و مشائخ کا اتحاد ہو گا۔ یہ عملاً تلافی مافات کے خواستگار ہوں گے۔ کام زیادہ کریں گے۔ درس و تدریس میں منہمک رہیں گے۔ ہر شعبہ زندگی تک رسائی پالیں گے۔ خدا کی تائید ان کے شاملِ حال ہو گی۔ اور پھر ملت کے خورد و کلاں کی زبان پر نعرہ اسلام آجائے گا۔ حکمران اور روسائے قوم بھی نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ کے پابند ہو جائیں گے۔ کچھ علما جو افراط و تفریط کا شکار ہو رہے تھے۔ حالات ان کو بھی اعتدال پر لے آئیں گے۔ اس دوران علماء و مشائخ کے اتحاد کی اتنی اشد ضرورت ہو گی جتنی شاید کبھی بھی درپیش نہ آئی ہو۔ اس دوران علمائے صالحین قطعی طور پر غفلت شعاری سے الگ ہو کر اتحاد اسلامی کے لیے سعیٔ پیہم کرنے میں مشغول و منہمک ہو جائیں گے۔ اگرچہ کمزور اور حریص قسم کے مصنوعی علماء ان کے آڑے آئیں گے مگر ظفر مندی علمائے حق کے ساتھ رہے گی۔

# اٹھارہواں باب

## سورۂ فاتحہ کی معیت میں مشاہدات

گذشتہ ابواب کے اذکار و نصائح سے قبل ۱۹۳۴ء کی یکم جنوری بوقت صبح بعد از نماز مرشدی والد بزرگوار نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ والدہ پاک دامنہ بھی قریب ہی صبح کی چائے کے اہتمام میں مصروف تھیں۔ حضرت والد بزرگوار نے فرمایا۔ بیٹا! کشف و کرامات کے بارے میں تمہارا عقیدہ کس حد تک ہے۔ کیا تم کشف و کرامات کے قائل ہو؟۔ میں نے عرض کی کہ مجھے ان حالات تک رسائی نہیں۔ البتہ اولیائے صالحین کے کشف و کرامات پر میرا عقیدہ ہے۔ کہ وہ بربنائے تقویٰ بفضل اللہ صاحب کشف و کرامات ہوتے ہیں۔

میرے جواب کے بعد آپ نے تبسم فرمایا اور اسی متبسمانہ انداز میں چائے نوش فرماتے ہوئے فرمایا۔ کہ کرامات تین قسم پر ہیں۔ ان میں سے دو قطعی ہیں۔ اور تیسری کرامت ان دو قطعی کرامات کے ذریعہ امت کے پرہیزگاروں سے سرزد ہوتی ہیں۔

پہلی کرامات جو جملہ کرامات کا منبع و مصدر ہیں۔ وہ کرامات رب العالمین ہیں، جن کو قدرت الٰہی کہا جاتا ہے اور مظاہرات عالمین ومافیہا سب کی سب اللہ تعالےٰ کی قدرت کریمانہ کا مظہر ہیں۔ یہ قدرت کے

کراماتِ قطعیہ ہیں جن میں شک نہیں لایا جا سکتا۔

دوسری کراماتِ انبیاء و مرسلین ہیں۔ جن کو اصطلاح شریعت میں معجزات کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ کرامات بصورت معجزات و خوارقاتِ انبیاء کہلاتے ہیں۔ اور یہ بھی قطعی ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء و مرسلین کی تصدیق چاہتے ہیں۔

تیسری کرامات کراماتِ اولیاء اللہ ہیں۔ جو شریعت اسلام کے احکامات کی بجا آوری میں اولیاء اللہ کو بفضل اللہ میسر آتی ہیں۔ مگر یہ کرامات انبیاء کرام کے معجزات کی طرح قطعی نہیں ہوتیں۔ بلکہ پیروئ اسلام میں باعتبارِ تقویٰ اعتباری ہوتی ہیں۔ جن کو بطور اعتبار تعمیل شریعت میں ایزادِ رحمت کے طور پر وصول کیا جاتا ہے۔ یہ کرامات سو فیصد درست نہیں ہوتی۔ بلکہ درجاتِ تقویٰ کے لحاظ سے کسی ولی اللہ کے پچانوے فیصد کسی کے اس سے کم پچاس ساٹھ یا ستر فیصد تک اور کسی ولی اللہ کے پچاس سے کم تیس بیس یا دس یا ایک فیصد تک ہوتی ہیں۔ ان پر اعتبار کرنا چاہیے۔

اگر یہ کرامات کتاب و سنت کے معیار پر اتر آئیں۔ تو ان پر اعتبار کرنا موجبِ ثواب اور موجب تحریص دین اور حصول تقویٰ کی ترغیب کا موجب ہوتے ہیں۔ اسی واسطے ان پر اعتبار کرنا دین پر قائم رہنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر خلاف شریعت کسی سے کوئی تعجب خیز بات یا فعل سرزد ہو بھی جائے تو وہ کرامت نہیں ہو سکتا بلکہ وہ محض ایک شعبدہ ہو گا۔

اس نصیحت کے بعد مجھے ایک بار الحمد شریف اور تین بار اخلاص شریف پڑھنے کی تلقین فرمائی اور اول و آخر درود شریف پڑھنے کی تلقین

فرمائی۔ مجھے باوضو ہو کر قبلہ رو بٹھایا اور دروازہ بند کر دیا گیا اور پھر فرمایا۔ بیٹا! کرامت کسی ولی اللہ کے جیب کی چیز نہیں ہے کہ جب چاہیے، اسے نکال لے اور جب چاہے، بند کر دے۔

فرمایا! خوشنودیٔ خدا کے ساتھ کرامات کا صدور ہوتا ہے۔ جو اللہ تعالٰے کی رضا سے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اس کے لیے کتاب و سنت کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ نہیں جو اولیاء امت تک پہنچا ہو۔ جس طرح کسی سمندر سے دریا جاری ہو جائے یا حوض کی طرح کہ اس میں سے پانی جاری کرنے کے لیے نلکا لگایا جاتا ہے اور اسے کھولنے یا بند کرنے کا ایک مخصوص طریقہ ہوتا ہے۔ جب وہ کھول دیا جائے تو پانی جاری ہو جاتا ہے۔ اور اس سے آبیاری کا کام لیا جا سکتا ہے اور اگر بند کیا جائے تو پانی رک جاتا ہے اور وہی نلکا جامع الحوض اور اور مانع الحوض کے فرائض سر انجام دیتا ہے۔ اسی طرح اولیاء اللہ بر بنائے تقویٰ، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فضیلت عالمانہ یا فضیلتِ عارفانہ کے شیوخ ہوتے ہیں جن کو شیخ العلوم دینیہ یا شیخِ طریقت کہا جاتا ہے۔ ان کا علم و عرفان سمندروں یا بہتے ہوئے ددیاؤں کے مانند ہوتا ہے۔ اس سے کم درجے کے علماء یا ولی اللہ جھیل یا حوض کے مانند ہوتے ہیں۔ سمندروں کے کواڑ اگر کسی جہت سے کھول دیئے جائیں۔ تو ان سے بڑے بڑے دریا پھوٹ کر بہہ نکلتے ہیں۔ جو دور دراز تک پھیل جاتے ہیں۔ جن کے ذریعہ لعل و جواہر اور پنے اور دیگر جواہرات بھی ان کے ہمراہ ارضی وسعتوں میں پھیل جاتے ہیں۔ اور اگر دریاؤں کے کواڑ کسی خاص محلِ وقوع سے کھول دیئے جائیں۔ تو انہار جاری ہو جاتی ہیں۔ اور وہ حسب طاقت جہاں تک پھیلاؤ حاصل کر سکتی ہیں، پھیل

جاتی ہیں اور زمینوں کو سیراب کرتی ہیں۔ جھیل اور حوض وغیرہ کے کواڑ کھول دینے سے ان کی وسعت کے مطابق ان کے قرب و جوار کے علاقہ جات اور کھیت وغیرہ سیراب ہوتے ہیں۔

پھر فرمایا۔ اولیاء اللہ سے بھی بفضل اللہ تعالےٰ اسی طرح درجات کے لحاظ سے کشف و کرامات علیٰ وجہ البصیرت اور علیٰ وجہ تقوےٰ صادر ہوتی ہیں۔ کسی سے زیادہ، کسی سے کم اور کسی سے کم تر۔ مگر یہ کرامات دینی تقویٰ پر ہی اعتبار حاصل کر سکتی ہیں۔ اگر اعتبار نہ کیا جائے۔ تو دنیا میں تقویٰ کا اعتبار معدوم ہو جائے جس سے ایک پر تاثیر اور نتیجہ خیز تبلیغ دین کا برھانی راہ بند ہو جاتا ہے اور لوگ کاملین وقت کے استفادوں سے محروم و متروک ہو کر متقیانہ حال سے محروم ہو جاتے ہیں۔

یہ واقعہ قبولیت اعتقاد اور مقبول اعمال کے درمیان ایک خلیج بن جاتا ہے۔ بہتر وہی ہے۔ جو بن دیکھے اللہ تعالےٰ کی قدرتی کرامات کو تسلیم کر لے۔ اور اس کے بھیجے ہوئے انبیاء و مرسلین کے معجزات پر ایمان لے آئے۔ اور اللہ و رسول کی اطاعت کرنے والے اولیاء اللہ پر اور ان کے مکاشفات و کرامات پر بھی اعتبار کرنا ضروری ہے۔

بیٹا! تم نے ایمانِ بالغیب کے ساتھ اللہ تعالےٰ اور اس کی قدرت پر اور اس کے بھیجے ہوئے انبیاء و مرسلین پر اور اطاعت گذلہ اولیا اللہ پر اپنا یقین مضبوط کر لیا ہے۔ اور اس واسطے یہاں تک تم دانش نورانی کی حاطفت میں اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم کے ساتھ اپنے اعتقاد کی حفاظت کرتے رہے ہو۔ میری تمنا ہے کہ میں خداداد احسانات کو جو مجھے صلحائے کاملین سے ملے ہیں۔ ان میں سے چند ایک تفویضات سے تمہیں بہرہ ور

کروں، تاکہ تم تقویٰ کے ساتھ خوشنودی رب حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکو اور تمہارے لیے ذریعہ ترغیب ہو کر تمہیں عملِ صالح دے سکیں اور یہ سلسلہَ دانشِ نورانی تمہارے لیے مزید ترغیب و تحریص کا ذریعہ بن سکے۔ یہ سلسلہ دانش نورانی، دانش برھانی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جن سے یقین کی دولت ملتی ہے۔ مجھے ان پند و نصائح کے بعد اللہ تعالےٰ کے حضور سجدہ ریز ہونے کی تعلیم دی گئی اور فرمایا کہ حالت سجدہ میں ننانوے بار سبحان ربی الاعلیٰ کی تسبیح مکمل کر کے پھر سجدہَ دوم کرو۔ اور اس میں بھی ننانوے بار سبحان ربیّ الاعلیٰ کی تسبیح پڑھو۔ پھر جو کچھ زبان سے میں تلقین کروں گا۔ اسکو خشوع و خضوع سے پورے خوف و رجا کے ساتھ پڑھتے جانا اور جب تعداد پوری ہو جائے۔ تو اللہ اکبر کو جہر سے پڑھ لینا۔ تاکہ میں تمہیں دوسرے کلام کی تعلیم دے سکوں۔

جب دو سجدوں میں ننانوے ننانوے بار سبحان ربیّ الاعلیٰ پڑھ چکا تو میں نے بالجہر اللہ اکبر پڑھا۔ اس کے بعد آپ نے تعلیم فرمائی۔ کہ اَللہُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرض کی اکتالیس مرتبہ تلاوت کرو۔ چنانچہ میں نے تعمیل کی پھر فرمایا۔ اکیس مرتبہ اَللہُ لَطِیف بِعِبَادِہ کی تلاوت کرو۔ میں نے بجا آوری کی۔ اس کے بعد فرمایا۔ یَانُورُ یَالَطِیفُ گیارہ مرتبہ ادا کرو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر فرمایا۔ ننانوے باریاوَدُود وَددنی پڑھو۔

اس کے بعد فرمایا۔ خاموشی کے ساتھ "یَانُورُ یَالَطِیف" پڑھتے رہو۔ جو کچھ نظر آئے۔ وہ مجھے بتاتے جانا۔ یہاں وظائف مذکورہ کی تجلیات ہوں گی۔ جو اپنے انوار عالم امر سے عالم خلق میں تمہارے میلان قلب پر نورانی شعاعیں نازل کریں گی۔ جن کی نورانیت میں تم اپنے دل کے ظاہری و

باطنی گوشوں کو دیکھ سکو گے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے معرفتِ نفس کا آغاز ہوتا ہے۔

چنانچہ چند لمحوں کے بعد میں نے دیکھا۔ ایک تیرہ و تار کمرہ میں میں کسی سخت سی چیز پر بیٹھا ہوں۔ اور وہ غلیظ ہے۔ اور کمرہ متعفّن ہے۔ جیسے وہاں عفونت کے ڈھیر ہیں۔ یا بد بودار مردے پڑے ہیں۔ جن کی بد بو نے میرے دماغ کو پراگندہ کر دیا۔ میں بے حد مضمحل ہوا۔ میں نے اپنا یہ اضمحال حاتِ سجدہ میں ہی والد بزرگوار کی سماعت کے لیے بیان کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔ یہ دنیا اور نفس ہے اور ساتھ ہی حدیث شریف کا حوالہ دیا۔

الدنیا جیفتہ وطالبہا کلاب

دنیا مردار ہے اور اس کا طالب کتا ہے۔ مگر اسلامی طریقہ سے دنیا حلال ہو جاتی ہے۔

پھر فرمایا۔ استقامت سے اسمائے باری تعالےٰ جاری رکھو۔ چند لمحوں بعد وہ کمرہ بلا کسی چراغ اور دوسری ظاہری روشنیوں کے بقعۂ نور ہو گیا۔ پھر میں نے اس نورانیت میں اپنے وجود کو سخت سیاہ دیکھا۔ ہر چیز سیاہ ہی سیاہ نظر آرہی تھی۔ وہ کمرہ اور اس کے درودیوار، اس کی ہر چیز، اس کی زمین میری روح کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ پھر روحانی نظر درودیوار سے بھی آگے نکل گئی۔ جیسے ظاہری نظر شیشہ سے پار ہو جاتی ہے۔ معاً میرے سامنے سے تمام تاریکیاں گم ہو گئیں۔ جہانِ انفس و آفاق میرے سامنے آ گئے۔ حدِ نظر تک مجھے سر سبز و شاداب دنیا نظر آنے لگی۔ اشجار و احجار اور ہر چیز نورانی نظر آنے لگی ایک پہاڑ نظر آیا۔

گویا کہ میں بھی اس میں موجود ہوں۔ ایک بلندی کے نشیب سے ایک نورانی چہرہ نمودار ہوا۔ وہ بہت سی بکریوں کے ہمراہ ان کی گلہ بانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وہ نورانی چہرہ مبارک میرے قریب تر ہوتا گیا۔ میں نے حضرت والد کی سماعت کے لیے یہ ماجرا ذکر کردیا۔

فرمایا۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام ہیں۔ جو بکریوں کی گلہ بانی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ جس سے فطری امور کے مطابق عالم اسباب کی محنت و مشقت مراد ہے اور نیز ایک اولوالعزم نبی اللہ کی عجز و انکسار کے ساتھ عبودیت کا اظہار ہے۔ نیز انسانیت کی گلہ بانی کی مشابہت ہے۔ یہ کہ ہادیانِ انسانیت، ظلماتِ دنیا اور ظلمات نفس و شیاطین کے دشت و جبل میں انسانیت کی اس طرح گلہ بانی کرتے ہیں۔

فرمایا۔ حضور سرور کائنات فخر موجودات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی امت کے علماء و مجددین "کانبیاء بنی اسرائیل" ہیں۔ جو اسی طرح ہر زمانہ میں ملت اسلامیہ کی گلہ بانی کریں گے۔ امت بار بار صراط مستقیم سے بھٹک کر منتشر ہوجایا کرے گی اور علماء و مجددین اسلام بار بار اسے نفس و شیطان کی گرفت سے آزاد کیا کریں گے اور ان کی گلہ بانی کے فرائض انجام دیں گے۔

معاً ایک بڑے اور سفید ترین کپڑے پر حروف جلی کی صورت میں سورۂ فاتحہ کی سات آیات لکھی ہوئی میرے سامنے فضا میں نظر آرہی ہیں جن کو میں بخوبی پڑھ سکتا ہوں۔

فرمایا۔ بیٹا! یہ سورۂ فاتحہ ہے۔ یہ سات آیات پر مشتمل ہے۔ جس کو سبع مثانی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یعنی سات آیات والی

سورت۔ یہ سالک کے لیے سات عقبات مرتب کرتی ہے۔ اس میں حمد باری تعالےٰ ہے۔ اور حمد بیان کرنے والا بندہ ہے۔ محمود مطلق خدائے لم یزل ہے۔ حمد بیان کرنے والے کے لیے محمودِ حقیقی یعنی خدا تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اولاً زبانی، بدنی اور مالی طور پر راہ سلوک میں سات عقبات دیئے گئے ہیں۔ کوئی بندۂ حامد بغیر تعین محمود کے حمد بیان نہیں کر سکتا اور تعینِ محمود کے بعد محبت محمود کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ بلا محبت حمد محمود قرینۂ تعریف کے خلاف ہے۔

فلہذا بندۂ حامد کے لیے راہ سلوک میں وصول الی اللہ کے لیے محبت کو عقبۂ اول قرار دیا گیا۔ اور محمود حقیقی سے مراد معبود حقیقی ہے جو الٰہ العالمین ہے۔ الٰہ کے معنی معبود کے ہیں۔ جو اللہ تعالےٰ کی صفت ہے۔ یعنی وہ اپنی ذات و صفات کے ساتھ معبود مطلق ہے۔ اس کی ذات و صفات دونوں قدیم اور غیر حادث ہیں۔ اس طرح معبودِ حقیقی سالک راہ کی منزل مقصود ہو اور اس منزل میں معبود مطلق سالک کا معشوقِ حقیقی ہو اور معشوق چونکہ اکبر ہے۔ اس واسطے اس کی منزل جملہ معشوقانِ مجاز سے بڑی اور طویل تر ہو گی اور معشوق کے منازل جتنے طویل ہوں گے، اتنے ہی زیادہ سالک کے لیے رازہائے منازل زیادہ ہوں گے۔

فلہذا سالک کا دوسرا عقبہ صفات باری تعالےٰ کی راہ کے لاتعداد اسرار و رموز ہیں۔ ذات مستجمع الصفات ہوتی ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے صفات کا ذریعہ ہی موجب قرب ہو سکتا ہے۔ اور ہر صفت معلوم ہونے سے پہلے پردہ راز میں مستور ہوتی ہے۔

اگر معشوق عالم مجاز سے ہو گا تو صفات بھی مجازی ہوں گے اور ایسے

معشوق کے لیے تمام محبت اور راز کے سہارے بھی مجازی ہوں گے۔ مگر ذات خدا کے لیے بندۂ حامد کا مخلوق ہونا ضروری ہے۔ اور بندۂ حامد کے لیے مشکل ترین مرحلہ قیام محبت ہے۔ چونکہ وہ خود مخلوق ہے۔ اور عالم خلق کا مسافر ہے۔ مخلوق کا بر سبیل مخلوق غیر مخلوق کا مفہوم کرنا بغیر استقامت ایمان کے اور بغیر بصیرت عارفانہ کے بہت مشکل ہے۔

بندۂ حامد کو بمعہ اپنے حمد کے تمام عالم خلق کو آیات و مظاہرات الہیہ سے تشبیہ دے کر ہی راہ سلوک میں قدم رکھنے کی اجازت مل سکتی ہے۔ اگر کہیں ذرہ برابر بھی انانیت کی جھلک موجود ہو۔ تو آئینۂ قلب دھندلا ہو کر سالک کے لیے حجاب بن جاتا ہے۔ اور وہ رک جاتا ہے۔

اس واسطے قیام محبت کے بعد معرفت نفس کے ساتھ معرفت عالم خلق ضروری ہے۔ یہ محبت کی نظر اول ہے۔ جو مزید راز پانے کے لیے عقبہ ثانی کے حاصل کرنے کا جذبہ دیتی ہے۔ محبت حقیقی کے عقبۂ اول میں عمل پیہم کے بعد ہی حقیقت کا سراغ ملتا ہے اور یہ سراغ سالک راہ کو صراط مستقیم پر قائم رہنے سے ہی مل سکتا ہے۔

اللہ معشوقِ حقیقی ہے۔ اور اس کے بندے اسی کی بتائی ہوئی راہوں پر چل کر اس کا راز پاتے ہیں اور یہی راہ انبیاء و صدیقین، شہداء و صالحین کی راہ ہے۔ یہ چار قسم کے راز دارانِ حقیقت سبیل دین پر چل کر عالمِ خلق کو عالم اسباب گردانتے ہیں اور رازدار حقیت بنتے ہیں۔

فلہذا احمد کی ادائیگی کے ساتھ ہی سالک حامد کا مقام پا جاتا ہے۔ اور بندۂ حامد بننے کے بعد فوراً ہی اسے راہ سلوک مل جاتی ہے اور راہ سلوک تعین منزل ہے۔ یہی تعین حامد کو راز کی طرف رکز دیتا ہے۔ طبیعت بھی راز کی

جانب منعطف ہو جاتی ہے۔ لہذا محبت عقبہَ اول ہوا۔ اور راز عقبہَ ثانی۔ اس کے بعد مجھے تقریباً ایک گھنٹہ سر بسجود رکھنے کے بعد سر اٹھانے کا ارشاد ہوا۔ میں نے تعمیلاً سر اٹھالیا۔ میں پسینہ میں شرابور تھا۔ مجھے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ ہمارا یہ ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا اپنے دامن میں دونوں جہانوں کی نوارنیت سمٹیے ہوئے ہے۔ ایک طرف میں اپنے والدین کی غربت، سادگی، غیر آسودہ حالی کو دیکھ رہا تھا اور ایک طرف ان کی ان کرامات کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو رہا تھا۔ جن کو انہوں نے ہمیشہ لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل رکھا اس پر مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ اتنی بڑی بڑی کرامات کے مالک کس قدر کسمپرسی کے عالم میں مقید ہیں۔ میں نے سوال کیا کہ ابا جان و امی جان آپ جب کہ اتنی بڑی بڑی کرامات کے حامل ہیں تو بظاہر یہ غربت اور افلاس کی یہ کیا صورت بنا رکھی ہے۔ جواب دیا یہ غربت نہیں بلکہ یہ انبیاء و مرسلین کی سنت ہے۔

# انیسواں باب

## سورۃ فاتحہ کی روشنی میں

## سات

## حامدانہ سلوک کے سات عقبات

میں متحیر تھا اور تحیر میں عرض کی ابا جان آپ میرے صرف والد ہی نہیں بلکہ ایک عظیم عارف باللہ ہونے کی حیثیت میں میرے مرشدِ کامل بھی ہیں۔ آپ نے مجھے براہین سے ہمکنار کر دیا۔ آپ نے میرے مظنون شبہات عقلی کو معدوم کر دیا۔ آپ نے مجھے بندہ خدا ہونے کی راہ پر ڈال دیا۔ آپ میرے بہت بڑے محسن ہیں۔ آپ نے نہ صرف حقِ پدری ادا کیا بلکہ آپ نے حقِ اسلام بھی پورا کر دیا آپ نے حق العباد کے عملی ترجمہ سے بندگی کے جود و سخا کا حق ادا کر دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر ہاتھ چوم لیے۔ آپ نے مجھے اپنے سینۂ اقدس سے لگایا اور دست شفقت سر پر رکھ کر فرمایا۔ بیٹا! دنیا مستعار ہے۔ ایمان کی قندیل کو اہل ایمان کے سینوں میں روشن کرنے والی صرف خدا کی ذات ہے۔ یہ سلسلہ عرشِ عظیم سے خدائے لم یزل نے شروع کیا۔ پھر جملہ انبیاء نے اس دستور العمل کو جاری رکھا۔ پھر ختمی مرتبت آخرالزمان ﷺ کے بعد سلسلۂ نبوت منقطع ہو گیا۔ مگر علمائے ظواہر اور علمائے بواطن کے ذریعہ ولایت کا سلسلہ

حد قیامت تک جاری رہے گا اور ایمان کی قندیلیں علماء و اصفیاء کے ذریعہ لوگوں کے سینوں میں منتقل ہو ہو کر جگمگاتی رہیں گی۔

یہ محض اللہ تعالےٰ کا فضل و کرم ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے، عنایت فرمایا ہے مگر اس عنایت کے بعد محتاط ہونا اور اسلامی تقوےٰ کے دائرے میں رہنا ضروری ہے ورنہ یہی عنایات خلافِ تقویٰ مصرف میں لانے کے بعد انسان کفرانِ نعمت کا شکار ہو جاتا ہے۔

فرمایا۔ دو رکعت نماز نفل بطور شکرانہ ادا کرو تاکہ میں اس کے بعد باقی پانچ عقباتِ سلوک سورۂ فاتحہ کی روشنی میں بیان کر کے حقِ تفویض پورا کروں۔ چنانچہ میں نے دو رکعت نماز نفل بطور شکرانہ ادا کیے۔ اس کے بعد آپ نے اپنے سابقہ بیانِ عقبات پر روشنی ڈالنی شروع کر دی۔

فرمایا عقبۂ محبت تمام عقبات سلوک کی جڑ ہے۔ جس طرح علم العقائد کی جڑ کلمۂ طیبہ ہے۔ جس کے بغیر دوسری بنائیں کالعدم ہو جاتی ہیں۔ بعینہ راہ حقیقت میں سچی محبت کے ساتھ آغاز کرنا سلوک کی جڑ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی سچی محبت سینۂ سالک پر اتر آتی ہے پھر محبت کی اپنی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ درِ نیاز تک رسائی حاصل کرانے کے لیے منزل کی جستجو کرے۔ اس کے بعد راز کی جستجو محبت کی فطرت اور میراث ہے۔ بلا محبت راز کی جستجو نہیں ہو سکتی۔ محبت قدم اول ہے اور راز قدم ثانی۔ یہ دو قدم اگر صحیح طور پر اپنے نصب العین کی طرف اٹھ جائیں تو گویا سالک نے منزلِ لاءیں قدم رکھ دیا۔ جس کو اصطلاحِ تصوف میں منزلِ نفی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بندۂ حامد کو حمدِ باری تعالےٰ کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے ذکر

اثبات کو نصب العین بنا کر اس کے بعد ذکر نفی کرے اور ذکر نفی کے دوران بندہ قلب محبت اور ماہیت محبت سے بے خبر نہ ہو ورنہ کیا تعجب کہ دورانِ نفی میں موت واقع ہو جائے اور متروک عن الاثبات ہو کر ایمان سے محروم ہو جائے۔ روح کا سلیم الطبع ہونا اور مقصد پر نظر رکھ کر نفی کی مشق کرنا چاہیے۔ بغیر متشرع مرشد کی تلقین و نظر کے راہِ نفی اختیار کرنا اور ایسے ویرانہ بے مشعل میں قدم رکھنا مہلک ترین خطرات سے ہے۔ مگر فرمایا کہ لاالہ الا اللہ محمد الرّسول اللہ پڑھ کر ایک طویل مدّت تک اس پر مراقبہ کرنا چاہیے۔ جب اللہ تعالےٰ کی الوہیت کا اثبات دل میں قرار پکڑ جائے۔ تو اس کے بعد اپنے وجود سمیت ہر چیز کو ماسوا اللہ قرار دے دے۔ پھر بھی اثبات پر نگہداشت رکھتے ہوئے ماسوا اللہ پر مراقبہ کرے۔ جب ماسوا اللہ مجموعی طور پر غیر اللہ نظر آنے لگے اور دل ماسوا اللہ کو غیر اللہ سمجھ لینے کی تصدیق کرے۔ اس وقت سات مرتبہ غیر اللہ کو ماسوا اللہ قرار دینے کے لیے ذکرِ نفی کرے اور آٹھویں مرتبہ الااللہ ضربِ قلبی کے ساتھ پڑھے۔ پھر سات دفعہ نفی کو اثبات کے ساتھ اس طرح پڑھے لاالہ الا اللہ، الاّ اللہ، الاّ اللہ۔ پھر پورا کلمہ پڑھ کر ایک دور مکمل کرے۔ اس طرح ننا نوے دور کرے۔ اس کے بعد باوضو مراقبہ یا قیلولہ کی صورت میں تقریباً آدھ گھنٹہ آرام کرے پھر اٹھ کر حسبِ دستور نفی و اثبات کا ذکر کرے۔ جب مکمل تھکان محسوس کرے تو ننا نوے مرتبہ درود شریف اور بسم اللہ کی معیت میں الحمدللہ پڑھے اور بعد دو رکعت نماز استخارہ کے رو بقبلہ ہو کر سو جائے تا کہ اس کی نیند بھی بندگی میں شمار ہو۔

اس طرح چالیس یوم پورے کرے مگر ان چالیس ایام میں کسی قسم

کی خارجی حرص و ہوا کو اپنے دل میں نہ آنے دے حتیٰ کہ مراقبہ و مکاشفہ میں بھی کسی چیز کے دیکھنے کا لالچ نہ کرے۔ سوائے اس مقصد کے جو زیرِ نظر ہے۔ سالک کا ایک ہی نصب العین ہے جو ماسوا اللہ کو پھاند کر اللہ کو پانا چاہتا ہے۔

اثبات کے ادراک کے لیے نفی کی مشق کی جاتی ہے اور نفی کو اثبات سے ماقبل رکھا گیا ہے تاکہ اثبات سے پہلے سالک ماسوا اللہ کی نفی کر سکے ورنہ نفی و اثبات دونوں کا اشتراک عقیدۂ توحید کو متزلزل کر سکتی ہے۔ اثبات کے اقرار و محبت سے متروک ہو کر ذکرِ نفی معارفِ اثبات سے محروم کر دیتا ہے۔

عُقبۂ محبت اور عُقبۂ راز کا نصب العین نیازِ حقیقت ہے۔ جس کو سالک عارفانہ طور پر وصول کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ لہٰذا عُقبۂ ثالث ترتیب کے لحاظ سے عقبۂ نیاز کہلائے گا۔ ان تین عقبات کی آئینہ داری

"اَلحمدُ للہ رَبِّ العٰلمِین۔ اَلرَّحمٰنِ الرَّحِیم۔ مٰلِکِ یَومِ الدِّینِ

تک ترتیب آیات میں ہو جاتی ہے۔ اللہ محمود و معشوقِ مطلق ہے۔

ربُّ العٰلمین سلوک میں راز کی وہ منزل ہے جس میں سالک کو ہر چیز پروردگارِ عالمین کی صفتِ ربوبیّت کے تصرف کے ساتھ معراجِ کمال تک پہنچتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جہاں اسے اپنے مراقبہ میں کمالِ سلوک تک رسائی حاصل کرنے کے لیے رجا کامل ملتی ہے۔

الرحمٰن میں سالک قیامت تک غائت رحمت کی امید پا کر اپنے حال کو مستقبل کے لیے تیار کرتا ہے اور راہِ سلوک میں قدم رکھتا ہے۔ وہ قدم

اول پر ہی اپنے سفر کو لامتناہی قرار دے کر آگے بڑھتا ہے۔

الرحیم۔ میں وہ اپنے سلوک متقیانہ کے ساتھ یوم قیامت پر بخشش کی امید پاتا ہے۔ جس پر اسے عدالت خداوندی میں شاہ و گدا، عوام و خواص نفسی نفسی پکارتے ہوئے نظر آتے ہیں اور شفیع المذنبین علیہ الصلوٰۃ والسلام اسے امتی امتی پکارتے ہوئے نظر آتے ہیں اس مقام پر سالک

مَااتکم الرّسُولُ فخُذوہ و ما نھکُم عنہ فانتھو

پر کار بند ہو جاتا ہے۔ وہ شفیع المذنبینؐ کی ہدایت پر عمل پیرا ہو کر شفاعت کا متمنی ہوتا ہے اور اسے اللہ تعالےٰ کے اس بے پایاں احسانِ عظیم کے سامنے جو اہل ایمان پر بعثت آخرالزمان علیہ التحیۃ والتسلیم کے ذریعہ فرمایا، سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے اور اس کے بعد وہ کتاب و سنت کی روشنی میں بربنائے تقویٰ راہِ سلوک پر بڑی احتیاط اور محنت سے ریاضت کرتا ہے۔ اسلام کی اصطلاح میں سچی ریاضت ہی راز و نیاز حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ یہ ریاضت سالک سے چند مشکلات کے طے کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔

ریاضت اس محنت شاقہ کا نام ہے جو شرعی اصول و قواعد کی پابندی میں اس طرح کی جائے کہ مرضیاتِ معبود کے مطابق جو جو مراحل درپیش آئیں چاہے وہ کتنے ہی کٹھن کیوں نہ ہوں ترتیب سے مشقت کے ساتھ انہیں برداشت کیا جائے اور اس مشقت میں اہل سلوک راحت پاتے ہیں۔

چونکہ یہی مشقت ان کے لیے ذریعۂ رضا جوئی ہوتی ہے۔ ریاضت سے پہلے قناعت کا مرحلہ درپیش آتا ہے۔ اور قناعت سے قبل مرحلۂ فاقہ

ہے۔ اس ترتیب سے فاقہ چوتھا عقبہ بن جاتا ہے جو راہِ سلوک کی ایک دشوار منزل ہے جسے سالک تزکیہٗ نفس کے لیے اختیار کرتا ہے۔ یا منزلِ عشق میں اضطراراً بھی درپیش آجاتا ہے۔

فاقہ کوئی ایسی مسلسل مشق کا نام نہیں۔ جس سے ہلاکت مراد ہو۔ بلکہ فاقہ باقناعت ترتیب سلوک کے مطابق بہتر قرینہ ہے۔ قناعت خداداد عنایات پر برضا اکتفا کر لینے کا نام ہے تاکہ سالک غیر متوکل نہ ہو جائے۔ اس واسطے کہ توکل باللہ بے جا حرص و ہوا اور بے صبری سے بچنے کے لیے ایک اسلامی طریقہ ہے۔ جس کا تعلق محض اللہ سے ہے۔

فاقہ بالمحبت راہ سلوک کا چوتھا عبقہ ہوا اور قناعت بالتوکل پانچواں عقبہ ہوا جس نے سالک راہِ محبوب میں دقیق سے دقیق ریاضت کرنے پر بخوشی آمادہ ہو جاتا ہے گویا فاقہ اور قناعت سالکانہ ریاضت حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اس طرح کمالِ سلوک کا ذریعہ ریاضت ہوئی۔

فرمایا۔ اس ترتیب سے ریاضت راہ سلوک کا چھٹواں عقبہ بن جاتی ہے۔ منازل سلوک کا منبع محبت الٰہی ہے اور محبتِ الٰہی کے قرینے جن منزلوں کو چاہتے ہیں۔ ان میں ایک عقبہ ایسا ہے جو ان چھ منازلِ عملی کا محور ہوتا ہے۔ وہ وسیلہٗ مرشد ہے جس کی ضرورت تعمیل حکم شریعت کی بجا آوری کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ بغیر امیر رشد و ہدایت کے پابندیٔ احکام نہیں ہو سکتی۔ یہ مرشد دینی ہدایت حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

بغیر وسیلہ کے طریقِ کار کی تجویز نہیں ہو سکتی اور بغیر تجویز و تشکیل کے کسی عمل کو صحیح نہج نہیں مل سکتی اور صحیح نہج کے بغیر تعینات کا تعارف نہیں ہو سکتا اور بغیر تعارفِ تعینات منزل سے بھٹک

جانے کا احتمال ہوتا ہے۔

اس واسطے وسیلہ ایک ایسا عقبہ سلوک ہے جو سالک کی منزلِ اولیٰ سے منزلِ آخر تک معیت چاہتا ہے۔ یہ معیّت، معیت طریقت کہلاتی ہے۔ اور طریقت معیتِ شریعت چاہتی ہے۔ اس طرح وَابتَغوآ اِلیہِ الوَسِیلتہ یعنی وصول الی اللہ کے لیے ایسی طریقت کی ضرورت ہے۔ جو شریعت کی پابند ہو۔ آیت کا ترجمہ۔ کہ اللہ تک پہنچنے کے لیے وسیلہ چاہو۔

ترتیب کے ساتھ دینِ اسلام نے ہدایت کا پہلا قرینہ ایمان باللہ و ایمان بالرسول کو قرار دیا اور یہ ایمان ہی دین بن جاتا ہے۔ اللہ اور رسول کے حکم سے جو جو احکامات ملیں، وہی دین ہوتے ہیں۔ اسلام میں پہلے ولی اللہ خلفائے راشدین تھے۔ جن کا ذریعہ ایمان تعمیل حکم خداوندِ ذوالجلال اور تعمیل حکم رسول کریم علیہ الصلوۃ والسّلام تھا۔ اس کے بعد دین کے جملہ عوامل کو حکم خدا اور رسول کے مطابق ہی عمل میں لایا گیا اور امرو نواہی پر مکمل عمل پیرا ہو کر اصحابِ رسول کریم علیہ الصلوۃ والسّلام نے ہی عملاً طریقِ دین کی احیاء کی۔

اسی طریقۂ دینیہ کو اصطلاحِ شرع میں طریقۂ محمدی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ جس کے معنی سنت خیر الانام کے آتے ہیں۔ ان مسنون طریقوں پر جو اعمال مرتب ہو کر کرامات اولیاء بنتے رہے۔ ان کا پہلا اجراء کرامات اصحاب رسول اکرم علیہ الصلوۃ والسّلام کی صورت میں واقع ہوا۔

تیسرا اجراء تابعین کی صورت میں رونما ہوا جنھوں نے اصحاب رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طریقت کو وصول الی اللہ کا ذریعہ بنایا۔

چوتھا اجراء تبع تابعین کی کرامات پر مرتب ہوا۔ جنہوں نے تابعین کی طریقت شرعیہ پر عمل پیرا ہو کر سنت خیر الانام کی پیروی کی۔ اس کے بعد ابدالآباد تک یہی چار مراحل جو ختم نبوت کے عملی خوارقات و معجزات پر مرتب ہو کر مسنون ہوئے، جاری وساری رہیں گے۔

طریقت اسلامیہ کا شجرۂ عہد ہر قسم کے اسلامی معاہدوں سے متعلق ہو کر بر سبیل شریعت طریقت نبی کریم علیہ الصلوۃ والسّلام سے مل جاتا ہے۔ اس واسطے عہد بیعت اگر شریعت کے مطابق ہو تو وہ مسنون طریقہ ہے جس پر طریقت کی بنیاد ڈالی جاتی ہے۔ اس طرح کی طریقت کا اخذ شریعت اسلامیہ سے ہوتا ہے اور ایسی طریقت بڑی تعمیلی و تقلیدی عرق ریزی پر مرتب ہو کر تفاصیلِ بندگی کی وضاحت کرتی ہے۔ جس طرح علوم اسلامیہ نے علماء کی علمی عرق ریزی پر علوم کے تراجم و تفاسیر اور تشریحات و تفصیلات اور توضیحات وغیرہ کی ایجاد کی۔ صرف و نحو اور منطق و معقول کی طرحیں ڈالیں۔ بالکل اسی طرح علومِ تصوف نے بھی تعمیلی و تقلیدی عرق ریزیوں پر بناء طریقت استوار کی۔

فلسفۂ اسلام کی جہاں اہل علم نے فاضلانہ تشریحات فرمائیں، وہاں اہل سلوک عارفین باللہ نے بر سبیل علوم دینیہ طریقت مسنونہ پر فلسفۂ علم و عمل دونوں کی علمی و عملی تشریحات کر کے خوارقات کو نتیجۂ بندگی ثابت کر دیا۔

یہ کہ تعمیل احکامات الٰہیہ کے ضمن پر جہاں عاقبت نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔ جہاں نیک اعمال کی نیک جزائیں ملیں گی۔ وہاں اس دنیا میں بھی اعمالِ اسلامیہ کی بجا آوری میں انسان اہلِ کفر کے استدراج کو باطل کرنے

کے لیے کرامات اسلامیہ کا ایک نتیجہ خیز برھان بن سکتا ہے۔ فرمایا راہ طریقت راہ شریعت دونوں میں وسیلۂ ضروری ہوتا ہے۔ بشرطیکہ شیخ صاحب ہوش ہو۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کم از کم حلال و حرام کا علم رکھتا ہو اور اس کا سالکانہ حال ہمہ وقت شریعت کا پابند ہو۔ یا کم از کم حالت افراط میں دینی روشنی کے ساتھ اعتدال کی طرف رجعت کرنے والا اور توبہ کرنے والا ہو۔ ایسا مرشد طریقت یقیناً راہ حق میں بہتر وسیلہ ہو سکتا ہے۔ اور بغیر مرشدِ کامل کے راہِ طریقت عبور کرنا مشکل ہے۔

# بیسواں باب

## وسیلہ مُرشد طریقت و شریعت
## کے ساتھ ہی مکمل ہو سکتا ہے۔

ابا جان کے اس انداز نصیحت نے مرشد کی شرعی حیثیت مجھ پر واضح کر دی اور طریقت بالوسیلہ کی تعریف سمجھ میں آگئی۔ وہ یہ کہ مرشد کے معنی ارشاد کرنے والے کے ہیں اور مرید کے معنی صاحبِ ارادت کے ہیں۔

محض ارشاد تو کوئی ارشاد بھی ہو سکتا ہے اور محض ارادت تو بُری بھلی ارادت بھی ہو سکتی ہے۔ مگر طریقت میں مرشد کے ارشادات کے معنی شریعت اسلامیہ یعنی کتاب و سنت کے مطابق ارشادات ہیں اور مرید کی ارادت کے معنی شریعت کی روشنی میں کسی متشرع مرشدِ کامل کے ساتھ ارادت کو وابستہ کر کے صراط مستقیم حاصل کرنے کے ہیں۔ اگر مرشد و مرید دونوں غافلِ شریعت ہو کر مرشد و مرید بننا چاہیں۔ تو یہ محض ان کا اپنا اختراعی اور وہمی مفروضہ ہو گا۔ جس کو کوئی عام آدمی بھی رسم و رواج دے سکتا ہے۔ اصلاً طریقت کی ابتداء و انتہا شریعتِ اسلام ہے اور شریعت وسیلۂ اعظم ہے۔

چونکہ سب مرشدینِ طریقت نے دین ہی سے اکتسابِ فیض کیا ہے اور مرید بھی بر سبیلِ دین ہی مرشد کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے۔ یہ

بیعت اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ میں سنتِ رسول کریم ﷺ کے مطابق حلال و حرام میں تمیز کروں گا۔ چاہے یہ عہد نامہ مرید کی ارادت سے ظہور پذیر ہو۔ چاہے دعوتِ مرشد سے عمل میں آئے۔ بہر طور یہ عہد نامہ اسلامی احکامات کی روشنی میں ہوتا ہے۔ اس لیے وسیلۂ اوّل دین اور وسیلۂ دوم طریقت اور وسیلۂ سوم مرشد کامل ہے۔ یہ ترتیبِ وسیلۂ استعانت باللہ حاصل کرنے کے لیے ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

ترجمہ۔ اللہ تعالے سے استعانت مانگو، صبر اور نماز کے ساتھ۔ اور اس طرح سے استقامت و استعانت حاصل کرنا بڑا مشکل ترین کام ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو اللہ تعالے سے ڈرنے والے ہیں اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں کہ انجام کار انہوں نے اپنے پالنے والے کے سامنے اپنی زندگی کے نیک و بد ہونے کا جواب دینا ہے۔ اور ہم انجام کار اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اس آیت میں اگرچہ صبر و استقامت کے ساتھ نماز پڑھنا دشوار بتایا گیا مگر یہ دشواری عوام کے لیے ہے۔ جن کے دلِ خشیّت ربانی سے خالی ہوتے ہیں۔

اور وہ لوگ جو اہل اللہ ہیں اور ان کے دل میں خوف الٰہی موجود ہوتا ہے وہ انجام کار کو سامنے رکھ کر بڑی احتیاط سے ارکانِ صلوٰۃ کے ساتھ اپنی استقامت صابرانہ کا ثبوت دے کر استعانت بالصبر والصلوٰۃ کا مقام پا لیتے ہیں۔

مگر اس آیت میں اللہ تعالٰے نے جمیع مومنین و مومنات کو خطاب فرما کر استقامت اور نماز کے وسیلہ کے ساتھ استعانت حاصل کرنے کا حکم دیا ہے اور اس تعمیلِ حکم کی ادائیگی سوائے خاشعین کے دشوار قرار دی گئی ہے۔

اس میں ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ تمام مومنین و مومنات اس حکم کی بجا آوری کریں مگر ساتھ ساتھ ان کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ایسی استعانت کون لوگ کر سکتے ہیں۔ اس آیت میں ایسے لوگوں کی جو صبر و صلوٰۃ کے ساتھ استعانت حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کی تعریف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے ساتھ واضح فرما دی اور ایسے لوگوں کو اِنّھا لکبیرۃ سے مستثنٰے کر کے عام لوگوں پر امتیاز عطا فرما دیا۔

یہ ظاہر ہے کہ ایک جماعت کے سامنے ایک مشکل ترین مسئلہ پیش کر کے ساتھ ساتھ شرائط بھی بیان کر دیئے جائیں کہ اس مسئلہ کو وہی لوگ حل کر سکتے ہیں جو فضیلت علم کے مالک ہیں تو صاف واضح ہو گیا کہ جاہل لوگ یہ مسئلہ حل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ بلکہ اس مسئلہ کو حل کرنا صرف اہل علم کا کام ہے اور جاہلوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے علماء کی طرف رجوع کریں اور ایسے مشکل مسئلہ کو سمجھنے کے لیے علماء کا وسیلہ پکڑیں اور ایسے کمزور گروہ کو تفہیم و افہام کے لیے علماء کے وسائل کی ہمیشہ احتیاج ہوتی ہے۔ یہ فائدہ ہے کہ ہر کمزور کو قوی کی احتیاج ہوتی ہے اور یہی احتیاج اکتسابِ فیض پر مجبور کرتی ہے اور جس سے اکتساب کیا جائے۔ وہ وسیلہ ہو جاتا ہے۔ اگر بالاتفاق فیض ہو بھی جائے تو اس میں اصولی کمزوریاں باقی رہ جانے کا امکان ہوتا

ہے۔ سلسلہ وار درجات سے گذر کر کسی فیض کا بکمالِ اکتساب تکمیل نصاب کو مکمل کر لینے پر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

علم دین تقویٰ کے لیے ضروری ہے جو ایک مکمل نصاب ہے جس کی تحصیل علمائے دین کے ذریعہ ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح حاصل شدہ علم کی روشنی میں اعمالِ اسلامیہ کی باریکیوں پر عمل کرنے اور ان کو تکمیل دینے کے لیے علمائے اسلام کو بھی ان فاضلینِ سلوک کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ جنھوں نے علمِ دین کے بعد اعمال دین کو تقلیداً مکمل کیا ہو۔

ان فاضلین علوم دینیہ کو اکتسابِ علومِ دینیہ کے بعد شیوخِ طریقت کی طرف تکمیل عبادات و معاملات اسلامیہ کے لیے اور تکمیلِ معاشرت و اخلاق کے لیے رجوع کرنا ضروری ہے تاکہ ریاضت میں شیخ کا وسیلۂ نگرانی کے لیے میسر آجائے۔

چونکہ ریاضت مقصدِ دین ہے اور مشکل ترین منزل ہے۔ علماء اگر عرفاء کا وسیلہ نہ پکڑیں تو یہ تجاہل عالمانہ ہو گا جو عالم کو اکتساب فیضِ نظر سے محروم کر دے گا۔ اسی حالت میں اعمال کی باریکیاں اس پر واضح نہ ہو سکیں گی اور وہ اپنی توجیہات ظنی کا شکار ہو جائے گا اور اس کی توجیہات یقیناً اسے سہل پسند بنا دیں گی اور ان کی یہ سہل پسندی عوام پر بھی اثر انداز ہو گی۔ جس سے تن آسانی رواج پکڑ جائے گی۔ عالم جب عملی زندگانی میں توجیہات کر کے گمراہ ہو جائے تو اذضلّ العالِمَ ضلّ العالَم یعنی عالم دین کی گمراہی جہان بھر کی گمراہی کا باعث بن جاتی ہے۔

طریقت کے وسائل بدعت کے لیے نہیں بلکہ عوام و خواص کی

عملی رہبری کے لیے عمل رسول پاک علیہ الصلوۃ والسلام اور عمل اولیائے صالحین کے مطابق طریق عارفانہ کے طور پر تشکیل دیئے گئے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالے کی طرف سے بالاستقامت نماز کے ساتھ امداد طلب کرنے کی سب مسلمانوں کو دعوت دی گئی ہے۔ مگر بوجود اس حکم عامہ کے ان پر اسی وسیلۂ استعانت کو گراں ثابت کرکے خاشعین کو یہ فضیلت دی گئی ہے کہ وہ شرطِ تقویٰ کی تکمیل کے ساتھ باصبر نماز کے وسیلہ سے استعانت حاصل کرلیتے ہیں۔ وہ اپنے ایمان وایقان میں عبادات ومعاملات اسلامیہ کی ادائیگی کے ساتھ یوم جزا پر بھی مکمل اعتقاد یافتہ ہوتے ہیں۔

یہ آیت اپنے سیاق وسباق کے ساتھ غیر خاشعین پر خاشعین کو فضیلتِ تقویٰ کے ساتھ ممتاز کردیتی ہے۔ لہذا ہر غیر خاشع کو چاہیے کہ وہ عالم دین ہو یا غیر عالم دین، اکتساب فیض کے لیے شیوخِ طریقت کی طرف رجوع کرے ورنہ یہ علامت تکبر یا بد نصیبی ہوگی۔

نماز روزہ حج وزکوۃ کے ارکان کوئی بھی یاد کرسکتا ہے۔ مگر ان کے روحانی اور باریک رموز پر عمل کرنے کے لیے رجال اللہ کی اطاعت مؤکد ہے۔

شیوخ القرآن کے وسیلہ سے رموزِ قرآن حاصل ہوتے ہیں اور اس کی باریک ہدایتیں طالب قرآن پر واضح ہوتی ہیں اور شیوخ الاحادیث سے فقیہانہ باریکیاں سمجھنے کا اکتساب ہوتا ہے اور شیوخ ادب سے ادب اور شیوخ علومِ دینیہ سے دین کی باریکیاں حاصل ہوتی ہیں۔

جملہ علوم معلومات کے لیے ہیں اور معلومات میں علوم و اعمال

دونوں شامل ہیں۔ اسلامی علوم و اعمال تربیت چاہتے ہیں اور تربیت یافتگان ہی وسیلۂ اکتساب علم و عمل بن سکتے ہیں۔

اس واسطے عالم اسباب میں رہ کر وسائل سے انکار کرنا طبیعت کو کذب پر آمادہ کرنے کے مترادف ہے۔ وسیلہ حق ہے۔ وسیلہ ذریعہ یا سبب کو بھی کہا جاتا ہے۔ جو لوگ خدا کی ذات کو وسیلہ قرار دیتے ہیں وہ اصول راہِ حقیقت سے ہٹ کر ایسی جسارت کرتے ہیں۔ وسیلہ یا سبب یا علت تینوں اصطلاحات مخلوق کے لیے ہیں۔

وسیلہ دو چیزوں کے درمیان کسی تیسری چیز کا نام ہوتا ہے۔ جیسے خدا اور رسول کے درمیان حضرت جبریلِ امین ایک قاصدانہ وسیلہ تھے۔ جیسے انسانوں اور خدا کے درمیان انبیاء و مرسلین وسیلہ ہیں۔ اگر دو چیزوں کو ہٹا دیا جائے تو وسیلہ از خود عبث ٹھہرتا ہے۔ ہر چیز کے لیے ایک علت ہوتی ہے۔ یعنی سبب یا وسیلہ یہ تینوں نام خلق ہیں۔ لہذا ان میں نقص ہے اور خداوند ذوالجلال کی ذات ہر قسم کے نقص سے ذاتاً اور صفاتاً پاک ہے۔ ہر علت کا کوئی معلّل ہوتا ہے اور ہر سبب کا کوئی مسبب ہوتا ہے۔ وسیلہ سبب ہے اور اس کا مسبب اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات علت و سبب نہیں ہو سکتی۔ بلکہ وہ ذات معلّل و مسبب ہے۔ اس دلیلِ قطعی کے اعتبار سے خدا سبب یا وسیلہ نہیں ہو سکتا۔ ہر چیز جو پیدائش سے تعلق رکھتی ہے، وہ خود کسی دوسری چیز کا وسیلہ ہے اور دوسری چیزیں اس کے لیے وسیلہ ہیں۔

عالم اسباب کی ہر چیز انسان کے لیے وسیلہ ہے۔ انسان اپنی مختلف خصوصیات کے ساتھ ایک دوسرے کا وسیلہ ہیں۔ ہر مسلمان

مسلمان کا وسیلہ ہے۔ خواص عوام کے لیے اعلیٰ و اکرم وسیلہ ہیں اور عوام خواص کی امداد و اعانت کا ذریعہ ہیں۔ حکمران رعیت کے لیے وسیلہ، رعیت حکمرانوں کا وسیلہ تعمیل ہیں۔ استاد شاگردوں کا مکرم وسیلہ ہیں اور شاگرد احترامِ استاد کا وسیلہ ہیں۔

# اکیسواں باب

## اَخصّ الخواص کی راہنمائی خواص و عوام کے لیے

اولیاء اللہ اس گروہ اسلامی کا نام ہے جو علوم دینیہ کی روشنی میں تقویٰ پائے اور تقویٰ کی روشنی میں اعمالِ صالحہ کرے اور اعمالِ صالحہ کی روشنی میں بصیرت عارفانہ پائے اور بصیرت عارفانہ کی روشنی میں اعمالِ صالحہ کی باریکیاں معلوم کرنے اور ان باریک تر راہوں کو عبور کرنے کا مستعدی کے ساتھ عزم کرے۔ سنت اللہ اور سنتِ رسول اللہ علیہ الصلوۃ والسلام تک رسائی پا کر تقرب حاصل کرے اور تقرب سے مقام اعتراف حاصل کرے۔

طریقت کی یہ وہ تربیت ہے۔ جس پر سلوک ملتا ہے۔ ایسی طریقت باشریعت ہوتی ہے۔ اگر ان لوگوں کا وسیلہ نہ پکڑا جائے تو آدابِ تقویٰ کون سکھائے گا۔ لہذا اولیاء اللہ کے وسیلہ کی راہ سلوک یا غیر سلوک میں بہر حال ضروری ہوتی ہے۔ عوام ان کے وسیلہ سے دینی اعمال کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس رجوع کے بعد ان میں محبت و اطاعت پیدا ہوتی ہے اور اس طرح کچھ مدت کے بعد ان میں سے اہل خلوص مرتبۂ سلوک تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں اور خواص ان کے رموزِ عارفانہ کا تعجیلاً مفہوم کرنے

کے بعد جلد ہی جادۂ سلوک پر چل پڑتے ہیں۔ جیسے حضرت رومی رحمتہ اللہ علیہ اپنے وقت کے بڑے متبحرین علمائے وقت سے تھے اور نماز روزہ، حج و زکوۃ کے بھی پابند تھے اور صاحبِ حکمت و موعظت بھی تھے۔ مگر حضرت شاہ شمس تبریز رحمتہ اللہ علیہ کی ایک مجلس نے ان کی کایا پلٹ دی۔ جس کا حضرت رومی نے خود اعتراف کیا کہ رومی مولائے روم کا مقام نہ پا سکتا۔ اگر اسے شاہ شمس تبریز رحمتہ اللہ علیہ کی غلامی کا شرف نہ نصیب ہوتا اور حضرت خواجہ غریب النواز قطبِ زماں معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت مخدوم داتا گنج بخش ہجویری کے مزار کی قربت میں بیٹھ کر یہاں تک اعتراف فرمایا۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نورِ خدا۔

ناقصاں راپیرِ کامل کاملاں را راہنما

حضرت خواجہ غریب نواز رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے اس تقرب سے جو استفادہ کیا اور اس کو ایک مختصر شعر کے ایک بند میں بیان کر دیا اس استفسار میں اخص الخواص کی راہنمائی خواص و عوام کے لیے ثابت کر دی۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ نے ایک پرہیز گار گھرانے میں پرہیز گار والدہ کی عاطفت میں طفولیّت سے لے کر عنفوانِ شباب تک تربیّت پائی۔ بچپن ہی سے آپ کے کرامات ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے۔ متقی ماں کو ان کرامات کے ظہور پر اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کرامات کی وجہ سے فرید الدین اطاعت اسلام میں غفلت شعار نہ ہو جائے اور ریاضت ترک نہ کر دے اور صاحبِ سکر مجذوب نہ ہو جائے۔ آپ نے اس

کے ردّ عمل کے لیے مزید ریاضت کے ساتھ تزکیۂ نفس کے لیے بستی کی شہرت سے دور رکھنے کے لیے جنگلوں میں بھیج دیا گئی بارہ برس حضرت گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ بیابانوں میں رہے اور تزکیۂ نفس کرتے رہے۔ اس حالت میں حضرت بابا جی پر مزید انکشافات و کرامات کی ایزاد ہوئی آپ نے ایک درخت کے سائے میں، جب کہ آرام فرما رہے تھے، چڑیوں کے شور و غل سے غصّہ میں آ کر بد دعا کر دی وہ مر گئیں دوبارہ سینہ پاک میں رحم و کرم موجزن ہوا آپ نے ان کے زندہ ہونے کی دعائے خیر کی اللہ کے فضل و کرم سے وہ چڑیاں زندہ ہو گئیں۔

آپ نے جنگلوں میں اتنی ریاضت کی کہ کاٹھ کی روٹی پیٹ پر باندھ رکھی تھی جب بھوک زور پکڑتی تو اس کاٹھ کی روٹی پر ہاتھ رکھ کر نفس کو فرماتے کہ تھوڑی دیر بعد تمہیں یہ روٹی کھلاؤں گا اس طرح آپ نے کئی برس جنگلوں میں متقیانہ عبادات کے ساتھ اپنا چلہ پورا کیا اور اس دوران جنگل کے درختوں کی کونپلیں توڑ توڑ کر کھاتے رہے۔

بارہ برس کے بعد جب گھر لوٹ کر آئے تو ماں نے مزید راہ سلوک درست کرنے کے لیے صالحانہ نصیحت کی راہ ڈھونڈھی۔ آپ کے بال مبارک گرہ در گرہ لپٹے ہوئے تھے ماں قریب آئیں بچے سے ملیں۔ بال مبارک کی گرہیں کھولنے لگیں تو ایک بال مبارک ذرا زور سے کھینچ دیا جس سے حضرت بابا جی کی زبان مبارک سے اظہار درد کے لیے کچھ آواز صادر ہو گئی۔ اس آواز پر باکرامت ماں کے لیے اپنے باکرامت نورِ نظر کو مزید نصیحت دینے کا موقع مل گیا۔

چنانچہ آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کو نصیحت فرمائی کہ بیٹا! حالتِ

ریاضت میں جب کہ تم اللہ کی راہ میں نفس کے خلاف جہاد کر رہے تھے، بھوک سے تنگ آ کر تم نے جن درختوں کی کونپلیں نوچ کر کھائی تھیں تو ان کو درد نہیں لگتا تھا۔

یہ نصیحت رحم و کرم کا درسِ عارفانہ تھا حالانکہ شرعاً اضطرار میں تزکیۂ نفس کے دوران یا دیگر قسم کے شرعی اضطرار میں کونپلیں یا پھل پھول کھانے یا دیگر حلال چیز کھانے کے ممانعت نہیں ہے۔ نفس کو قابو میں لانے کے لیے فاقہ کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے اور فاقہ کے ساتھ قناعت کی عادت بھی مقصود ہوتی ہے فاقہ، قناعت اور ریاضت کے ترتیبی مدارج ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بھوک سے ہلاک ہو جائے مگر حضرت کی والدہ ماجدہ کا اس نصیحت کرنے کا مقصد یہ تھا کہ میرے بچے کو مزید صبر و استقامت اور توکل ملے۔ اور زیادہ رحم و کرم کی طرف راغب ہو جائے۔

چنانچہ حضرت بابا جی نے اس نصیحت کو نہایت ادب کے ساتھ سنا اور تسلیم کر لیا۔ اور اپنی والدہ سے دعائیں لیں۔

اس کے بعد حضرت والدہ ماجدہ نے اپنے بچے کو تحصیل علم دین کی نصیحت فرمائی کہ کہیں فریدالدین بغیر علم دین کے اپنی وہبی کرامات اور بارہ سالہ ریاضت پر فخر و ناز نہ کر بیٹھے۔ ایسی حالت میں وہ کہیں اس نعمت خداداد سے محروم نہ ہو جائے۔ فرمایا۔ بیٹا! بہت جلد تحصیل علم دین کے لیے رختِ سفر باندھو چنانچہ اس بارہ سالہ ریاضت کے بعد آپ نے بارشادِ والدہ ماجدہ تحصیلِ علم دین کے لیے سفر اختیار کیا اور کچھ مدت کے بعد علوم دینیہ سے فراغت پا کر اپنی والدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو والدہ نے فرمایا! تقویٰ کے لیے علم دین کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

اس کے بعد باباجی کی والدہ کو مزید خوف ہوا کہ اب فریدالدین صاحبِ کرامت ہونے کے ساتھ فضیلت علم دین بھی حاصل کر چکا ہے اب یہ دو فضیلتوں کا حامل ہے رہبر طریقت کے بغیر کہیں عجبِ نفس کا شکار نہ ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے اس وقت کے سب سے بڑے عارف باللہ متقی ولی کامل حضرت بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس جا کر آدابِ دین کے ساتھ آداب بندگی اور آدابِ سلوک حاصل کرنے کی نصیحت فرمائی۔

فرمایا۔ بیٹا! بہت جلد میری نصیحت کے مطابق حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت بابرکت تک پہنچو اور میری نصیحت کے مطابق خدمت بابرکت میں باادب و نیاز حاضری دو۔ اگر میری نصیحت کے خلاف سَر مو بھی فرق کیا تو فیض کامل نہ پا سکو گے۔ فیض عام تو عوام کے لیے ہے۔ تم نے اگر فیض خاص پانا ہے تو شیخ کے سامنے اپنی تمام صلاحیتوں کو بھول جانا اپنے آپ کو نسیاً نسیاً کر دینا۔ صرف آداب دین کی روشنی میں آداب ولی اللہ کی بجا آوری کے لیے اصباغ الوضو یعنی کامل وضو کے ساتھ نہایت خشیت کی حالت میں خدا کے حضور میں دو رکعت نماز نفل ادا کر کے حصولِ اکتساب فیضِ طریقت کے لیے سفر میں قدم رکھو اور سفر کے چپہ چپہ پر دوگانہ ادا کرتے ہوئے در مرشد کامل پر پہنچو اور جب در اقدس نظر آئے۔ تو وہاں بھی دوگانہ للہ تعالیٰ ادا کرو۔ پھر دہلیز پر جاؤ اور آنکھیں نیچی کر لو اور ذکر اللہ کو وردِ زبان رکھو۔

اولیاء اللہ زبانی باتوں سے خوش نہیں ہوتے اور نہ ہی وہاں کوئی رطب اللسانی کام آسکتی ہے۔ وہ عاشقانِ باللہ ہوتے ہیں ان کا معشوق،

معشوقِ حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے اور وہ رسول کریم علیہ الصلوۃ والسلام کے شیفتہ ہوتے ہیں وہ صرف ذکر اللہ اور درود شریف سے ہی انبساط پاتے ہیں۔ جو ان کی مجلس میں باوضو ہو کر ذکر الٰہی کرے اور درود شریف پڑھے، وہی زیادہ فیض پاتا ہے۔ اس کے دِل کے رموز اللہ تعالےٰ اپنے ولیوں پر منکشف کر دیتا ہے اور ایسے انکشاف پر وہ حسب ضرورت دعائے خیر و برکت کر دیتے ہیں اور بفضل اللہ نگاہِ عنایت سے خود بخود نواز دیتے ہیں۔ وہاں کسی اختراعی چاپلوسی یا بناوٹ سے کام نہیں چلتا۔ وہ بقدر مراتب سب پر نظر رکھتے ہیں۔

والدہ ماجدہ نے فرمایا۔ جب حضرت بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں پہنچنا نصیب ہو جائے تو آنکھیں نیچی رکھنا۔ چونکہ انسانی آنکھ کے پیچھے عقل و نفس موجود ہوتے ہیں جو طرح طرح کی موشگافیاں کرتے ہیں۔ اگر عقیدہ میں رِمق برابر بھی لغزش واقع ہو جائے تو طالب کی نگاہِ طلب میں لغزش پیدا ہو جاتی ہے اور وہ سبیلِ عقیدہ سے اتر کر نفس و عقل موہوم کے تصورات کی رو میں بہہ جاتا ہے۔ لہذا میرے بیٹے فرید الدین! حضرت بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ وقت کے عظیم ترین پیشوائے طریقت اور دانائے شریعت ہیں۔ ان کے چہرۂ اقدس پر میری نصیحت کے مطابق نظر نہ ڈالنا۔

مردانِ خدا کو دیکھنے کے لیے ایک خاص معیار نظر ہوتا ہے اگر آنکھ شبہ کر بیٹھے تو یہ فتورِ نفس ہو گا جس سے وہ پاک آنکھیں جو دیدارِ اولیاء اللہ کے ساتھ کفارۂ گناہ چاہنے والی ہوتی ہیں، بجائے کفارۂ گناہ کے الٹا اشتباہانہ جرم سے اپنی ردائے آنکھ کو داغدار کر دیتی ہیں۔ عقل و دل و نگاہ کے داغ

اللہ تعالےٰ کے بندوں پر روشن ہو جاتے ہیں۔

پھر نصیحت فرمائی کہ فریدالدین جب مرشد کامل کوئی حکم دیں تو اس حکم کے ملنے پر دوبارہ استفسار کی خواہش نہ کرنا حکم مرشد کو پوری دل جمعی اور مستعدی کے ساتھ سننا تاکہ کوئی گوشہ حکم تمہاری سمجھ سے باہر نہ رہے اور تم تعمیل حکم کی بجا آوری میں اپنی فرمانبرداری کا پورا ثبوت دے سکو اور یہ بجا آوری خلوص دل سے ہو۔ اس میں کوئی ریا کا شائبہ تک موجود نہ ہو۔

یہ ظاہر ہے کہ مقربین خدا کسی نیک کام ہی کے لیے حکم کرتے ہیں۔ جو منشائے خداوندی کے مطابق ہوتا ہے اور بندگی کے ضمن میں ہوتا ہے۔ بس اس حکم کو سنو اور نہایت ادب و احترام کے ساتھ بغیر کسی غل و غش کے اس کو عملاً پورا کرو اور تعمیل کے بعد پھر خاموش اور باادب بیٹھ جاؤ اور حکم ثانی کا انتظار کرو۔ یہ خادم کی صفت خادمانہ ہے اس کے بغیر کوئی خادم بھی صادق نہیں بن سکتا۔ مخدوم کے سامنے خادم، خدمت صادقہ سے ہی رضا جوئی پا سکتا ہے اور مخدوم مقرب باللہ اور صاحب عرفان ہو عقل و دلِ و نگاہ میں اللہ تعالےٰ کی معیت رکھتا ہو اور خدا کے نورِ عشق سے اس کا ظاہر و باطن بھی منور ہو تو ایسے مخدوم سے خادم کی خدمات کسی طرح بھی مخفی نہیں ہو سکتیں۔

فرمایا میری ان نصیحتوں کو امانت جان کر محفوظ کر لو اور اللہ کا نام لے کر حسب ہدایت مرشدِ کامل کی طرف رخت سفر باندھ لو۔ اللہ تعالےٰ تمہارا نگہبان اور محافظ ہے میں تمہیں بندۂ خدا بنانے کے لیے بندۂ خدا کے پاس بھیج رہی ہوں۔ یہ اللہ کا راستہ ہے۔ اللہ تک پہنچنے کے لیے نیک

وسیلے ڈھونڈو، اللہ تعالےٰ تمہاری ضرور مدد فرمائے گا۔

اس کے بعد اپنی والدہ ماجدہ کی نصیحت پر عمل پیرا ہونے کے لیے حضرت گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ نے باطہارت کاملہ نہایت عجزو انکسار بندگانہ کے ساتھ دو رکعت نماز شکرانہ خداوند ذوالجلال ادا کیے اور ذکر اللہ و ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ حضرت بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ سے اکتسابِ فیض کے لیے سفر میں قدم رکھا اور نوافل پڑھتے ہوئے، ذکر اللہ کرتے ہوئے پورے یقین و ایمان کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔

یہاں تک کہ درِ مرشد کامل تک پہنچ گئے اور در ولی اللہ پر پہنچ کر دوگانہ ادا کیا اور نہایت ادب و احترام کے ساتھ آپ کے حجرۂ مبارک میں داخل ہوئے اور مسنون سلام عرض کرتے ہوئے دوزانو بیٹھ گئے اور حسبِ نصیحت مرشد کامل کے چہرۂ اقدس پر نظر تک نہ ڈالی اور کلامِ مرشد سنتے رہے اور روحانی طور پر محظوظ ہوتے رہے۔ آپ نے اسی دستور العمل پر کاربند رہ کر اپنے مرشد پاک سالک راہِ حقیقت کی عارفانہ رضا و خوشنودی حاصل کرلی۔

ایک مرتبہ حضرت بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ نے معاً حضرت گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کو ارشاد فرمایا کہ فرید جاؤ اور اتنی مدت اللہ کی راہ میں چلہ گذارو۔ آپ نے بلاتامل، بلااستفسار حکم کی بجا آوری کی اور ایک جگہ پر اللہ تعالےٰ کی عبادت شروع کردی۔ بوقت حکم مرشد صرف عبادت الٰہی کے ساتھ چلہ گذارنے کا ارشاد ہوا تھا۔ مگر اس حکم میں طریقِ چلہ یا دوسرے ضروری لوازمات پر کوئی ذکر نہ ہوا تھا اور آپ نے حسبِ دستور استفسار کے متعلق بھی لب کشائی نہ فرمائی تھی اور ارشاد اول کو ہی پورا فرمایا آپ

نے اس دوران نہ ہی روٹی کھائی، نہ پانی پیا اور نہ ہی اپنی عبادت گاہ سے اٹھ کر کوئی دوسرا کام کیا۔ اس طرح پورے آٹھ یوم گذر گئے آپ کا جسم مبارک بچپن سے لے کر اس وقت تک مسلسل ریاضت کی وجہ سے پہلے ہی بے حد نحیف تھا۔ اس پر اس آٹھ یوم کی مسلسل اور کڑی ریاضت نے آپ کو بے حد نحیف و ناتواں کر دیا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ جو حضرت بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کے مرشد طریقت تھے، آپ کو اپنے عارفانہ کشف سے معلوم ہوا۔ کہ فرید الدین گنج شکر کس حالت میں کس قدر لاغر ہو چکا ہے چنانچہ حضرت معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ، حضرت بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس پہنچے اور ان کو ہمراہ لیا، اور بابا فرید الدین کے پاس وہاں پہنچے جہاں آپ بصورتِ چلہ معتکف تھے دونوں حضرات نے قریب پہنچ کر سلام مسنون دیا۔

حضرت بابا فریدالدین رحمتہ اللہ علیہ نے ان کو دیکھا تو فوراً ادب کے لیے کھڑے ہو گئے مگر اس قدر نڈھال ہو چکے تھے کہ ایک لمحہ بھر کے لیے بھی قیام نہ کر سکے اور فرش زمین پر گر پڑے دونوں حضرات نے ان کو مبارک دیتے ہوئے سہارا دے کر اٹھایا اور کھڑا کر دیا۔ عین ایسے عالم میں جبکہ زمانہ بھر کی عظیم شخصیات نے آپ کو اٹھایا اور سہارا دیا، حضرت خواجہ غریب نواز رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بختیار تم نے اس کو ہلاک کر دیا۔ فرمایا فریدالدین تم باکمال ولی اللہ ہو تم کامیاب ہو گئے ہو تمہیں مبارک ہو۔ دونوں شیخین نے مبارک باد دی۔ اور اپنی نیک دعاؤں کے ساتھ ان کو نوازا۔

اس کے بعد جلد ہی شیخین نے کسی امر خاص کی بناء پر آپ کو سفر اختیار کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ یہاں تک کہ آپ موجودہ پاکپتن شریف پہنچ گئے۔ اس وقت موجودہ پاکپتن کا نام اجودھن تھا اور ایک مدت کے بعد مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے پاکپتن شریف پہنچ گئے۔

میرے والد بزرگوار نے فرمایا مرادانِ خدا کی کوئی بات خالی از مقصدِ دین نہیں ہوتی۔ ان کا مریدوں پر فیضِ نظر تربیّت دین کے لیے اور اشاعتِ دین کے لیے ہوتا ہے تاکہ مریدین عقیدت صالحانہ کے ساتھ تربیّت پا کر صرف اللہ کے بندے ہو جائیں اور اپنی مستعار زندگی کو صرف رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے عباوات و معاملات کی صحیح پابندی کریں اور اسلامی تعلیمات کو اپنی عارفانہ تبلیغ کے ساتھ لوگوں تک پہنچائیں اور اشاعت دین کے فرائض انجام دیں۔ ان کی مجموعی زندگی کے مجموعی اعمال صرف اظہار عبودیت کے لیے ہوں وہ خود فنا ہو کر اس بادشاہ مطلق کو ظاہر کریں جس نے خود مخفی ہو کر ساری مخلوق کو ظاہر فرمایا۔ حقِ بندگی اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ سالک یہ سمجھے کہ اللہ تعالے نے اپنے آپ کو چھپایا اور ہم کو ظاہر کیا۔ اب ہم پر فرض ہے کہ ہم اس کی بندگی میں گم ہو کر اس کو ظاہر کریں۔ اور اس کو ظاہر کرنے کا احسن طریقہ یہی ہے کہ اس کی مرضیات کو سب مرضیات پر ترجیح دیں اس کے احکامات کو لوگوں تک پہنچائیں۔ اس کی ذات حقہ کی حقیقت کا ثبوت پیش کریں۔

سالکانِ راہ حقیقت کے اعمال مبنی بر شریعت ہوتے ہیں ان کی تعمیلی نتائج کے اعتبار سے جو نتیجہ بھی مرتب ہو گا وہ اشاعت دین ہو گا۔ چنانچہ حضرت فریدالدین گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ اس یقین و ایمان

کے ساتھ پاکپٹن شریف پہنچے کہ شیخین کا ارشاد خالی از مقصد نہیں۔ اس میں یقیناً کوئی دینی مقصد کار فرما ہے جو تعمیلِ حکم کے ساتھ سامنے آ سکے گا۔ چنانچہ جب آپ تعمیلِ حکم کے لیے پاکپٹن شریف پہنچے، تو آپ نے کسی ایک مقام پر اللہ تعالیٰ کی عبادت شروع کر دی۔ اجودھن کے علاقہ میں ایک شخص سنبھوناتھ جوگی رہتا تھا جو مذہباً ہندو تھا۔ اور صاحب استدراج تھا۔ استدراجی عملیات کے زور سے وہ بڑی بڑی شعبدہ بازیوں کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اس کا ایک معروف شعبدہ یہ بھی تھا کہ وہ ایک وقت میں تین من کے قریب دودھ پی لیتا تھا۔ (واللہ اعلم)۔ اس کی ان شعبدہ بازیوں کی بناء پر سوا لاکھ جوگی اس کی اطاعت میں سر بکف جانباز تھے۔ مگر وہ بعض دفعہ اپنے ان جوگیوں میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار اس طرح کر دیا کرتا تھا۔ کہ میں اپنی منزل میں نامکمل ہوں اور تکمیلِ منزل کے لیے مجھے کسی مردِ کاملِ کی انتظار ہے۔ اور ایسے مردِ کامل کے ساتھ میری ملاقات مشروط ہو گی۔ اگر میری شرائط وہ پوری کرے گا تو میں اس کا مطیع و منقاد ہو جاؤں گا۔

ادھر شنبھوناتھ جوگی اپنے عقیدت مندوں میں ان خیالات کا اظہار کر رہا تھا کہ ادھر حضرت خواجہ غریب النواز علیہ الرحمت اور حضرت بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ پر اللہ تعالیٰ نے جوگی کے خیالات منکشف کر دیئے۔ بنا بریں ان دونوں حضرات نے اپنی نگاہِ عارفانہ کے ساتھ شنبوناتھ جوگی کے استدراج کا مقابلہ کرنے کے لیے حضرت باباجی کو ہی موزوں پا کر مقابلہ کے لیے مامور فرما دیا۔ مگر اس راز کو باباجی پر واضح نہ کیا کہ ایسے معروف مستدرج کے مشروط مطالبہ کو کرامت متقیانہ سے پورا کرنے کی اہلیت اللہ تعالیٰ نے گنج شکر کو ہی دے رکھی ہے۔ لہذا شنبھوناتھ جوگی کو دعوتِ

اسلام دینے کے لیے بابا فرید رحمتہ اللہ علیہ کو تیار کرنا چاہیے۔ یہ کاملین کے توسل کا نتیجہ تھا جو حضرت باباجی پر منزل بمنزل کمالات بن بن کر ظاہر ہوتا رہا۔

حضرت بابا فریدالدین علیہ الرحمتہ بلا تردد اور بلا تامل تعمیلِ احکامات کو عملی جامہ پہنا لیتے کیا مجال کہ کسی مقام پر سہواً بھی تعمیلِ حکم میں تاخیر کی ہو۔ ہر تعمیل میں ارکان دین کی پوری پوری بجا آوری کی اور اس باعظمت مقام تک پہنچ گئے کہ شنبھوناتھ جوگی جیسے اپنے زمانہ کے مانے ہوئے صاحب استدراج کو دعوت اسلام دینے کے لیے مامور فرمائے گئے۔

جب آپ اجودھن کے جنگل میں پہنچے، تو اس وقت شنبھوناتھ کو اپنے استدراجانہ روح سے معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں کوئی مرد کامل آگیا ہے۔ اس نے اپنے ارادت مند چیلوں کو بلایا اور ان سے مرد کاملِ کے ورودِ مسعود کا ذکر کیا کہ اس علاقہ سے مجھے کسی مردِ کامل کی خوشبو آرہی ہے۔ چنانچہ وہ جہت خوشبو پر اس مرد کامل کی تلاش میں نکل پڑا اور آپ کو پالیا۔ دیکھا کہ حضرت باباجی محوِ عبادت ہیں۔ آپ اس وقت عالم استغراق میں تھے۔ ایسے عالم میں شنبھوناتھ جوگی اپنے متعدد چیلوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔

سنبھوناتھ جوگی کی شرائط یہ تھیں کہ جس مردِ کامل کی نگاہ اول سے میرے کانوں کے وہ مندرے جن میں کوئی آنچ یا جوڑ نہیں، گر جائیں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ میں استدراجی تصرف سے مر جاؤں گا اور میرے مرنے کے بعد وہ مردِ کامل میرے مردہ جسم میں میری روح کو لوٹا دے، جس سے میں زندہ ہو جاؤں۔ ان دو شرائط کے مکمل ہونے پر میں اس مردِ کامل کا مطیع ہو جاؤں گا۔

شنبھوناتھ جوگی نے جب حضرت باباجی کو محو عبادت پایا۔ تو با ادب ہو کر سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔ حضرت باباجی کی آنکھ بالاتفاق اٹھی اور جوں ہی اس جوگی پر حضرت کی نگاہ اول یکبار گی پڑی۔ شنبھوناتھ جوگی کے وہ مندرے جو اس کے کانوں میں استدراجی قوت سے پڑے تھے، گر گئے۔ مندروں کا گرنا ہی تھا کہ وہ فوراً زمین پر لیٹ گیا اور بالاستدراج اس نے اپنی روح کو بدن سے خارج کر دیا۔

اس وقت حضرت باباجی کو فرمانِ مرشد یاد آیا کہ مجھے اس علاقہ میں جس مقصدِ خاص کے لیے مامور کیا گیا ہے، وہ یہی ہے جس سے مراد دعوتِ حق ہے۔ میرے سامنے یہ کوئی غیر مسلم جوگی ہے، جو مر گیا ہے۔ اس وقت سینہ پر القا ہوا۔ کہ یہ ایک غیر مسلم جوگی ہے، جو مردِ کامل کی تلاش میں ہے، اور اس کی کچھ شرائط ہیں۔ ان میں سے ایک شرط آپ کی نگاہِ اول سے اللہ کے فضل سے پوری ہو چکی ہے۔ یعنی اس کے مندرے کانوں سے گر چکے ہیں اور دوسری شرط باقی ہے، جس کو وہ بصورتِ موت پیش کر چکا ہے۔

اس وقت حضرت باباجی رحمتہ اللہ علیہ نے آسمان کی طرف نگاہ مبارک اٹھائی۔ دیکھا کہ شنبھوناتھ جوگی کی روح آسمانوں کی طرف جا رہی ہے۔

اس وقت آپ نے جو دعا بارگاہ رب العزت میں فرمائی، وہ قابلِ غور ہے اور سالکین راہِ طریقت کے لیے ایک کھلی تعلیم ہے کہ مردانِ خدا جب دعا کرتے ہیں تو وہ سرِ مو بھی اصولِ حق کے خلاف نہیں ہوتی۔

آپ نے دعا مانگی۔ الٰہ العالمین یہ ایک غیر مسلم ہے جو تلاشِ حق

میں سر گرداں ہے۔ آج یہ تیرے ایک ایسے بندہ عاجز کے پاس پہنچ چکا ہے جو صرف تیری مرضیات پر ہی ہر فیصلہ محفوظ رکھتا ہے اور تیری ہی شریعت کے مطابق ہر بات کرتا ہے۔

اے اللہ اس کی ایک شرط تو نے خود پوری فرما کر اپنے بندہ عاجز کی لاج رکھ لی۔ اب اس کی روح کو جسم میں واپس لوٹانے پر بھی تو ہی قادر ہے۔ تیرے فضل سے اگر اس کی روح واپس لوٹ آئے تو میں اسے دعوتِ اسلام دوں گا۔ جس پر یہ مسلمان ہو جائے گا اور اسے کفر سے نجات ملے گی اور مجھے دعوت اسلام دینے کا ثواب ملے گا۔ نیز اس کے مسلمان ہونے سے لاکھوں جوگی جو اس کے معتقد ہیں۔ اسلام قبول کر لیں گے تیری قدرت وسیع تر ہے۔

یہ دعا فرما ہی رہے تھے۔ کہ روح واپس لوٹ آئی اور شنبھو ناتھ جوگی کے بدن میں زندگی کی حرکت پیدا ہوئی اور وہ زندہ ہو گیا۔ بعد میں وہ آپ کے پاؤں پر با عجز و نیاز گر پڑا۔

آپ نے فرمایا شنبھو ناتھ کلمہ طیبہ پڑھو اور مسلمان ہو جاؤ کیونکہ یہ سب کچھ اللہ کی عنایت سے ہوا۔ اس ذات پر ایمان لاؤ جس نے مجھے دعوتِ حق دینے کی توفیق بخشی اور تجھے یہ دعوت قبول کرنے کا موقع بخشا۔ چنانچہ شنبھو ناتھ جوگی نے اپنی شرائط پورا ہونے پر حضرت باباجی رحمتہ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کر لیا۔ اس کے قبولِ اسلام کے بعد اس کے لاکھوں چیلے بھی مشرف با اسلام ہو گئے اور سب نے یکے بعد دیگرے آپ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کر لیا۔

اس طرح حضرت باباجی نے اپنی والدہ کی نصیحت کے مطابق اور

شیخ طریقت کے ارشادات کو پورا فرما کر بندگی کی راہ پائی اور سالک باللہ ہوئے۔ اس سلوک کے ساتھ تبلیغ دین کے فرائض انجام دیئے۔ اور لاکھوں غیر مسلمین کو دعوت حق دینے میں کامیابی پائی۔

اس طرح پاکپتن شریف مرکز رشد و ہدایت بن گیا، جہاں سے بکثرت انسانیت نے مشرف با اسلام ہو کر ہدایت پائی، اور تشنگان معرفت نے سیراب ہو کر جام عرفان نوش فرمائے۔

سالکینِ طریقت کو معلوم ہو کہ وسیلہ نسبت چاہتا ہے اور نسبت سے مراد سالکینِ صوفیاء کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان کے سلسلوں سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے کو نسبت کہتے ہیں۔

# بائیسواں باب

## مرشد سے مراد صاحبِ علم و عمل اولی الامر ہے۔

آئمہ طریقت کی نسبت عشق بہر طور سبیلِ دین کے ذریعہ رسول کریم علیہ الصلوۃ والسلام سے مل جاتی ہے اور ہر مرشد طریقت کا ہاتھ کسی مرشد کے ذریعہ اربعہ طرق میں سے کسی ایک امام طریقت سے مل کر رسول کریم علیہ الصلوۃ والسلام تک پہنچ جاتا ہے۔ جس سے مراد اطاعت رسُول کے ساتھ اطاعت دین کو مکمل کرنا ہوتا ہے۔

مرشد باشریعت کے ذریعہ کتاب و سنت کی پیروی اور کتاب و سنت کے ذریعہ نبی اکرم علیہ الصلوۃ والسلام کی پیروی اور نبی اللہ کی پیروی سے خدائے مطلق کی اطاعت ملتی ہے۔

یہ سب کچھ ایک بندگی کے لیے ہوتا ہے۔ باشریعت مرشد کی اطاعت سے مراد اولی الامر کی اطاعت ہوتی ہے۔ جس کے ذریعہ وہ اللہ اور رسولؐ سے عرفان پاتا ہے اور احکامات کو عملاً پورا کرنے کی اسلامی راہ مل جاتی ہے۔ اور سالک راہ ارکانِ اعمالِ دین کی رعایت کے ساتھ سلوک کی راہ پانے میں اور اسے مکمل کرنے میں آسانی پاتا ہے۔

بلا پابندیٔ دین محض ارکان دین کو رٹ لینے سے کوئی متقی نہیں بن سکتا۔ ایسے لوگوں پر فاضل و عالم کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ مگر وہ عنداللہ باعمل متقی نہیں بن سکتے اور جو باعمل متقی نہ ہو سکے۔ وہ آدابِ بندگی

نہیں پا سکتا ہے۔

منازلِ بندگی کی صحیح ادائیگی ہی آدابِ دین کا وسیلہ ہوتی ہے۔ اور آدابِ دین ہی وسیلۂ تقویٰ ہوتے ہیں۔ اسلام میں کوئی خارجی یعنی غیر اسلامی ادب متقی ہونے میں مددگار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ غیر اسلامی ادب متقی ہونے کی ضد ہے۔ اللہ تعالےٰ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ صرف اسلامی تقویٰ ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف ہے۔

مَن لَاَادَبَ لَہ لَادِینَ لَہ۔ وَمَن لَا وَرَعَ لَہ لَا زُلفَ لَہ

جو صاحبِ ادب نہیں۔ وہ صاحبِ دین نہیں اور جو متقی نہیں، وہ صاحبِ وصل نہیں۔ دین سارے کا سارا ایک آخری اور کامل ادب کا مجموعہ ہے۔

جو آدابِ روحانیت سے لے کر آدابِ جسمانی تک اور آدابِ فردی سے لے کر آدابِ اجتماع تک راہنمائی کرتا ہے۔ دنیا بھر کے خارجی آداب اکٹھے کیے جائیں تو وہ مسلمان بندہ مومن کی ایک بسم اللہ کی گردِ راہ تک بھی نہیں بن سکتے۔

اس تعریف میں میرا ذہن کسی عصبیت سے متاثر نہیں بلکہ اسلامی سچائیوں کی حافظت میں وسیلہ کی تشریح کر رہا ہوں۔

اسلام ایک ایسا کامل مذہب ہے جو اپنے پیروکار کو خارجی تاثرات سے متاثر ہونے سے قبل اس کی داخلی دنیا کو حقیقتِ اسلام سے متعارف کرتا ہے اور راہِ حقیقت پر چلاتا ہے۔ وہ کسی فانی نظریہ حیات سے دعوت عمل نہیں دیتا بلکہ وہ ایک لازوال اور غیر قانونی معبود برحق کی طرف روح و جسم کے اشتراک عمل سے ایک خاص مجوزہ دستور العمل کی پابندی کے

ساتھ رموز زندگی حاصل کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

اسلام کے نزدیک ان رموز کو حاصل کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے۔ تاکہ سالک پر مالک و مختار کے حقائق واضح ہوں۔ جو اسے مزید محبت الٰہی کی چاشنی دیں۔ اور وہ مزید تحریصِ عمل پا کر مزید نیکی پائے اور نیکیوں کے ساتھ خدا کو راضی کر لے۔

اسلام کا انداز طریقت کس قدر لطیف و پاک ہے۔ جس کا آئین و منشور ہماری باطنی دنیا پر ظاہر سے کہیں زیادہ حکمرانی کرتا ہے۔ اسلام سالک راہ کے ظاہر کو باطن کا پابند رکھتا ہے تاکہ ظاہری آداب اطمینان کے ساتھ ادا کیے جا سکیں۔ اولیاء امت نے وسیلہ سے مراد حصول تقویٰ لیا ہے کہ ہر صوفی منش کو یہ بات کبھی اور کسی حالت میں نہ بھولنی چاہیے۔ کہ وہ غیر متقی ہو کر محض اختراعی استغراق و مستی کے ساتھ خدا کو نہیں پا سکتا۔ یہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہٹ کر ایک گمراہانہ طرزِ تصوف ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ فریبِ نظر بن کر لوگوں کے لیے ضعفِ روحانیت کا باعث بن جاتے ہیں۔

عجمی تصوف میں ائمہ طریقت کے دستور العمل کے خلاف جو تصوف بھی نظر آئے، اسے خلاف دین اسلام سمجھنا چاہیے۔ چونکہ متشرع صوفیا نے ہمیشہ تصوف اسلام کی حکمت و موعظت کو اسلامی تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ کچھ صوفیا نے غیر مسلموں کی ہدایت کے لیے زائد طور پر بھی کچھ اشغال شامل کر لی تھیں۔ جو حکمت اسلام سے تصوف میں داخل کی گئی تھیں۔

مگر ان سے یہ مراد نہیں۔ کہ مسلمان ان پر دوامی عمل جاری رکھیں۔ انہوں نے کچھ باتیں خواص کے لیے اور کچھ عوام کے لیے مخصوص کر دی

تھیں۔ عوام کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بلا سوچے سمجھے خواص کے ان باریک رموز کو اختیار کریں، جن پر انہیں عبور نہیں ہے اور عوام کے ان عمومی اعمال واشغال کو خواص اختیار نہ کریں۔

چونکہ ان کے قرینے غیر مستقل ہوتے ہیں۔ اس طریقِ عمل میں عوام و خواص کی تفریق سے آداب دین کی حفاظت ہوتی ہے۔ تقویٰ خود بذاتہ متقی کے لیے جامع الحسنات ہو کر مانع المعاصی بن جاتا ہے۔ وہ نہ تو متقی کی سعادتمندیوں کو ضائع ہونے دیتا ہے اور نہ متقی میں غیر اسلامی شعائر کو داخل ہونے کا موقع دیتا ہے۔ وہ ہمیشہ متقی کو حدود دینیہ کے اندر رہنے کی تاکید کرتا ہے اور حفظِ ماتقدم کے لیے بار بار اس کی روح کو خوفِ خدا سے لرزہ براندام رکھتا ہے۔ یہی خوف خدا اساسِ تقویٰ ہے۔

اگر صرف خوفِ خدا میں کمی واقع ہو جائے تو تقویٰ میں کمی واقع ہو جاتی ہے اس واسطے کے تقویٰ کے معنی اللہ سے ڈر کر احکامات کی بالاحتیاط پابندی کرنا ہے۔ متقی ڈرنے والے کو کہتے ہیں اور ڈر ہی ایک ایسی چیز ہے، جو پرہیز کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اسلام میں ڈر کے معنی محض ڈرنے کے نہیں۔ بلکہ ڈرنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حرام کی ہیں، ان سے بچو۔ اور جو حلال کی ہیں، ان کو اختیار کرو۔

متقی کو اگر چلتے پانی پر بھی وقتی طور پر شبہ ہو جائے یا اس کی پاکیزہ روح پر کراہیت واقع ہو جائے تو وضو نہ کرے۔ تو فقہاء کی گرفت میں نہیں آسکتا۔ چونکہ اس طریق احتیاط میں حفاظتِ تقویٰ کے لیے باریک تر پرہیز گاری کا ثبوت ملتا ہے۔

اگرچہ علمائے ظاہر کے نزدیک چلتے پانی پر ایک مقدار بہاؤ کے

مطابق وضو کرنا جائز ہے۔ مگر متقی کو حالت کراہیت میں کسی قریب تر پانی ملنے کی امید ہو، تو وہ ایسے چلتے پانی سے بھی وضو نہ کرے جس پر اس کی متقیانہ روح میں تکدر پیدا ہو جائے۔

اگر نماز قریب ہو اور وضو ضروری ہو تو یہ حالت اضطرار ہے۔ پھر متقی کو محض تکدر طبع پر ترکِ وضو نہ کرنا چاہیے اور وضو کرنا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔

معرفتِ الٰہی کے حصول کے لیے جس سلوک کو ذریعہ بنایا گیا ہے وہ محض رسم و رواج نہیں بلکہ اسلام کے وضع کردہ ایک طریق عمل کا نام ہے۔ غیر متقی راہِ حقیقت نہیں پا سکتا ہے۔ اگر غیر متقی لوگ سالک راہ ہونے کا دعویٰ کریں تو اس طرح حق پرستی کی راہیں دھندلی ہو جاتی ہیں۔ ایسے جہلا جب سالکین کا لبادہ اوڑھ لیں تو اہل حق کی تبلیغ میں بڑی خلیج پیدا ہو جاتی ہے۔

مگر پھر بھی حق حق ہے جو ہزار ہا حائلات اور جہالت کے دلدلوں سے ابھر کر بار بار سامنے آجاتا ہے۔ یہ فیصلہ خداوندی ہے۔ سایہ ہر چراغ کے ساتھ ہوتا ہے اور ہر روشن دیوار کا ایک حصہ سایۂ دیوار بھی بن جاتا ہے اور یہ دنیا بھی تو ایک سایہ ہے۔ سائے جہاں سائے ہوتے ہیں، وہاں امتیازِ انوار کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں۔ رات امتیاز نہار کا ذریعہ ہے۔

کذب کی وجہ سے سچائی کا وجود ختم نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے ذریعہ سچائی نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ کفر اسلام کو امتیاز دیتا ہے۔ باطل سے حق واضح ہو جاتا ہے۔ معبودانِ باطلہ کی بے ثباتی معبودِ مطلق ہونے کے عقیدہ کو ثبات دیتی ہے۔ معبودانِ باطل اپنی فنا کے ساتھ غیر فانی معبود کے

لیے ذریعہ امتیاز ہو جاتے ہیں۔

بہر کیف ہر زمانہ میں اہل حق سالکینِ طریقت اللہ کے فضل و کرم سے موجود رہتے ہیں اور تا ابدِ قیامت موجود رہیں گے۔ ان کے متعلق طالبینِ حق کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ہر طالب حق کی مثال پیاسے کے مانند ہونی چاہیے کہ پیاسا پانی کی تلاش دمِ واپسیں تک جاری رکھتا ہے اور پانی کے مل جانے پر زندگی پا لیتا ہے۔ ورنہ موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ مجازی پانی کی تلاش بھی مجاز ہے اور راہ مجاز میں تلاشِ آب صرف نفسانی زندگی تک محدود ہے اور اس کی ناکامی کی موت صرف موت پر ہی اتمام کرتی ہے۔

مگر راہ حق میں وصول الی اللہ کے لیے سالکِ راہ کی مردِ کامل کے لیے جستجو پیاس کی صورت اختیار کر لے۔ تو یقیناً اللہ تعالیٰ ایسے جستجو کرنے والے کی تائید فرماتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے اپنے ایماندار بندوں کے ساتھ دوستداری کا وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ ان پر ہدایت کی راہیں کھولے گا اور اندھیروں سے روشنی کی طرف لے جائے گا۔

اِنَّ اللهَ لَا يُخلِفُ المِيعَاد اللہ تعالے اپنے وعدے میں خلاف نہیں کرتے اور اللہ کا اہل ایمان سے وعدہ ہے۔

اَللهُ وَلِيُّ الَّذِينَ اٰمَنُوا يُخرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّورِ

یعنی اللہ تعالے اہل ایمان کا دوستدار ہے اور وہ اہل اسلام کے ساتھ اپنی دوستی اس طرح کرتا ہے، کہ ان کو بے دینی سے بچاتا ہے۔ اور اسلام کی ہدایت دیتا ہے۔

نیک بندے اللہ تعالے کی راہ میں ہمیشہ نیک ذریعے، نیک وسیلے

ڈھونڈتے رہتے ہیں ایسی جستجو اہل حق کا شیوہ رہا ہے۔ جو اللہ تعالےٰ کو پسند ہے۔ اگر خدانخواستہ راہ حق میں مرشدِ کامل کی تلاش میں کوئی جستجو کرنے والا پیاسا موت سے ہلاک ہو جائے۔ تو بھی اس کو اپنی نیک جستجو کا اجر ملے گا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیعُ اَجرَ المُحسِنِینَ

نیکو کاروں کی کسی نیکی کا اجر اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتے۔ طالبِ حق کے لیے ضروری ہے کہ راہ حق میں جن جن علمی و عملی، صوری و معنوی وسائل کی ضرورت ہے۔ ان کو تادمِ آخر تلاش کرتا رہے۔

اگر اہل اسلام ایسی جستجو کو محض وہم و گمان کی بناء پر ترک کر دیں تو ان کے پاس باقی ماندہ جستجو صرف ہوا و ہوس ہی رہ جائیں گی۔ اکثر لوگ راہ حق میں وسائل کی جستجو میں جہالت یا استکبار نفسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جس کی بناء پر انہیں صرف وہی جستجو میسر آئے گی۔ جو منتقی اہل اللہ کی مجالس کے علاوہ بدعاتِ نفسانی کی پیداوار ہوں گی۔

دنیا میں دو ہی قسم کی مجالس ہوتی ہیں۔ یا مجالسِ نیک یا مجالسِ بد۔ اگر مجالس نیک کو تنہا کر دیا جائے تو باقی ماندہ مجالس بد ہی رہ جاتی ہیں۔ تو ایسے متکبرین جب مجالسِ نیک کو متکبرانہ طور پر ترک کر دیتے ہیں تو پھر لازماً ان کے حصہ میں مجالسِ بد ہی باقی رہ جاتی ہیں اور مجالسِ بد تو لازماً بدعت کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ انجام کار وہ کسی ذہنی نشیب و فراز کا شکار ہو کر بالکل، بیگانہ حق ہو جاتے ہیں اور فیضِ نظر سے محروم ہو کر ضد و عناد کو ہی اپنی عادت بنا لیتے ہیں جس پر ان کا مرضِ ضد و عناد بڑھتا ہی رہتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا۔ انسان کسی حالت میں بھی کیوں نہ ہو، مکرّم ہے اور خاص طور پر کلمہ گو افراد کے لیے ہمیشہ دعائے خیر کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ عام و خاص مسلمانوں کا انجام بالخیر کرے۔

# تیئیسواں باب

## والد بزرگوار کے پند و نصائح

سال ۱۹۳۹ء کے شروع میں ایک دن جو یوم جمعہ تھا۔ صبح دس بجے میں اور میرے دونوں بڑے بھائی اخوانم ڈاکٹر عبدالخالق صاحب اور اخوانم حکیم عبدالجلیل صاحب تینوں حقیقی بھائی والدین کی معیت میں بیٹھے پند و نصائح سن رہے تھے۔ حضرت والد بزرگوار نے فرمایا میرے بچو! تم کتنے عاجز و بے کس درویشوں کی اولاد ہو، جن کے پاس سوائے عاجزی اور فروتنی اور درویشی کے اور کوئی متاعِ دنیا موجود نہیں۔ میرے مولائے کریم نے مجھے اس حالت میں مطمئن رہنے کی توفیق دی ہے۔ میرے دل میں کوئی ایسی حرص و ہوا نہیں جو مجھے مایوس ہونے پر مجبور کرے۔ یہ طمانیت و سکون اللہ تعالے پر بھروسہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ کون نہیں چاہتا کہ وہ دنیا میں مال و منال کی آسائش نہ پائے اور یہ کہ اس کی اولاد سامانِ دنیا سے بافراغت استفادہ نہ کرے اور اس کے جگر پاروں کے لیے معقول جائیداد نہ ہو کون نہیں چاہتا کہ اس کی اولادیں گوناگوں منافعوں سے بہرہ ور نہ ہوں۔

بیٹو! بس اللہ پر ایمان مضبوط کرو اور توکل کو اپنا سہارا بناؤ کہ اس سے بہتر کوئی دوسرا سہارا نہیں ہو سکتا۔ میری دعا ہے کہ اس وراثتِ

ایمانیہ کی تم حفاظت کر سکو اور اس وراثت کی حفاظت سچائی اور تقویٰ پر ہے۔

ان نصائح پر میرا تجربہ ہے کہ انسان اپنے مقدر پر قادر نہیں۔ جو دنیا میں زیادہ مال و منال اور عزت و اقبال پاتے ہیں، وہ بھی اللہ تعالےٰ ہی کی عطا ہوتی ہے۔ اور جو کم مایہ ہیں، وہ بھی مرضیاتِ الٰہی سے اپنے نصیب کے مطابق عسرت پاتے ہیں۔ نہ ہی انسان عسرت سے فرار کر سکتا ہے اور نہ ہر یسرت پر قادر ہو سکتا ہے۔ ہر عسرت و یسرت اولادِ آدم کے لیے ایک امتحان ہے اور نہ ہی دونوں حالتیں مدام ساتھ دیتی ہیں۔ اور نہ ہی مدام تنگ دامانیاں گلو گیر رہ سکتی ہیں۔ اللہ تعالےٰ عسرت و یسرت میں اہل ایمان کی استقامت دیکھتا ہے۔

اقبال مندیاں اگر مقام تواضع لوٹ لیں اور مقام بندگی چھین لیں تو میرے نزدیک وہ ایسا ثقیل وزن ہے۔ جس کو اپنے بدن پر ڈال لیا جائے اور اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جائے حتی کہ اس پر موت آجائے۔ اور کوئی دوسرا اس بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھالے۔ اگر وہ بھی اپنے پیشرو کی طرح بلا استفادہ بوجھ اٹھا کر زندگی گذارنے پر آمادہ ہو جائے تو یکے بعد دیگرے ایک نعمتِ عظمیٰ کا بوجھ بلا افادیت اٹھانے کی رسم بد قسمتی پر محمول ہو گی۔

صرف اقبال مند مشہور ہونے کے لیے دولت کے انبار لگا دینا معنوی خوش بختی پر محمول نہیں ہو سکتا۔ ارب ہا روپیہ اگر صرف قوتِ لایموت تک منحصر ہو تو یہ قرینہ انصاف کے خلاف ہے۔ اہل نظر کے نزدیک قوتِ لایموت تو جنگل کے درند و پرند کو بھی میسر ہے اور ہر ذی

جان کو اللہ تعالےٰ قوت لایموت دیتے ہیں۔

غریب اور امیر دونوں قوت لایموت پاتے ہیں۔ حسبِ ضرورت کھاتے، پیتے، سوتے، جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے، چلتے، پھرتے اور حسبِ دستورِ فطرت خوشی و غم میں بھی حصہ دار ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے، اچھی اور لذیذ غذا نوکِ زبان کے لیے خوش ذائقہ ہونے کے بعد داخلِ بدن ہو کر ناپاک فضلہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے آگے صحت و مرض پر بھی خدا ہی قادر ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اچھے اور لذیذ کھانے مریض نہیں ہونے دیتے۔ یا مرض الموت ان سے بھاگ جاتی ہے۔

نہیں دنیا میں ایسا نہیں ہوا۔ کوئی آسودہ حال آدمی نہ تو مرض سے بچ سکا اور نہ ہی مرض الموت سے۔ ایک خوش پوشاک آدمی کی پوشاک میں ملبوس بدن تو وہی مٹی کا بدن ہے۔ جو جس صورت میں پیدا کیا گیا، اُسی حالتِ خلقی میں ویسا ہی رہتا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ موٹاپا یا کمزوری یا سرخی یا سفیدی بھی خاکی بدن پر تصرف خداوندی کا نتیجہ ہیں۔

مگر جسم کی یہ بوقلمونیاں حقیقت جسمانیہ کے فطری ضعف سے الگ نہیں ہو سکتیں۔ انجام کار وہ ان ہی فطری راہوں سے گذرتا ہے۔ جہاں سے غربا مفلوک الحال لوگ گذر کرتے ہیں۔ سب پر شام یکساں طور پر آتی ہے۔ ہر صبح کا مسافر شام پاتا ہے۔ اس میں امیر و غریب کی کوئی تمیز نہیں۔

اس طرح ہر صبح حیات کا مسافر شامِ موت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اس میں بھی آسودہ حال اور غیر آسودہ حال میں کوئی فرق نہیں۔ پھر اگر فلسفۂ زیست کو نفسانی خواہشات پر تعمیر کیا جائے تو فکرِ انسانی کا عروج

منتشر الحال اور مغلوب الخواہش نفس کی متزلزل حرص و ہوا پر ہو گا اور ایسی فکریں پتنگ باز بچوں کی اس ڈوری کے مانند ہوں گی جس کے آگے پتنگ لگا دیا جاتا ہے اور ڈوری بچے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ پتنگ اُڑاتا ہے جہاں تک ڈوری ہوا کے سہاروں پر پہنچ سکتی ہے۔ بس پتنگ اتنی ہی اڑان اڑ سکتا ہے اور کھینچنے پر واپس ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ ڈوریاں ٹوٹ جاتی ہیں اور پتنگ بردوش ہوا بے مہار ہو کر جدھر چاہے گرتا یا اڑتا ہے یا پھٹ کر پرزے پرزے ہو جاتا ہے۔ ڈور کا ٹوٹا ہوا کچھ حصہ بچّے کے ہاتھ میں رہ جاتا ہے اور وہ اپنی عادت لاعبانہ کے ساتھ دوسرے پتنگ کے لیے دوسری ڈوری بنانے کی تیاری کر لیتا ہے۔

خدا جانے اس دنیا میں نابالغ پتنگ باز ہاتھوں سے کتنی ڈوریاں ٹوٹ چکی ہیں اور کتنے پتنگ برباد ہو چکے ہیں۔ مگر فضائیں حسبِ سابق جاری و ساری ہیں اور بچے بھی حسبِ دستورِ فطرت پیدا ہو رہے ہیں اور اس وقت تک پتنگ اڑیں گے جب تک یہ ناتمام کھیل باقی رہیں گے۔

اہلِ نفس فلسفی، فلسفۂ زیست کی باگ ڈور ناتواں اور نابالغ نفس کے ہاتھوں دے کر اپنے فلسفۂ زیست کا ترجمہ کرتے ہیں۔ ان کے افکار فوج در فوج سرزمین نفس کی خواہشات کے فکری پتنگ خواہشِ نفسی جیسی نازک ترین ڈوری کے ساتھ متعلق ہو کر فضائے عقل و دانش پر اڑتے اور بار بار نفس کے میدانوں میں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہتے ہیں اور یہ فلسفیانِ نفس کے لیے ایک ناتمام رہنے والا مشغلہ ہے۔

اہل نفس کی اس قسم کی فکریں کبھی نابالغ بچوں کی طرح پتنگ بازی کرتی ہیں اور کبھی بر سبیل افتخار ایک دوسرے پر تفاخر کرنے کے

لیے قوت آزمائی بھی کر لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ خواہشات و لذات نفسانی کے ساتھ اپنے تفاخر نفسی کی برتری کے لیے وہ عقل کو کبھی کبھی نفس کی دہلیز سے الگ بھی کر لیتے ہیں۔ تا کہ وہ کچھ ایسی فاصلہ قوت کا حصول بھی کر سکیں، جن سے ان کے تفاخرِ نفسی کا لوہا مانا جا سکے۔

اس طرح ان کے عقل و دانش کو اسبابِ دنیا میں تجربہ کرنے کا موقع فراہم ہو جاتا ہے اور معلومات کی دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں تیر و کمان، نیزہ و سنان، نشتر و تلوار اور لاؤ لشکر وغیرہ کی صورت برآمد ہو جاتی ہے اور یہ نظام قریوں سے شہروں اور ایک ملک سے دوسرے ممالک تک پھیل جاتا ہے۔

اگر اس تفاخرِ نفسی کے بل بوتہ پر قوت و تمکنت میسر آ جائے۔ تو اس کا انجام عیش و طرب پر اپنا اتمام کرتا ہے اور یہ طرزِ قوت و حشمت دلدادگانِ نفس تک ہی مسرت کی لہریں پھیلا سکتی ہے۔ دوسرے لوگ اسی طرز عزت و عظمت کی طربناکیوں سے قطعاً محروم ہو جاتے ہیں۔

ایک طرف فلسفۂ زیست جیسا ارفع و اعلیٰ مضمون اہلِ نفس نفسِ ضعیف کے حوالے کر کے بار بار مادی حل پر ختم کرتے ہیں۔ پھر بھی زیست کی بلندیوں کا ترجمہ نہیں کر پاتے۔ جو دنیوی زندگی کا مقصدِ وحید تھا۔ بار بار نفس کے دلدل میں گرتے ہیں اور دوسری طرف عقل و دانشِ انسانی جیسی رفیع المرتبت قوت کا تصرف جاہ و حشمت کی صورت میں تبدیل کرتے رہتے ہیں تا کہ وہ ایک دوسرے پر تفاخر کا مظاہرہ جاری رکھ سکیں۔ انسان اپنی اس عادت کی بناء پر ساری کائنات کی بھی تسخیر کیوں نہ کر لے۔ وہ فکری پتنگ بازی سے نہیں بچ سکتا۔

امراء انسانیت پر حق لازم آتا ہے۔ کہ وہ قوتِ لایموت کے ساتھ ساتھ افراطِ عزت کا شکرانہ ادا کریں اور اللہ تعالے کی عبادت کریں اور اہل حق کا حق ادا کریں۔ ستم رسیدوں کی اعانت کریں۔ یتیموں اور بیواؤں کی اندوہناکیوں میں ان کی سرپرستی کریں اور فلسفۂ زیست کی باریکیاں روح کے حوالے کریں۔ جو ایک ذی وفا اور عاقبت اندیش قوت ہے، وہ نفس کو بھی جائز طریقوں پر پالتی ہے اور سیراب کرتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ افکار کو لامتناہی بلندیوں کی طرف پرواز دیتی ہے۔ وہ پرِ پرواز نوچتی نہیں بلکہ پرِ پرواز تیز کرتی ہے۔ جس پر فلسفۂ زیست کے مادی پہلو ہمہ گیر طور پر واضح ہو کر افادیت عامہ بن جاتے ہیں۔

ایسے پاکباز افکار انفس و آفاق پر تصرف پا لیتے ہیں اور اس سے بھی کہیں آگے بڑھ کر امکانی حدوں کو بھی پا لیتے ہیں اور سب سے برتر ہستی کا عرفان حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر آسودہ حال لوگ بھی فلسفۂ زیست کو روحانیت کا رفیع الشان میدان نہ دے سکیں تو اہل بینش کے نزدیک وہ غریب تر مفلوک الحال ہیں۔ جو بازار حقیقت کے خریدار نہیں ہو سکتے۔

امیری ایک نعمت ہے مگر نفس کے ہاتھوں اس کی بڑی بے حرمتی ہوتی ہے۔ اور وہ اپنا مقام کھو بیٹھتی ہے۔ تمام انبیاء و اولیاء ایسی خداداد قوت کے مالک ہیں کہ وہ سارے جہانوں کو زیر نگیں کر لیتے۔ مگر انہوں نے صرف احوال پر زور دیا۔ اصلاحِ احوال میں روحانی، مادی، ملکی و ملی وسائل کی اصلاحات شامل ہو جاتی ہیں۔ صرف ان کی تبلیغ مذہب سے متعلق ہو کر انسانی حقوق کی حفاظت پر دعوت عام دیتی رہیں۔ ان کو جو تکالیف درپیش آئیں، وہ مذہب کے ایمانی اور اصلاحی احکامات کی وجہ پر

تھیں۔ وہ کسی طرح بھی یک طرفہ جاہ و حشمت کے متمنی نہ تھے۔ بلکہ وہ عزت میں مساوات چاہتے تھے۔ اسی واسطے انہوں نے معجزات کو زیادہ رواج بھی نہیں دیا اور نہ ہی انسانیت کو مغلوب کرنے کے لیے معجزات پیش کیے۔ بلکہ معجزات بھی ناانصافیوں کو دائرہ انصاف میں لانے کے لیے پیش کیے گئے۔

انبیاء کرام سے عین ضرورتِ وقتی پر حکم خداوندی کے مطابق مبہوت کر دینے والے معجزات کا ظہور ہوتا رہا تاکہ باطل کے پرشکوہ ایوان بھی کپکپا اٹھیں۔ شمس و قمر پر ان کے معجزات نے کمندیں ڈالیں۔ ارض و سما آتش، آب و باد و خاک کے جہانوں میں معجزات انبیاء نے تصرف فرمایا۔ مگر پھر بھی دکھ دینے والوں نے انہیں دکھ دیا۔ بوجود ان قوی تر معجزاتؑ کے حاملین نے کسی سے مطالبہ حق کے سوا کچھ نہ مانگا۔ ان کو صرف یہی سمجھایا کہ نفس و دنیا تمہارے نہیں تم ان کے چاکر نہ بنو بلکہ دنیا تمہارے لیے ہے۔ تم دنیا کے لیے نہیں۔ نظام کائنات کو تمہارے لیے منظم کیا گیا ہے اور تم اپنے خالق و مالک کی شکر گذاری کے لیے ہو اور شکر گذاری عبادات و معاملات کے ساتھ ادا کرو۔ جس میں اللہ تعالےٰ کے حقوق کے ساتھ بندوں کے حقوق بھی پورے ہو سکیں۔ یہ امارت کا صحیح ترجمہ ہے جو انبیاء کے اخلاق عالیانہ کے ساتھ ہر زمانہ میں سامنے آتی رہی۔ انہوں نے چٹائی پر بیٹھ کر بغیر کسی مردم آزاری کے اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کی نگہداشت کی۔ خود زندگی کے لافانی جادۂ حق پر چلے اور دوسروں کو بھی اس راہِ صدق و صفا پر چلنے کی دعوت دی۔

انبیاء و مرسلین کا یہ وہ دستور العمل ہے۔ جس میں دونوں جہانوں

کی آسودہ حالیاں موجود ہیں۔ بلاوجہ اہلِ دنیا فکر عاقبت سے غافل ہو کر اپنی زندگی کے لامتناہی مقاصد کو دنیا کے لذات تک ہی محدود کر لیتے ہیں۔

دنیا کے سب فائدے عارضی ہیں۔ فقر و شاہی کا انحصار دل پر موقوف ہے۔ کوئی تخت و تاج کا مالک ہو کر بھی جود سخا سے محروم ہو جائے تو ایسی حرمان نصیبی بادشاہی نہیں ہو سکتی بلکہ یہ ان بخلاء کا دستور العمل ہے جو اپنی خود غرضی کی بناء پر بڑے سے بڑے فائدوں کو صرف اپنی حویلی کے اندر رکھنے کے خواہشمند ہوں۔

معاشرے میں ایسی عادات کسی طرح بھی منصفانہ نہیں ہو سکتیں بلکہ یہ عادات مذموم ہیں۔ جن کا دلدادہ ہو کر تاج و تخت کا مالک ایک حقیر زاویۂ نگاہ میں سمٹ جاتا ہے۔ جو اس کے لیے کسی طرح بھی شایانِ شان نہیں ہو سکتا۔ ایسے صاحب تخت و تاج کا مقام ایک بخیل گداگر سے بھی کمتر ہو جاتا ہے۔ اس واسطے کہ گداگر بخیل اپنی معمولی پونجی کے تحفظ کے لیے اگر بخل کرے تو اس کا یہ بخل ان کے لیے مذموم تو ہو گا مگر اضطراری ہو گا اور امراء میں اضطرار نہیں ہوتا۔ اس واسطے ان کا بخل جہاں ان کے لیے عنداللہ نقصان دہ ہے، وہاں ان کا بخل مستحق لوگوں کے لیے بھی نقصان دہ ہو کر دوہرا بخل بن جاتا ہے۔

بادشاہوں اور امرائے قوم کے ایوان چونا اور پتھر سے بنتے ہیں اور ان کے بنانے والے قوم کے صنعت گر ہوتے ہیں۔ مگر اس دنیا کے رسم و رواج بھی عجیب ہیں کہ معمار کا نام بھی مالکان کو ہی دیا جاتا ہے۔ مالکانِ تعمیرات دولت صرف کرنے والے تو کہلا سکتے ہیں۔ مگر ان پر معمار کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اہلِ دولت کا مصرف تب ہی سود مند ہوتا ہے جبکہ اہل

ہنر کے ذریعہ اس کا مقصد پورا کیا جائے۔ جن کے ذریعہ دولت مختلف صورتیں اختیار کرتی ہے۔ اگرچہ اہل دولت اور اہلِ فن کا مقام صرف ان کا ہی حق ہے۔ جو دولت کے مصرف میں ممد ہو کر ایسے ایسے کارنامے سر انجام دیتے ہیں۔ جن کے ذریعہ امراء و روساء کی تاریخی نوعیت باقی رہتی ہے۔ بادشاہوں کے ایوانِ سلطنت محتاجِ معمارانِ قوم ہوتے ہیں۔ تمکنتِ حاکمانہ میں رعیّت کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔

فلہٰذا ایوانوں میں انسانوں جیسے ہی انسان متمکن ہوتے ہیں۔ حاکم وقت کو اگر سطحِ انسانیت پر سوچنے کا تقابلی منصفانہ موقع مل جائے کہ وہ اپنے جیسے لوگوں کے پیدائشی حق کا موازنہ کر سکے تو یقیناً وہ اپنے آپ کو دوسروں کے برابر پائے گا اور اپنی دولت کو خداداد نعمت قرار دے گا۔ اور اس امتیازی فرق کے ساتھ اس پر انصاف واضح ہو گا جو خدا نے اسے تفویض فرمایا۔ پھر اگر اس پر اس نعمت کے مقاصد بھی واضح ہو جائیں تو یقیناً وہ ندامت میں ڈوب کر اپنے جیسے لوگوں کی عافیت کی راہ پیدا کرنے پر غور کرے گا۔ اور یہ معلوم کرنے میں آسانی پائے گا کہ مجھے فی الحقیقت جو عزت دی گئی ہے وہ صرف میرے ذاتی مفاد کے لیے ہی نہیں بلکہ اس میں دوسرے لوگوں کے حقوق زیادہ ہیں، جن کی نگہداشت میرے ذمہ ہے۔

نبی کریم ﷺ کی سنتِ مقدسہ کی پیروی سے امیر و غریب دونوں پر فلسفۂ زیست واضح ہو جاتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیروی کرنے والا کوئی مسلمان اپنے دائرۂ قدرت سے باہر پاؤں نہیں پھیلا سکتا۔ اسے اپنی حدودِ قسمت میں رہ کر شکر گذار ہونے اور دوسروں کے حقوق پورا

کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

یہ طریقِ زندگانی امارت و غربت میں یکساں مطمئن کرتا ہے۔ وہ شاہ و گدا ہو کر بھی اپنے مالک کا بندۂ شکر گذار رہتا ہے اور اسی پر بھروسہ کرتا ہے اور صرف اسی ایک ذات کو اپنا بادشاہ مطلق گردانتا ہے۔

ایسے ایمان میں مسلمان حکمران جہاں رعیّت کا احتساب کرتے ہیں، وہاں وہ اپنے لیے بھی احتساب پسند کرتے ہیں۔ ایک مخلص درویشِ باللہ کا احتساب عرشِ عظیم کو حرکت میں لاسکتا ہے۔ مگر ایک بے عمل بادشاہ اپنے ماتحت کو بھی بغیر امداد غیر کے حرکت نہیں دے سکتا۔ وہ خدا کی مخلوق کے سہاروں پر چلتا ہے۔ اگر اس جہان میں دوسرے سہارے ختم ہو جائیں۔ اور کوئی صرف ایک حکمران ہی باقی رہ جائے تو وہ کن سہاروں پر حکمرانی کرے گا۔

حکمرانی صرف اللہ ہی کے لیے زیبا ہے۔ یہ دنیوی بادشاہ صرف عالم مجاز میں مجازی ذمہ دار ہیں۔ اگر وہ ذمہ داری کو پورا نہ کریں گے تو ان سے ان کے نجی معاملات اور رعیّت کے معاملات کے بارے میں باز پُرس ہو گی۔ ہر انسان اپنے ذاتی وجود کے ساتھ احکامات الٰہیہ کا مکلّف کر دیا گیا یہ تکلف عرف نفی کے ساتھ عرف اثبات کے لیے ہے۔ اس طرح ہر انسان اپنے جسم و جان کا مجازی حکمران ہوا اور اپنی وجود کی ظاہری و باطنی صلاحیتیں اس کی رعیت ہوئیں۔

لفظِ انسان تکرم کی بناء پر عقل و نطق چاہتا ہے نہ کہ مال و منال۔ تکرم انسانیت عقل و نطق کے ساتھ متعلق ہے نہ کہ خارج سے ساری کائنات متاعِ انسان ہے اور متاعِ زندگی کسی طرح بھی خدا نہیں ہو سکتا۔

بس جس نے اتنا پالیا۔ وہ ہر حال خوش و خرم ہے۔ جس نے اتنا بھی نہ سوچا، وہ ہر حال پژمردہ حال ہے۔ اس کی اصل مایوس کن ہے۔ جو اس کی موت و زیست میں اس پر سیاہ بادلوں کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ ایسا آدمی نہ تو ایوانِ شاہی کو اپنی طمانیت کے لیے پناہ گاہ بنا سکتا ہے اور نہ ہی دشت و جبل میں اسے پناہ مل سکتی ہے۔ وہ اپنے اندر اور باہر بے پناہ مایوسیوں میں گھرا ہوا بظاہر انسانی ڈھانچہ ہوتا ہے۔ مگر نگاہِ حق میں بڑا ناتواں۔ جس نے سب سے بڑے مالک سے مایوس ہو کر دیگر سہارے پکڑے۔ مگر سب کے سب ضعیف اور بے سود۔

نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین نے فرمایا ہے کہ ہم غریب رہ کر وہ سلطنت پا گئے جو صحیح اطمینان کا ذریعہ بنی۔ ان کے جھونپڑے استقامتِ ایمانیہ کے وہ وہ محل تعمیر کر گئے جن کے سامنے شاہی ایوان بھی سرنگوں ہیں۔ ان برگزیدگانِ رب العالمین نے لوگوں کو نصیحت فرمائی کہ خداداد نعمتوں کا ہمیشہ شکرانہ ادا کرو اور عملِ صالح کی کھلی تفسیر بن جاؤ۔ تماشائے جہاں بننے کے بجائے خدائے کریم کی نگاہِ رحمت کے سامنے رحمت و بخشش کے طلب گار رہو۔ ہر کامیابی پر الحمد للہ وردِ زبان ہو۔ شکرانہ ایزادِ رحمت کا ذریعہ ہے۔ جس کی برکت پشت ہا پشت تک جاری رہتی ہے۔ خدا کا نماز کے ساتھ جو شکرانہ ادا کیا جائے، وہ زیادہ بخشش و عنایات کا ذریعہ بنتا ہے۔ ایسی نماز ہو جو وجد آفریں اور کیف انگیز ہو۔ چونکہ تمہارا مالک سب سے بڑا محبوب ہے۔ اس کے حسن و جمال کے سامنے سارے جہان جھلس جائیں۔ وہ جہاں محبوبِ مطلق ہے، وہاں معبودِ مطلق بھی ہے۔ وہ سب کو پالتا ہے اور پیار کرتا ہے۔ اور عزّت و ذلّت اس کے ہاتھ میں

ہیں۔ وہی سارے جہانوں کا مالک و مختار ہے۔ جو رہنے کے لیے مکان اور پہننے کے لیے لباس دیتا ہے۔

بس اگر ان حالات میں کوئی خوش نصیب اللہ تعالےٰ کا شکر گزار بندہ بن جائے تو اس بندگی پر بختِ سکندری بھی قربان ہے۔ بخشش کریمانہ کے مقابل کسی ذاتی ہنر مندی پر ناز نہیں کرنا چاہیے۔ اس واسطے کہ ہنر مندی بھی اسی کی عطا ہے۔

قابلِ قدر بات اللہ و رسول پر اور یومِ آخرت پر ایمان لانا ہے۔ باقی جہان اور اس کی نعمتیں وقتی ہیں۔ دائمی نہیں۔ پھر ایسے ایمان کی حفاظت اعتراف کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہمہ وقت تلافی مافات کے لیے اس طرح توبہ کی جائے کہ گویا مجھ سے کوئی نیکی ہوئی ہی نہیں۔ اعتراف یوں کرے۔ اے اللہ بس تو نیک ہے۔ تیرے رسول نیک ہیں۔ اپنے نیک بندوں کے توسل سے ہمیں بھی راہِ راست پر قائم رکھنا اور نفس و شیطان سے ہمیں اپنی پناہ میں رکھنا۔

پناہ حاصل کرنے کے لیے توبہ ہی بہتر ذریعہ ہے اور مقبول توبہ عجبِ نفسی کے برعکس اعترافِ عجز کے ساتھ میسر آتی ہے۔ معمولی سا غرور بھی توبہ کو ضعیف کر دیتا ہے۔ اور غرورِ نفس کے ساتھ توبہ ساقط ہو جاتی ہے۔

چونکہ غرور و تکبر اللہ کی صفت ہے۔ یہ کسی اور کے لیے زیبا نہیں۔ توبہ عبودیت کے ساتھ اظہارِ اعتراف کا نام ہے جو اپنے مالک و مختار کے سامنے کی جاتی ہے۔ اسلام میں کردہ اور ناکردہ گناہ کی تفصیل پانچویں اور چھٹے کلمہ استغفار اور کلمہ ردِ کفر میں تعلیماً بیان کر دی گئی ہے۔

اَستَغفِرُو اللهَ رَبّي۔ اے میرے پالنے والے خدا میں تجھ سے بخشش مانگتا ہوں۔ مِن کُلِّ ذَنبٍ ہر قسم کے کبیرہ اور صغیرہ گناہ سے۔ اَذنَبتُہٗ عَمداً۔ ان گناہوں سے بھی توبہ کے ساتھ بخشش کا خواستگار ہوں، جو مجھ سے عمداً سرزد ہوئے اَوخَطَأً یا خطاء سے سرزد ہوئے۔ اَوسِرّاً یا لوگوں سے چھپ کر سرزد ہوئے اَوعَلانِیَۃً یا اعلانیہ سرزد ہوئے۔ وَاَتُوبُ اِلَیہِ میں اعتراف گناہ کے ساتھ صدقِ دل سے توبہ کرتا ہوں اور توبہ کے ساتھ تیری طرف لوٹتا ہوں۔ گناہوں سے منہ پھیر کر تیری طرف یعنی تیرے دین کی بتائی ہوئی راہ پر لوٹتا ہوں۔

مِنَ الذَّنبِ الَّذِی اَعلَمُ ان گناہوں کی بھی توبہ کرتا ہوں، جو میری دانست میں ہیں یعنی مجھے یاد ہیں یا میرے علم میں ہیں۔ وَمِنَ الذَّنبِ الَّذِی لَا اَعلَمُ اور ان گناہوں سے توبہ کرتا ہو، جو میری دانست، یا علم میں نہیں یعنی مجھے ان کی یاد نہیں۔

اِنَّکَ اَنتَ عَلَّامُ الغُیُوبِ اس واسطے نامعلوم گناہوں کی توبہ کرتا ہوں۔ شاید کہ مجھ سے کچھ ایسے گناہ ہو گئے ہوں، جو مجھے یاد نہ ہوں۔ مگر چونکہ اے اللہ تو پوشیدہ چیزوں کا جاننے والا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں صرف ان گناہوں کی توبہ کروں۔ جو میرے علم میں ہیں۔ تو دلوں کے بھید جاننے والا ہے کہ اس سے اور بھی گناہ سرزد ہو چکے ہیں۔ ایسا اعتراف کردہ اور ناکردہ، معلوم اور نہ معلوم، دونوں قسم کے گناہوں سے توبہ کرنے کے ساتھ مکمل ہوتا ہے۔ وَسَتَّارُ العُیُوبِ تو اپنے بندوں کے گناہوں کو لوگوں کی نظر سے چھپاتا ہے اور اس طرح ان کو ذلت و رسوائی سے بچاتا ہے۔ وَغَفَّارُ الذُّنُوبِ اور توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کر کے

انہیں بخشنے والا مہربان ہے۔ تیرے سوا کوئی طاقت ایسا کرنے پر قادر نہیں۔ اَللّٰھُمَّ اِنِی اَعُوذُبِکَ مِن اَن اُشرِکَ بِکَ شیاء اے میرے اللہ میں تجھ سے یہ پناہ بھی چاہتا ہوں کہ میں تیری ذات کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ گردانوں۔ وَاَنَا اَعلَمُ بِہ اور وہ میری دانستہ ہو۔ اَستَغفِرُکَ میں تجھ سے بخشش چاہتا ہوں۔ لِمَالَااَعلَم بِہ تبت عنہ اور اس قسم کے شرکیہ گناہ جو میری دانست میں نہیں ان کے متعلق بھی معافی کی درخواست کرتا ہوں۔ وَتَبرّاتُ مِنَ الکُفرِ والشرک اور اس توبہ کے ساتھ کفر اور شرک سے برات کا اعلان کرتا ہوں کہ مسلمان ہو کر پھر کسی کو تیرا شریک ٹھہراؤں۔ وَالکذبِ اور جھوٹ سے بھی اس توبہ کے ساتھ بریت کا اقرار کرتا ہوں۔ وَالغیبَتہ اور پس پردہ کسی کے خلاف کوئی ایسی بات نہیں کروں گا۔ جس سے شریعت اسلام نے منع کیا ہو اور اس بات سے عندالاسلام غیبت کا اطلاق ہوتا ہو۔ وَالبِدعَتِ اور کتاب و سنت اور اجماعِ صحابہ اور سلف صالحین کی بتائی ہوئی باتوں یا بتائے ہوئے اعمال کے سوا کسی نئی بات پر چلنے یا نئی بات بنانے، جس کو اسلامی شریعت نے بدعت شنیعہ قرار دیا ہو، اس قسم کی بدعات سے بھی بریت کا اقرار کرتا ہوں۔ وَالنَّمِیمَتہ اور کسی کی پس پردہ چغلی بھی نہیں کروں گا اور اس قسم کی چغل خوار نہ مردم آزاری سے بھی بریت کا اعلان کرتا ہو۔ والفواحش وَالبُھتانِ اور کسی پر بہتان تراشی سے بھی بریت کا اقرار کرتا ہوں۔ وَالمَعَاصی کلھا اور ان تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے بھی بریت کا اقرار کرتا ہوں۔ جن کو دینِ اسلام میں گناہ قرار دیا گیا ہے۔

ان دو کلموں میں جس پاک انداز سے باریک تفصیل کے ساتھ بندۂ مومن کو اعتراف کے ساتھ طریقِ توبہ سکھایا گیا ہے۔ اگر پورے غور و

خوص کے ساتھ کوئی بندۂ خدا اس کے معانی پر نظر رکھتے ہوئے اپنے حال کا احتساب کرے تو خوفِ خدا سے اس کا ظاہر و باطن لرز اٹھے تو پھر اسے اپنی نیکیاں بھول جائیں وہ سراپا بندگی ہو جائے اور اس کا رونگٹہ رونگٹہ توبہ بن جائے اور خدا کے دامنِ رحمت میں پناہ لے لے۔ خدا نے یہ توبہ اپنے بندوں کو اسی واسطے عطا فرمائی ہے کہ وہ میرے احکامات کی بجاآوری کرتے رہیں اور توبہ کے ساتھ میری طرف بار بار لوٹتے رہیں اور میری رحمت بار بار ان کو اپنی پناہ میں لیتی رہے۔

عاجزی اور فروتنی سے مراد یہ نہیں، کہ کوئی دریوزہ گر ہو جائے اور ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر کنجِ قفس میں بیٹھ جائے۔ بلکہ انبیاء و اولیاء کی تاریخ احوال میں عنداللہ عاجزی اختیار کرنے سے مراد یہ ہے کہ بندۂ مومن بہر طور متقیانہ اندازِ فقر کے ساتھ صرف اللہ کے نزدیک عاجز ہو جائے اور اپنی صلاحیتوں کے تمام ہتھیار خدا کے سامنے ڈال کر محض اس کا بندۂ خاص بن جائے۔ اور غیر اللہ پر غالب رہے کسی غیر اللہ کے سامنے اس طرح مغلوب نہ ہو، جس طرح وہ اللہ کے سامنے مغلوب ہوا۔

جب محوِ عبادت ہو تو تمام کائنات سے کٹ کر صرف اسی کی طرف متوجہ ہو جائے اور ایسی عبادت رات کے پرسکون ماحول میں زیادہ میسر آتی ہے۔ اور دن میں کاروبارِ دنیا میں اتنا مشغول ہو کہ نمازِ پنجگانہ کے علاوہ، باقی اوقات معاملاتِ دینیہ میں خرچ کرے اور دشمنی اور دوستی بھی محض للہ تعالےٰ ہو اور بندوں کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے دوستوں سے اس واسطے دوستی کریں کہ ان کی دوستی میں اللہ کی خوشنودی ہے اور ان کے ذریعہ ہدایت ملتی ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کے دشمنوں سے ایسا سلوک کرے

کہ نہ تو وہ دوستی ہو، کہ خدا ناراض ہو بلکہ اس کو اخلاقِ اسلامیہ کے ساتھ ہدایت دے اور کوشش کرے کہ وہ بھی صالح ہو جائے اور اس کی خدمت کرے۔ رواداری کرے تاکہ وہ خدا کی دشمنی میں ہلاک نہ ہو جائے۔

یہ اسلامی رواداری ہے، جو وعظ و نصیحت کے ساتھ ساتھ اخلاقی تبلیغ بن جاتی ہے۔ مگر کوئی دشمنِ خدا جب اس حد تک پہنچ جائے کہ وہ اعلانیہ خدا اور رسول کی توہین کرے اور خدا کے دین کی توہین پر آتر آئے تو ایسی حالت میں اس کے ساتھ رواداری ترک کر دے اور دشمنی بھی اللہ ہی کے لیے کرے۔ ذاتی عصبیت کو ایسی دشمنی میں شامل کرنے سے مقصدِ ایمان فوت ہو جاتا ہے۔

مسلمان کی دشمنی اور دوستی دونوں اسلامی اخلاق کے دائروں میں ہوں تو زیادہ بخشش کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ مسلمان باطل کے سامنے سینہ سپر ہو سکتا ہے۔ مگر منافقت نہیں کر سکتا۔ مومن ولی اللہ ہے۔ وہ اللہ کے سوا کسی غیر سے خوف نہیں کھا سکتا۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

الا ان اولیاء الله لا خوف علیهم ولا هم یحزنون

یعنی اللہ کے دوستوں کو کوئی خوف نہیں اور نہ ہی آئندہ کوئی حزن و ملال ہو گا۔ اس آیت میں لفظ اولیاء کو تعلق باللہ کی بناء پر خوف و حزن سے آزاد قرار دیا گیا ہے۔ تعلق باللہ سے مراد اللہ پر کامل بھروسہ رکھنے والے سالکین راہ حقیقت ہیں جو سوائے اللہ کے کسی دوسری طاقت سے اس واسطے نہیں ڈرتے، کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے۔

یہ ان کا ذاتی کردار نہیں۔ بلکہ تعلقِ باللہ کا نتیجہ ہے۔ متعلق بالغیر نہ تو ولی اللہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی خوف و حزن سے نجات پا سکتا ہے۔

دنیا خوف و حزن و ملال کا گھر ہے۔ زندگی خود ایک آزمائشی خوف و خطر ہے۔ احساسات زندگی حزن و ملال کی نوک پلک تیز کرتے ہیں اور قلب و جگر کے لیے تیز نشتر بن جاتے ہیں۔ تمام مجازی مقاصد ایک فتنۂ عظیم ہیں۔

خدا نے بھی اموال و اولاد کو تمہارے لیے فتنہ یعنی آزمائش بنایا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

انما اموالکم و اولاد کم فتنته

یعنی تمہارے مال اور تمہاری اولاد دونوں تمہارے لیے آزمائش ہیں۔

ہر راحت کے ساتھ غم، ہر عروج کے ساتھ زوال، ہر صحت کے ساتھ مرض، ہر زندگی کے ساتھ موت، یہ وبائیں، یہ آلام و آشوب در آشوب، فراق در فراق ایام زندگی کے لیے ایک مجموعۂ خوف ہیں۔ اس جہانِ مرغوب کے حادثات، یہ پر لطف زندگی کے قلوب و اذہان میں قہر آفرینیاں۔ پھر کیسے اور کیونکر کہا جائے کہ دنیا راحت کدہ ہے۔

دنیا کسی طور راحت کدہ نہیں۔ یہاں کسی کروٹ چین نہیں۔ یہاں تو درحقیقت ہر تبسم کے بعد آنسو بہانے پڑتے ہیں۔ یہاں ہر راحت کا اتمام کلفت پر ہوتا ہے۔ دنیا کی کوئی راحت مستقل نہیں کوئی تبسم یا شادکامی دیرپا نہیں۔ گردشِ لیل و نہار دونوں مل کر جہاں روشنی اور آرام پہنچانے کا ذریعہ ہیں، وہاں محبوب ترمتاعِ حیات کو یوماً فیوم کم کرنے میں بھی مصروفِ عمل ہیں۔

یہ کس قدر فریبِ نفس ہے کہ ہر انسان موت سے دور رہنا چاہتا

ہے مگر اس تمنا کے باوجود وہ کشاں کشاں موت کی طرف برق رفتار کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ کون ہے؟ جو یہ نہیں جانتا! کہ میری شام میری زندگی کے بارہ گھنٹے کم کر دے گی اور میری صبح میری زندگی کے مزید بارہ گھنٹے کم کر کے چوبیس گھنٹوں کے ساتھ موت کی طرف دھکیل دے گی۔ کون نہیں جانتا؟! کہ مہینہ بھر کی عرق ریزی اور پہلی تاریخ کا بے قرار کر دینے والا انتظار اس کی زندگی کے تیس یوم لوٹ لے گا۔ کون نہیں جانتا؟! کہ سال کے اختتام پذیر ہونے کی بے قراریاں اس کی زندگی کے بارہ مہینے سلب کر لیں گی۔ کون نہیں جانتا کہ اولادوں کی شباب آفرینی اگرچہ شادمانی کا باعث ہے۔ مگر ان کا شباب ماں باپ کو بڑھاپے میں لاکھڑا کرتا ہے۔

مگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی سب لوگ دن کی تھکان دور کرنے اور بچوں میں مل بیٹھنے کے لیے کتنی تعجیل سے دن گذار کر رات سے ملنا چاہتے ہیں اور رات کے وقوع کے بعد پھر صبحِ نو کی امید لگا لیتے ہیں۔ دنوں کے ہفتے اور ہفتوں کے مہینے اور مہینوں کے سال اور سالوں پر عمریں اور عمروں پر موت مرتب کر لیتے ہیں۔

یہ لذتِ دنیا و لذتِ نفس ہے جو وقت کی اہمیت سے بیگانہ بنا دیتی ہے اور حیاتِ جاوداں کو حیاتِ موہوم بنا کر مقصدِ دوام سے دور کر دیتی ہے۔ زندگی امیر ہو یا غریب وہ زندگی ہے۔ دریدہ حال ہو، یا فاقہ کش۔ بہر حال زندگی جس جامہ و حال میں بھی ہو، دار لفراق کی مسافر ہے۔

اور یہ زندگی بڑی قیمتی ہے، جس کو اہلِ دنیا محض نفس کے دلدل میں پھنسا لیتے ہیں اور دنیا کے مستعار سودے کیے جاتے ہیں۔ جو موت کے بعد زادِ راہ نہیں بن سکتے۔

حلال محنت کی حلال کمائی کھانے والے ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ اور سچائی ہی تقوے کی بنیاد ہے۔ حرام کھانے والا سچ نہیں بول سکتا اور سچ نہ بولنے والا سچائی سے محروم ہو جاتا ہے۔ جس سے بندگی کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ حلال کمائی کر کے خود کھانے والے سخی بھی ہوتے ہیں۔ ان کے دستر خوان بابرکت ہوتے ہیں۔ جس سے مستحقین فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ایسے صالحین لوگوں کے دستر خوان خود سیراب ہونے کے بعد دوسروں کو بھی سیراب کرتے ہیں۔ ان کے گھر بار، رہنا سہنا، جلوت و خلوت، سفر و حضر بابرکت ہوتے ہیں ایسے لوگوں کو حلال کمائی پر صبر و توکل بھی مل جاتا ہے۔ ان لوگوں کا توکل راہبانہ نہیں ہوتا بلکہ محنت شاقہ سے حلال کمائی کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے۔

حرام کھانے سے صبر و توکل کمزور پڑ جاتے ہیں۔ ہر قسم کا حرام بدن کے مختلف حصوں سے شروع ہو کر سارے جسم پر اپنا برا اثر ڈالتا ہے اور بدن بجائے نیکیوں کے بدیوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

جو لوگ دین کے مطابق توکل اختیار کرتے ہیں۔ ان کی روزی میں برکت ہوتی ہے۔ ان کے جان و مال و اولاد رحمتوں اور برکتوں کے ساتھ صلاحیتیں پاتے ہیں۔ متوکل کا ایک لقمہ ہزار لقموں سے بہتر اور تاثیرات میں شفائے روحانی اور شفائے جسمانی بخشتا ہے۔ متوکل باللہ کی امارت و غربت دونوں بابرکت ہوتے ہیں۔ وہ حریص نہیں ہوتا۔ وہ قانع اور بردبار ہوتا ہے۔ زیادہ ملنے پر حیوانوں کی طرح سرمستی نہیں کرتا۔ اور تھوڑا ملنے پر مایوس نہیں ہوتا اور نہ ہی خدا سے ناامید ہوتا ہے۔

# چوبیسواں باب

## راضی برضا رہنا

راضی برضائے خدا ہونا ہی رضا جوئی حق حاصل کرنے کا صحیح ذریعہ ہے۔ اگر اہلِ ایمان اس پر استقامت پالیں تو اللہ تعالےٰ دنیا و عقبےٰ میں ان کی مدد کرتا ہے۔

میرے ابا جان نے جب مجھے خرقۂ خلافت عطا فرمایا، جو آپ کو بغداد شریف میں خلافت کے لیے تفویض ہوا تھا۔ تو نصیحت فرمائی تھی کہ حقیقی لباس ایمان باللہ ہے اور بندگی ہے۔

یہ خرقہ اہل اللہ کی امانت ہے۔ یہ لباسِ محض نہیں۔ یہ صابرین و شاکرین اور متوکلین کا لباس ہے۔ لباس بدن پر ہوتا ہے اور بدن لباس کے اندر اگر بدن ہی غلط ہو جائے تو خرقہ بجائے برکت کے لبادۂ محض رہ جائے گا اور قیامت میں تمہارے خلاف گواہی دے گا۔ اس نصیحت نے میرا ایمان تازہ کر دیا۔ نیز فرمایا:۔ حلال کھاؤ تاکہ سچ بولو۔ اور سچ بولو تاکہ متقی ہو جاؤ۔ پھر اس خرقۂ مبارک کی کرامات تم پر واضح ہو جائیں گی۔

میں نے حتی المقدور نصیحت پر عمل کیا، جس کا نتیجہ مجھے بندگی کی صورت میں ملتا رہا۔ یہ تمام چیزیں چاہے مال ہوں یا اولاد، یا روحانی کرامات سب اللہ تعالیٰ کی عطا ہوتے ہیں۔ علم و ہنر و اعلیٰ منصبِ سب عطائے خدا

ہیں۔ ان کے ملنے کے بعد بھی اگر انسان سچائی پر قائم رہے تو یہ سب عطیات خداوندی مزید برکات سے نوازتے ہیں۔

وہ فقر و غنا جو اللہ تعالےٰ کی بندگی سے ملے، دنیا بھر میں اس سے بہتر کوئی دوسرا متاع نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ خرقہ اگر محض ظاہری لبادہ بن جائے۔ تو ایک ریاکارانہ فریب بن کر بے معنی ہو جاتا ہے۔

ہر حلال چیز چاہے تھوڑی ہو یا بہت۔ انعامِ خداوندی ہے۔ ایسی نعمت کو ریا سے بچانا انعامات کو زیادہ کرتا ہے۔ تصوّف یا فقر کسی جبہ و دستار یا کسی تسبیح و مسند کی میراث نہیں بلکہ ہر وہ مسلمان اس کا وارث ہے، جو حلال کھاتا اور حرام سے بچتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عنایات کے بعد مشکور ہوتا ہے۔ ایسے سب مسلمان ولی اللہ ہیں۔

بس درجات بندگی کے لحاظ سے ان میں فرق مراتب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ بعض زیادہ متقی ہونے کی بنا پر اعلیٰ مقامات پر فائز کر دیے جاتے ہیں۔ اور ان میں بعض ولی اللہ صاحب خرق عادت ہو جائیں۔ تو ان کو زمین پر روحانی خدمات کے لیے مامور کر دیا جاتا ہے۔

درجات کے لحاظ سے سب سے بڑا متقی غوث وقت ہوتا ہے۔ اسی کو قطب الاقطاب بھی کہا جاتا ہے۔ ہر غوث کے ماتحت چار قطب ہوتے ہیں جو پوری دنیا میں شرقاً غرباً شمالاً، جنوباً چار حصوں پر مامور کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ چاروں قطب غوث وقت کی نگرانی میں کام کرتے ہیں۔ نیز اوتاد و ابدال ان چار اقطاب کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام متقی اولیائے امت جو صاحبِ نظر ہوتے ہیں، ابدالوں اور اوتادوں کے ماتحت ہوتے ہیں۔ ان متقی ولیوں میں بعض صاحبِ منزل سالک بھی ہوتے ہیں

اور تمام کلمہ گو افراد کو ان کے تابع کر دیا جاتا ہے اور کلمہ گو افراد کو پوری غیر مسلم انسانیت پر فضیلت حاصل ہے۔

اللہ کے نزدیک ساری دنیا ان کے تابع ہے اور صرف اہل ایمان کی برکت سے دنیا آباد ہے۔ یہی لوگ اسلام کے عوام ہیں جن کو تمام دنیا کی مجموعی قوت کہا جاتا ہے۔ تمام تصرفات و انعامات ان کے لیے ہی من جانب اللہ دنیا میں وارد کیے جاتے ہیں۔ دراصل یہ نظامِ روحانیت تزکیہ نفس کے لیے عمل میں لایا جاتا ہے۔

اس نظام کو اصلاحِ فردیت کی بنیاد سے شروع کرکے اسلامی اجتماعیت تک پھیلایا جاتا ہے۔ بعد میں جب یہ لوگ اسلامی ریاضت کے ذریعہ اسلامی اخلاق پا لیتے ہیں، تو انہیں تصرفات دے کر انتظامات پر مامور کر دیا جاتا ہے۔

ایسے لوگوں کے نزدیک تصرفاتِ ارضی کے لیے وہی لوگ موزوں ہیں جو اسلامی اخلاقیات کے حامل ہوں۔ روحانی یا مادی دونوں تصرفات پر وہی لوگ نامور ہوتے ہیں، جو عقائد، عبادات و معاملات اور معاشرت کے مسائل کو سمجھ سکتے ہوں۔ اس روحانی اور مادی نظام کا مقصد اللہ تعالیٰ کے نزدیک ملت اسلامیہ کو اجتماعاً حزب اللہ بنانا مقصود ہوتا ہے تاکہ ملتِ اسلامیہ غلبہ پا کر بنی نوع انسان کو اسلامی اخلاق کا درس دے سکے۔ اسلام کی یہی وہ تنظیم عظیم ہے۔ جس کو ادیانِ عالم پر غالب کر دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ مسلمان اس نظام اسلامی کو اپنا ضابطہ حیات مان لیں اور اس پر عمل کریں۔ اسلام کی سیاست کی مثال جسم و روح کے مانند ہے۔ جس طرح اشتراک جسم و روح نظامِ حیات کا باعث ہے۔ اور جسم روح کو پا کر ہی

صاحب احساس ہوتا ہے۔ پھر بیداریٔ احساس کے بعد اسے ضروریات درپیش آتی ہیں۔ اور ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہر فرد دوسرے فرد کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ اور فرد اجتماع کے لیے اور اجتماع فرد کے لیے لازم و ملزوم کر دیئے جاتے ہیں۔ اسی واسطے یہ ساری کائنات انسانی ضروریات پورا کرنے کے لیے کفایت سے کہیں زیادہ نعمتوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

دستور رحمانی متقیانہ نظم و ضبط کے ساتھ کائنات پر اہل ایمان کا تصرف چاہتا ہے تاکہ وہ اس کائنات کو اللہ تعالیٰ کا دستر خوانِ نعمت سمجھ کر اس کو اپنے مصرف میں لائیں اور یہ مصرف ایسا ہو کہ بنی نوع انسان تک اس کے استفادے عام کر دیئے جائیں۔ اور راہ خدمت انسانیہ میں یہ تنظیم عصبیت سے کلیتہً پرہیز کرے۔ یہ تنظیم فرداً و اجتماعاً نیک بنے۔ خود کو پابند احکام بنائے اور رحمتِ خداوندی کو پوری مخلوق کے لیے عام جانے۔

اس زاویہ سے ہٹ جانا اللہ تعالےٰ کی رحمت کے منافی ہے۔ وہ شخص جو رحمتِ خداوندی اور عامتہ الناس کو الگ الگ جانے، ولایت کے مرکز سے ہٹ جاتا ہے۔ اس کی ولایت سنت اللہ کے خلاف ہے۔ چونکہ اس نے خدا کی رحمت عامہ سے خود استفادہ کیا ہے۔ اب وہ دوسروں کو اس رحمت سے کیوں الگ جانے۔ یہ متقیانہ بندگی کے بھی منافی ہے۔

اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ وَسِعَت رَحمَتِی کُلَّ شَئی میری رحمت ہر چیز پر محیط ہے۔

اللہ کے اس فرمان کے بعد اللہ کا کوئی بندہ انسانی حقوق کی ادائیگی

سے غافل نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی رحمت سے مخلوقات کو بیگانہ سمجھنا بیگانۂ ایمان لوگوں کا خیال ہو سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے دو حکومتیں اس طرح قائم کر رکھی ہیں۔ جس طرح نظام جسم میں روحانیت کا نظام لازم اور بدن کا انتظام اس کے ساتھ ملزوم کر دیا گیا ہے۔ چونکہ جسم مادی سے کہیں زیادہ روحانیت نیک صلاحیتوں کی حامل ہے۔ یہ جسم ایک میدان ہے۔ جس میں نیکی و بدی دونوں کے تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ اگر نیک اعمال کے ساتھ روحانیت جسم میں نیک تجربات جاری رکھے تو انسان نیک ہو کر ولی اللہ کا مقام پا لیتا ہے اور برائی پر تجربات کرنے سے جسم اللہ کے سوا غیر کا ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ محض دنیا دار ہو کر خواہش کے بندے بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ لازم پر ملزوم کو ترجیح دیتے ہیں، جو اصولِ فطرت کے خلاف ہے۔

اس غلط زاویۂ حیات پر کسی طرح بھی اطمینان کامل نہیں مل سکتا۔ دنیا کی روحانی اور مادی دونوں حکومتیں بظاہر افراد کے ہی سپرد ہوتی ہیں۔ مگر یہ افرادِ قوم روح کے مانند ہوتے ہیں۔ اور قوم مانند جسم۔

وہ افرادِ قوم جو اپنی خداداد صلاحیتوں سے انسانیت کے لیے استفادہ عام کے قائل ہوتے ہیں۔ ان کے تزکیۂ نفس کا مقصد یہی ہوتا ہے۔ کہ وہ مجاہدات کے ساتھ نفس کو ان قباحتوں سے صاف کر لیں جو خدا کی بندگی اور مخلوق کی خدمت میں ریا و نمود کا ذریعہ بنتی ہیں۔ تعصب کا مرض پیدا کرتی ہیں۔ ریا و نمود اور عصبیّت مادہ پرستی کی پیداوار ہیں۔ اور وہ مادی زندگی جس میں خوفِ خدا نہ ہو۔ کسی طرح بھی ایسے امراض سے نجات نہیں

پا سکتی۔

البتہ اگر مادہ پرست زیادہ سے زیادہ مادی اخلاق کا روادار ہو گا تو لوگوں تک اپنی مادی خدمات پہنچا سکے گا۔ بیماروں کی عیادت اور اہل احتیاج کی خدمت بھی کر سکے گا۔ مگر چونکہ وہ دل کو خدا سے الگ کرنے کے بعد ایسا کرتا ہے۔ اس واسطے اس کی روح بے لوث جذبات نہیں پا سکتی۔

جب روح کا تعلق قطعی مادیات کے ساتھ ہو جائے تو اس کی تربیت انسانی تربیت سے الگ ہو کر نفسانی تربیت کی تابع ہو جاتی ہے۔ اور اس کی نشوونما سراسر نفس کے سائیوں میں نفس ہی بن جاتی ہے۔

ایسی حالت میں ایک مدت کے بعد جسم و روح دونوں کا ایک ہی مسلک ہو جاتا ہے۔ اور ایسی حالت میں انسان سوائے ریاو نمود کے کچھ نہیں رہتا۔

اصلاً ایسی طبعِ کسی کی خیر خواہ نہیں ہوتی۔ اگر وہ افراد قوم جو انسانی معاشرہ میں کسی پہلو پر بھی خاص ہو جائیں۔ اور معاشرہ پر انہیں درجہ بھی مل جائے تو ایسے لوگوں کے ذریعہ معاشرہ کو مادی آسودگی ہی مل سکتی ہے۔ مگر یہ آسودگی اپنے روحانی لازمہ سے الگ ہو کر پورے معاشرہ کو محض نفسانی حرص و ہوا کا بندہ بنا دیتی ہے۔ اور پورا معاشرہ جب ایسے نظریہ کی لپیٹ میں آجائے۔ کہ بس زندگی یہی کچھ ہے۔ کہ موت تک اس کے لوازمات بعیش و طرب پورے کیے جائیں۔ تو ایسے معاشرہ کی سوچ خالص نہیں رہ سکتی۔

ایسا معاشرہ اور اس کے مادی راہنما دونوں مل جل کر ایک راہ پر چل پڑتے ہیں جس کا اتمام موت پر اپنی حد کو پورا کر لیتا ہے۔ مگر روحانی اخلاق

سے تہی دامن زندگی کا اعتبار ہی کھو بیٹھتے ہیں۔ اور اس اعتبار کی عدم موجودگی میں جسم و روح دونوں اگر مادہ پرست ہو جائیں تو فطری نیکی کی بنیاد ہی اکھڑ جاتی ہے۔ ہر نیکی کا تعلق خدا سے وابستہ ہو کر ہی نیکی بنتا ہے۔

اسلام میں تزکیۂ نفس سے خاص یا خاص الخاص ہونا اپنی اور معاشرہ کی بخشش حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اور اس کی بنیاد تقویٰ ہے۔ جو شیوخ تقویٰ نصابِ تقویٰ کے ساتھ عملاً کسی درجہ پر فائز ہو جاتے ہیں تو ان کو عالمِ امر کی طرف سے معاشرہ کی روحانیت و مادیت دونوں کی اصلاح پر من جانب اللہ مامور کر دیا جاتا ہے۔ مگر یہ لوگ روسائے دنیا کی طرح مال و دولت کو حشمت نفسانی کے لیے خرچ نہیں کرتے۔ اور نہ ہی دوسری صلاحیتوں کو محض برائے مادہ تصرف میں لاتے ہیں۔ ایسے لوگ حاکمانہ تمکنت سے بھی طبعاً بیزار ہوتے ہیں۔ البتہ ان کا مقصد خدمت اللہ تعالیٰ سے اصولِ نجات کے لیے ہوتا ہے۔ ایسے لوگ ہر چیز کو خدا کی عطا کردہ نعمت جانتے ہیں۔ اس کو اپنی ملکیت نہیں سمجھتے۔ یہ ایک ایسا انسان ہے جو عبادت میں اور خدمتِ خلق میں یکساں جذبۂ ایمان کے ساتھ کام کرتا ہے۔ بس اس کا ایک ہی مقصد ہے کہ اس فانی دنیا میں کوئی انسان بھی اللہ سے غافل نہ ہو اور نہ ہی اللہ کے سوا کسی کا محتاج ہو۔

ایسے لوگوں کی تبلیغ قولاً اور عملاً اظہار عبودیت کے لیے ہوتی ہے۔ ان کی خدمات سے معاشرہ نیکی پاتا ہے اور خوفِ خدا حاصل کرتا ہے۔ جس کی بنا پر ظلم و ستم بد اخلاقی اور جرائم کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جب اربابِ بست و کشاد ایسے نیک ہو جائیں تو ان کی مثال قلب و روح کے مانند ہو جاتی

ہے اور نیک معاشرہ کی مثال نیک جسم کے مانند ہے۔ جس طرح روح و جسم کے صحت مند ہونے سے آدمی زیادہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس طرح نیک رہنماؤں کے ساتھ معاشرہ کا صحت مندہ ہونا اجتماعی طمانیت بن جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات کا یہی منشا ہے۔ کہ فرد قوم نیکی کا مجسمہ بن کر اجتماع قوم میں مدغم ہو جائے اور اجتماعِ قوم صلح ہونے کے لیے افراد پر اپنی تعمیر مکمل کرے۔ اگر دونوں نیک ہو جائیں تو فانی زندگی آسودگی کے علاوہ خدا کو بھی پالے گی۔ اور ایسے لوگوں کے نزدیک سفر حیات صرف موت تک ہی محدود ہو کر ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ان کے نزدیک قیامت تک جاری رہنے والا سفر ہے۔

ابا جان نے مجھے خرقۂ خلافت تفویض فرمایا۔ اور پند و نصائح سے فردیت کی جامع تشریح فرمائی۔ اور ایک متقی فرد کے اجتماعی مفاد پر عارفانہ روشنی ڈالی جس پر مجھے معلوم ہوا کہ بندگی کے تاثرات محض اپنے لیے ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے خیر و برکت کا ذریعہ ہیں۔

چونکہ وہ اپنے اس مالک و مختار کا بندہ ہے جو ساری مخلوقات کا پالنے والا ہے، جب وہ اپنے مالک و مختار کا بندہ ہو جاتا ہے۔ تو اللہ تعالے اس کی برکت کو بھی وسیع کر دیتا ہے۔ جس پر پوری دنیا استفادہ کرتی ہے۔ گاہے انسانی گناہ خطرہ کی اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ بارشیں بند ہو جاتی ہیں یا بے تاثیر بارشوں کا نزول ہوتا ہے۔ یا بیماریاں بڑھ جاتی ہیں۔ نظام کائنات درہم برہم ہونے والا ہوتا ہے کہ ان نفوسِ قدسیہ کی بدولت بارشیں جاری ہو جاتی ہیں۔ وبائیں ختم کر دی جاتی ہیں اور نظام کائنات کو

بحال کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی برکت ہے۔ جس سے مادہ پرست اہل نفس بے خبر رہتے ہیں جس طرح جسم کو دل نظر نہیں آتا۔ حالانکہ وہ دل پر ہی زندہ ہے اور دل ہمیشہ معلوم ہو کر بھی مخفی ہی رہتا ہے اور اپنی مربیانہ خدمات انجام دیتا رہتا ہے۔ اور جسم کو جملہ حرکات بھی دل ہی سے ملتی ہیں۔ اور دل کی یہ عادت ہے کہ وہ جسم میں تادمِ آخر جاگتا رہتا ہے اور ایک لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں سوتا نیز جسم کو سلاتا، جگاتا، کھلاتا، پلاتا اور خوش رکھتا ہے۔ جب خوشی و غمی کے احساس کی ضرورت ہو۔ تو خوشی و غمی دونوں دیتا ہے اور جسم کی تمام تر خوشیوں کا دار و مدار دل پر موقوف ہے۔

مگر دل کبھی ایسی ریا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا کہ میں جسم کی آنکھوں کے سامنے آؤں اور یہ کہ میں بازار انسانیت میں سامنے آ کر اپنی عزت کراؤں۔ اس کی یہ عادت نہیں۔ چونکہ وہ شفیق ہے، اس کی شفقت بغیر ریا و نمود کے بے لوث ہوتی ہے۔

دل پہلی حرکت جسم سے لے کر آخری حرکت جسم تک اپنی استطاعت کے مطابق پوری خدمات انجام دیتا ہے۔ بوقتِ موت سارے اجزائے جسم کے بعد مرتا ہے۔

اسی طرح انسانی قوم ایک جسم ہے۔ اور اہل اللہ صالحین اس کا دل ہیں۔ جو ہمیشہ قوم میں مخفی رہ کر قوم کی زندگی بحال رکھتے ہیں۔ پروردگارِ عالمِ ہست و بود نے ایک ایسی حکومت قائم کر دی ہے۔ جن کی بدولت دنیا پر سورج طلوع ہوتا ہے۔ بارشیں برستی ہیں اور نظام کائنات چلتا ہے۔ ان کے غیر مرئی تاثرات بادشاہوں اور ان کی رعیتوں تک خیر و

برکت لاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ جن کی خاموشیاں جہانوں کے فیصلے کر لیتی ہیں۔ کائنات میں جتنے ردّو بدل ہوتے ہیں۔ وہ ان ہی کی دعاؤں کا نتیجہ ہوتا ہے۔

انسانی دنیا میں بظاہر مادی حکومتوں کا غلبہ و غلغلہ ہوتا ہے۔ مگر یہ مادی پرزے ہوتے ہیں۔ ان کا اقتدار مادہ پر قائم ہو کر مادہ پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ یہ نہ تو خود روحانی اطمینان پا سکتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو روحانی اطمینان دے سکتے ہیں۔ بلکہ امنِ انسانیت میں ان کا دباؤ، دہشت، غلبہ، خود سری، رعونت، تکبّر، جلالتِ مادی رخنہ انداز ہو جاتی ہے۔ طبائع خائف ہو کر زندگی کے لطف و کرم سے محروم ہو جاتی ہیں۔

بہر کیف اللہ کی مرضی ہے کہ کائنات انسانیہ میں ایک باطنی حکومت ہو جو اولیاء اللہ کے سپرد کی جائے۔ اور ایک ظاہری حکومت ہو جو اہلِ دنیا کے سپرد ہو۔ اسلام نے ان دونوں حکومتوں کی اصلاح کے لیے تقویٰ کو معیار تکرّم و تشرف قرار دے کر دونوں کو حدود تقویٰ میں پابند رہ کر خدمات انجام دینے کی تلقین فرمائی ہے۔ اگر اولیاء اللہ اپنی باطنی حکومت میں نیکی پر فخر کریں اور اپنے فرائض سے تغافل برتیں تو ان کو اپنے متصرفانہ عہدوں سے برطرف کر دیا جاتا ہے۔

مگر یہ گروہ تائبین کا گروہ ہے۔ اسی واسطے برطرف ہونے پر بھی انہیں عہدوں سے الگ ہونے کا غم نہیں ہوتا۔ بلکہ خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا غم ہوتا ہے اور توبہ کے ساتھ اپنی غلطی اور ظلم کی تلافی کرانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسّلام نے جنّت الفردوس سے نکلنے کے بعد توبہ کے ساتھ تلافیٔ مافات چاہی اور آخر کامیاب ہوئے۔

اس تلافی کے لیے آدم علیہ السلام کی وہ توبہ جو آپ نے دانہ گندم کھانے پر احساسِ ندامت پانے کے بعد اور اپنی غلطی کا احساس پیدا ہونے کے بعد کی تھی، وہ توبہ جذبہ متقیانہ تھا اور وہ معترفانہ دعا جو آپ نے رو رو کر بصورتِ توبہ ادا کی، قرآن مجید میں موجود ہے۔ وہ دعاو توبہ یہ ہے۔

ربنا ظلما انفسنا و ان لَم تغفِر لنا وَ ترحمنا لنکُونَنّ مِنَ الخسرِین۔

اے اللہ ہم نے اپنی جان پر ظلم کیا، اگر تو ہمیں اپنے فضل و کرم سے معاف نہیں کرے گا اور ہم پر رحم و کرم نہیں فرمائے گا تو یقیناً ہم خسارہ میں ہیں۔

چنانچہ ہر نبی کے زمانہ کے اہل اللہ نے اپنی غلطیوں پر اسی طرح توبہ کی اور تلافیٔ مافات چاہی اور کامیاب ہوئے۔ مگر وہ دنیا دار حکمران جو غرورِ نفس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور انانیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی حکمرانی کو اپنا اکتساب ذاتی جاننے لگتے ہیں اور خدا کو بھول جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو جب بھی اللہ تعالےٰ اقتدار سے محروم کر دیتا ہے۔ تو انہیں سخت خفّت، ندامت، غم و اندوہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کی اس خفّت و اندوہ کا زیادہ سے زیادہ تعلق نفسِ آمارہ سے متعلق ہوتا ہے۔ نفسانی عزت کے کھو جانے پر اور اس سے محروم ہونے کی بنا پر وہ کفِ افسوس ملتے ہیں۔ ان لوگوں کے محروم اقتدار ہونے پر لوگ بھی ان کو فراموش کر دیتے ہیں۔ بلکہ ان کی حالت پہلے سے بھی کہیں زیادہ ابتر اور پراگندہ ہو جاتی ہے۔

برخلاف اس کے اولیائے متصرفین کبھی کسی حالت میں بھی اپنے

اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتے۔ نیز لوگ ان سے ہر حال پیار کرتے ہیں۔

یہی اعتراف اور کسر نفسی جیسے خصائل ان کو خدا اور انسان کے سامنے معزز بنا دیتے ہیں۔ لوگ ان کی مٹیوں سے بھی اتنا پیار کرتے ہیں کہ شاید کوئی شاہی محلات سے بھی اتنا پیار نہ کرتا ہو۔

# پچیسواں باب

## مُرشدینِ کاملین
## اور
## ان کے تفویضات

اس مشہور گواہی کے ملنے پر مجھے عبادات پر ریاضت کا زیادہ جذبہ شوق ملا۔ میرے لیے ابا جان کے خرقہ خلافت کے بعد یہ دوسرا خرقہ خلافت تھا۔ اور خرقہ خلافت بھی سلسلہ قادریہ کی طرف سے تھا۔

میرے والد بزرگوار سلسلہ قادریہ کے علاوہ سلسلہ چشتیہ کے بھی اجازت یافتہ خلیفہ تھے۔ اس طریقہ سے مجھے حضرت عبدالرحمن صاحب کابلی رحمتہ اللہ علیہ سے خلافت لینے تک دو طریقوں سے خلافت میسر آئی۔

ابان جان نے مجھے خلافت قادریہ اور خلافت چشتیہ دونوں سے نوازا اور حضرت عبدالرحمن کابلی رحمتہ اللہ علیہ سے مجھے جو خلافت قادریہ ملی۔ یہ قادریہ خلافت دوسری بار تھی۔

حضرت والدِ بزرگوار نے بوقت اجازت مجھے لوگوں کو بیعت کرنے کی اجازت دی اور فرمایا تھا کہ بیعت سے مراد دین کی تبلیغ ہے اور تزکیہ نفوس کے سلسلوں کو جاری کرنا ہے۔ جو مرشد بوقت بیعت دین کو فراموش کرے وہ صاحبِ فیض نہیں ہو سکتا۔ اگر بیعت میں خود غرضی یا

تشہیر یا ریاو نمود غرض ہو تو یہ عادت سراسر جہل ہے، جس سے بجائے دین حاصل کرنے کے الٹی بدعات پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔

اس غلط دستور العمل کو کسی متقی ولی اللہ نے پسند نہیں کیا۔ بلکہ ایسے لوگوں کو دینِ اسلام اور طریقتِ اسلام کے لیے مضر قرار دیا۔ چونکہ ایسے افراد کے ذریعہ سادہ لوح عقیدت مند اپنی ذہنی صلاحیتیں کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ بے اصول فقر کے بے اصول ماحول و مشاہدات سے ذہنی تعیش کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور عقلِ جسمانی میں سمٹ کر قیدِ نفس میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ بعض دفعہ ان کا جسمانی عقل بے اصول محنت سے جذب ہو جاتا ہے اور وہ بھٹک جاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک مدّت کسی امید کے ساتھ وابستہ رکھتے ہیں۔ وہ امید تو پوری نہیں ہو پاتی مگر وہ ایسی لاابالیت کے عادی بن جاتے ہیں۔ ایک مدّت العمر تک ایسے طالبینِ تصوّف دین و دنیا کھو بیٹھتے ہیں۔ نہ ہی وہ متشرع ہو سکے، نہ صوفی بن سکے اور نہ ہی کاروبارِ دنیا حاصل کر سکے۔

جب وہ اپنے آپ کو چہار جانب سے بے بس و بے کس پاتے ہیں تو لامحالہ انہیں پھر وہی مایوسانہ طرزِ فقیرانہ اختیار کرنی پڑتی ہے۔ وہ اہل اللہ کے محض نقال بن جاتے ہیں اور اسی طریقہ پر انحصار کر لیتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ کوئی صاحبِ کمال نہیں۔ مگر پھر بھی اپنے آپ کو صاحبِ کمال ظاہر کرتے ہیں۔

فرمایا اس طرح غلط مرشد عنداللہ و عندالناس بڑے گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ خود صاحب اصول نہیں۔ مگر اپنے آپ کو صاحبِ اصول صوفی کہلاتا ہے۔ دوئم وہ اپنے آپ کو صاحب ارشاد کہلاتا

ہے۔ سوئم یہ کہ لوگوں کو دھوکا دیا جاتا ہے۔ چہارم یہ کہ لوگوں کی عادت کو صراطِ مستقیم سے ہٹا کر بدعات کا عادی بنایا جاتا ہے۔ پنجم یہ کہ بدعات کو رواج دیا جاتا ہے۔ ششم یہ کہ ایک تن آسان فرقہ بن جاتا ہے جو دور دراز تک پھیل کر بدعات کو ایسے مذموم انداز سے فروغ دیتا ہے جو سفیہوں کو سراسر تن آسان بنا کر انہیں دینی و دنیوی محنت سے الگ کر لیتا ہے۔

ایسا نام نہاد مرشد اس قسم کی لاتعداد برائیوں کا ذمہ دار ہے۔ فرمایا شاید سادہ لوح عقیدت مند معاف کر دیئے جائیں چونکہ انہوں نے بربنائے عقیدت یہ فریب کھایا ہے۔ وہ مرشد کو ولی اللہ سمجھ کر اس کے پاس آتے ہیں۔ ان کے نزدیک ولی اللہ وہی ہوتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہو۔ ان کا اعتقاد ہے کہ ایسے متقی ولی اللہ اگر دعا کریں تو اللہ بخشش فرماتے ہیں اور مرادیں پوری ہوتی ہیں مگر جب وہ بجائے ہدایت کے گمراہی پائیں۔ اور بجائے دعائے خیر کے بداخلاق ہو جائیں تو یقیناً یہ سب جُرم اس مصنوعی مرشد پر عائد ہو گا۔ جس نے اپنے فقر کی بنیاد دینِ اسلام کے خلاف رکھی۔ وہی ان تمام بدعات کا بانی مبانی ہے۔ اس نے بدعات کی بنیاد ڈالی اور یہ کہ ہر بدعت قبیحہ کا راستہ شرک سے جا ملتا ہے۔ انجام کار ایسے لوگ شرک و بدعت کا شکار ہو کر محض نفاق پسند رسمی قسم کے مسلمان رہ جاتے ہیں۔

فرمایا بیٹا! تمہیں خلافت تو دے دی گئی ہے۔ اب مجھے اندیشہ ہے کہ تم کہیں انانیت نفسی کا شکار نہ ہو جاؤ۔ یاد رکھو بندگانِ خدا نے ہمیشہ عاجزی کو پسند فرمایا۔ عاجزی مردِ فقیر کی وہ ڈھال ہے جس سے وہ تمام نفسانی، شیطانی اور دنیوی مہلکات کا دفاع کرتا ہے۔

فرمایا! وہ فقیر جو کشف و کرامات پر فخر کرے۔ یا وہ عالمِ دین جو

فضیلتِ علوم دینیہ کی کرامت پر فخر کرے اور لوگوں کو اپنے سے کمتر جانے، وہ متکبر ہے۔ ایسے متکبرین کبھی ولی اللہ نہیں ہو سکتے۔ فرمایا ولی اللہ کی بڑی تعریف یہ ہے کہ اسے سارے جہان کی نعمتیں بھی مل جائیں، تو وہ ان کو اپنا ذاتی اکتساب نہیں سمجھتا اور ہر حال پر راضی رہ کر خدا کی رحمت و بخشش چاہتا ہے۔

بیٹا! عاجزی کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لو۔ اس طرح تم اپنے خدا کو رضی رکھ سکو گے۔ ورنہ دعووں سے کام نہیں چلتا۔ خدا دعائیں تو سب مخلوقات کی سنتا ہے۔ اس لیے کہ ساری مخلوقات اس کی رعیّت ہے۔ وہ ان سب کا مربی ہے۔ یہ اس کی اپنی ذاتی ذمہ داری ہے۔ جس میں کوئی دوسرا دخیل نہیں ہو سکتا۔ مگر اپنے ولیوں کی دعاؤں کو دوسروں کی نسبت زیادہ قبول کرتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے۔ ان کی دعائیں محبّت سے قبول ہوتی ہے۔ اگر کوئی دعا بظاہر نہ قبول ہو۔ تو بھی اس میں بھلائی ہوتی ہے۔ شریعت طریقت کی بانی ہے۔ جس کے ذریعہ رُہبانیت، سادھویّت اور کاہنیّت اور ملنگیّت کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔

فلہذا اس خرقہ کو پہننے کے بعد شریعت کی پابندی کرو۔ طریقت کو ہمہ وقت شریعت کے پیمانہ میں تولو۔ کہیں ذرہ برابر بھی نقص آئے تو فوراً توبہ کرو اور ایسے حال سے اجتناب کرو۔ لوگوں کو نصیحت کرو۔ تمہارا کام نصیحت کرنا ہے۔ ہدایت دینا خدا کا کام ہے۔ تم لوگوں کو نیک دعائیں دو۔ جو دعائیں صدق و صفا سے کی جائیں۔ وہ اپنے لیے بھی مقبول ہوتی ہیں اور دوسروں کے لیے بھی اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا۔ کہ اپنی اولاد میں سے جس کو اہل پاؤ، اس کو یہ

جُبّہ عنایت کرنا مگر یاد رکھنا کہ تفویض کے وقت اعلان نہ کرنا۔ فرمایا یہ جُبّہ سلسلۂ قادریہ کی طرف سے ہے۔ مگر تمہیں اور بھی مردانِ خدا راہ سلوک میں ملیں گے۔ جن سے تمہیں مزید فیض حاصل ہو گا۔ ان کا ادب و احترام کرنا۔ ان کے احکامات کی تعمیل میں تاخیر نہ کرنا۔ حضرت فقیر اللہ صاحب بکوٹی رحمتہ اللہ علیہ کی پیشنگوئی کے مطابق تمہیں دشت و جبل میں دورانِ ریاضت کسی مردِ خدا سے ایک خاص فیض بھی ملے گا جس سے تمہارے علم دین میں اضافہ ہو گا۔ اس پشینگوئی پر یقین رکھنا۔ آگے جو کچھ اللہ کو منظور ہو گا، وہی ہو گا۔ نیز حضرت مخدوم علی شاہ صاحب سوہاوی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اس بارے میں پیشنگوئی فرمائی ہے اور میرا گمان بھی یہی ہے، کہ اللہ تعالےٰ کا فضل و کرم تمہارے شاملِ حال رہے گا اور ایسے مردانِ خدا تمہیں وقتاً فوقتاً ملتے رہیں گے۔

فرمایا مجھے یہ ہوس نہیں کہ تم بہت بڑے عالم دین بنو۔ بلکہ میں اس پر حریص ہوں کہ تمہارے نصیب میں جتنا علم آئے، اس پر امکانی کوشش سے عمل کر سکو۔ عالمِ با عمل کا بڑا مقام ہے۔

فرمایا۔ متقی کے لیے علم دین حلال و حرام کے امتیاز کے لیے ہوتا ہے اور بغیر امتیاز حلال و حرام کے کوئی مومن تقویٰ میں کمال تقویٰ کے لیے ارکانِ طہارت، ارکانِ عبادات، ارکانِ معاملات، ارکانِ معاشرت اور ارکانِ اخلاق کے علوم و آداب سے باخبر ہونا ضروری ہے۔ یہ وہ آداب ہیں جو حلال کو حلال جان کر استعمال میں لانے اور حرام کو حرام جان کر اس سے اجتناب کرنے سے میسر آتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ علم دین کے ذریعہ حلال و حرام کے متعلق معلومات حاصل کرنے تک ہی اکتفا کیا جائے

تاکہ نخوت و غرور عملی کا اندیشہ و احتمال کم ہو۔

اور اگر متقیانہ فہم و فراست مل جائے اور اللہ کی بندگی عجزوانکسار کے ساتھ ادا کرنے پر توفیق مل جائے۔ تو مزید علوم دینیہ صرف و نحو، منطق و معقول تک اور اس سے آگے علم فقہ تک مزید علومِ دینیہ کی طرف رجوع کیا جائے تو نور علی نُور۔

اللہ کے بندوں کے لیے ایزاد علم فروغِ بندگی کا ذریعہ بن جاتا ہے، جس سے تقویٰ میں عروج ملتا ہے۔ بغیر تقویٰ کے علم باعث عُجب ہو کر متکبر بنا سکتا ہے۔ جو مہلک ہے۔ جس سے قلب و نظر پر بجائے لطافت کے تیرگی و شقاوت آجاتی ہے۔

ایسی حالت میں طبیعت متقیانہ فضیلت عملیہ دینیہ پر مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح کا علم غرور نفسی کا شکار ہو کر محرومِ رحمت ہو جاتا ہے اور دوسری طرف وہ وسائل سلوک پر اپنے شبہات کی بنا پر استمداد وسائل سے محروم ہو کر عملاً صراط مستقیم کی جانب رجعت نہیں کر سکتا۔ نہ تو وہ خوشنودیٔ رب حاصل کر سکا اور نہ رجعت کے لیے راجعین کو پا سکا۔ اس واسطے علم محض جو برائے تشہیرِ نفسی حاصل کیا جائے۔ وہ غیر مفید ہے اور علم کو بر سبیلِ تقویٰ وصولِ الی اللہ کے لیے حاصل کیا جائے تو وہ ہر گامِ زندگی پر یار و مددگار اور رفیقِ منزل ہو جاتا ہے۔

فرمایا! علم چراغِ راہ ہو سکتا ہے مگر منزل مقصود نہیں ہو سکتا۔ عالم بے عمل چراغِ راہ کو مقصود قرار دے کر صراطِ مستقیم سے ہٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ رجعت الی الحق نہ کر سکے تو بے مراد ہے۔ وہ اپنے نصب العین سے دور تر ہو کر بے یقین ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی علم کو حجابِ اکبر کہا

گیا ہے۔ جس نے بجائے بندۂ خدا بنانے کے بندۂ نفس بنا دیا ہو اور نفس وسواسِ شیطانی کو جلد قبول کر لیتا ہے۔

جب زمامِ نفس شیطان کے ہاتھ آجائے تو وجود پر شیطان اپنا تسلط جما لیتا ہے اور قلب و نظر کو اپنے تصرف میں لے لیتا ہے۔ جب علم و عقل ہدف شیطان ہو جائیں تو لامحالہ طبیعت بھی مائل بشیطنت ہو جاتی ہے۔ جو علم وسوسہ بن جائے۔ اسی پر حجابِ اکبر کا اطلاق ہوتا ہے ورنہ علم دین بنفسہٖ نور ہے۔

فرمایا! علم کے لیے ظرفِ نیک کی ضرورت ہے اور وہ ایمان ہے۔ ایمانی علم علوم کو اور علوم اسلامیہ ایمان کو تقویت دیتے ہیں۔ فرمایا اسی واسطے قبل از علوم اور بعد از علوم مرشدینِ صالحین کی نگرانی میں رہنا علومِ دینیہ کے لیے ضروری لوازمات میں سے ہے۔ بہر کیف علم دین کا مقصد بربنائے تقویٰ وصولِ الی اللہ ہے۔ ورنہ علم بے معنی ہو جاتا ہے۔

فرمایا اہل سلوک کی ایک ایسی منزل ہے جس پر پہنچ کر وہ علم کو طلاق دے دیتے ہیں۔ وہ صرف تعیناتِ عبادات و معاملات کے حقوق کی رعایتوں کو ذہن نشین کرنے کے بعد جملہ فلسفیانہ موشگافیوں سے نجات پا لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا۔ کہ ایسی طلاق سے علم کی طلاق ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ زائدہ علم کی موجودگی میں ذہن پر بے ہنگم افکار کا زائد دباؤ نہ پڑے اس طرح وہ اپنے فکری دباؤ سے ایک طرف ہٹ کر صرف حلال و حرام کے معلومات تک ہی اپنے آپ کو محدود کر لیتے ہیں تاکہ دلجمعی سے وہ بجا آوریِ احکاماتِ الٰہیہ کر سکیں اور یکسوئی کے ساتھ توجہ الی اللہ میں استغراق و محویت پا سکیں۔ اسلام میں توجہ الی اللہ حدود اللہ

کی پابند ہیں اور حدود اللہ میں اعمال کی تقسیم کر دی گئی ہے۔

مگر یہ عوامل منقسمہ تواتر کے ساتھ سبیل بندگی میں یکے بعد دیگرے بندۂ راہ کو قرینہ بہ قرینہ ملتے رہتے ہیں۔ ایمان بالغیب پہلا قرینہ ہے۔ اس کے بعد طہارت بدنیہ دوسرا، پھر نمازِ پنجگانہ تیسرا قرینہ ہے۔ یہ بندگی کے بنیادی قرینے ہیں۔ جن کی جڑ کلمہ توحید و رسالت ہے۔ اس کے بعد تقسیم معاملات چوتھا، پھر معاشرت اسلامیہ پانچواں، اور اخلاق اسلامیہ چھٹا قرینہ بن کر منزل بمنزل یوماً فیوماً ہفتوں، مہینوں، سالوں اور عمر بھر راہ بندگی میں بندۂ خدا کو یہ قرینے مل کر اس کے عمل کو عروج دیتے ہیں۔ یہ مجوزہ قرینے بندگی کی وہ لازوال کڑیاں ہیں جو حد قیامت تک ملی ہوئی ہیں۔ جن پر حیات جاوداں مرتب ہوتی ہے۔

جنت کی یہی کڑیاں خلود دوام کی دائمی راحت کا ذریعہ بنتی ہیں۔ گویا بندۂ خدا احکامات کی منزل بمنزل ملنے والی کڑیوں کی صوابدید کے ساتھ اپنی بندگی کو ترتیب دیتا ہے۔ بندۂ حق کی منزل بے عمل نہیں۔ اس کے اعمال عقل و دانش کی اختراعات نہیں ہوتے بلکہ خالقِ مطلق کے متعینہ اعمال پر وہ منزل پر قدم رکھتا ہے جس بندۂ حق کا مقصود حق ہو۔ اس کے اعمال بھی حق ہوں گے اور وہ صحیح راہ پر متلاشیٔ حق ہو گا تو یقیناً اس کی یہ حالت حق ہو گی۔ ایسا عالم سالک ہو گا۔ اس کا علم دین وصولِ الی اللہ کے لیے ہو گا اور سلوک سے مراد اللہ کو پانے کی راہ ہے۔ اللہ کو پانے کی راہ دینِ حق اور رسولِ آخرالزمان کی برحق اطاعت اور ہادین مرشدِ شریعت و طریقت ہیں۔

ایسے لوگوں کا علم بھی ان کے لیے سود مند ہو جاتا ہے، جس بندۂ

حق کا علم ایسا ہو وہ ہر طرح اور ہر حال ترجمانِ حق ہوگا اور اس کی حقانیت بندگی کی گواہی اس کی اپنی صداقت دینیہ ہوگی۔ وہ اپنے قادرِ مطلق کا حق پرست بندہ ہو کر اپنے قادرِ مطلق کو اپنا گواہ بنا لیتا ہے اور جو ایسا ہو جائے۔ وہ اللہ کی صحیح پناہ میں آ جاتا ہے۔ اسے کوئی خارجی قوت گزند نہیں پہنچا سکتی۔ فرمایا۔

قل ان صلوتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین۔

کی روشنی میں بندۂ حق کی ہر ادائے زندگی صرف اللہ تعالے کے لیے مخصوص ہو جاتی ہے اور وہ بندگی کی ایک واضح صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی زندگی اور موت سب اپنے مالک و مختار حقیقی کے لیے ہوتے ہیں۔ بس وہ صرف مسافر راہ حقیقت بن جاتا ہے۔ جو عملاً حقیقت بندگی کا مظہر ہوتا ہے۔ جس سے حقیقت حقہ آشکار ہوتی ہے۔ وہ حقیقت پسند ہو کر حقیقت کا علمبردار ہو جاتا ہے۔ وہ جہاں اپنے لیے طلبگارِ ہدایت ہوتا ہے وہاں دوسروں کے لیے بھی موجبِ رشد و ہدایت ہو جاتا ہے۔ جس کی پابندِ اصول ریاضتیں لوگوں کے دلوں کو نورِ ہدایت دیتی ہیں۔

اس کے بعد والد بزرگوار نے مجھے خرقۂ خلافت دینے کے بعد پند و نصائح فرمائے اور دعائے خیر فرمائی۔ مجھے ریاضت کے اسلامی اصول بتائے۔ آپ نے دم واپسیں تک مجھے گاہے گاہے مزید تفویضات سے بھی نوازا۔ راہِ سلوک پر چلنے اور منزلِ مقصود کو پانے کے لیے مجھے باعمل رختِ سفر دیا۔ نصابِ سلوک کی تکمیل کے لیے میرے بنیادی اصول درست کرائے اور مجھے راہِ حق پر چلنے کی ترغیب و تحریص دی۔

آپ کی بزرگانہ شفقتیں میرے لیے ناقابلِ فراموش ہیں۔ فی الحقیقت میرے والدین نے راہ بندگی میں میرے ساتھ حقِ مرشدانہ ادا کیا۔ جو ایک ذمہ دار مرشد کے فرائض میں داخل ہے۔ میرے اللہ نے مجھ پر کتنا احسان فرمایا کہ اس نے مجھ ناچیز کو ایسے کریم النفس اور عاجزانہ طبع کے والدین عطا فرمائے۔ جو بحرِ علم و عرفان کے خواص ہونے کی بنا پر بھی لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہے۔ اور بظاہر تبلیغ دین کے فرائض بھی انجام دیے۔ اور مجھ عاجز و نادار کو اپنی عنایات سے نواز کر عاجزی کی راہ پر چلایا اور مجھ پر عاجزانہ بندگی کا راز کھول دیا۔

یہاں تک کہ میں عاجزانہ زندگی اختیار کرنے پر دل و جان سے تیار ہو گیا اور عاجزانہ زندگی سے میری روح اتنی مانوس ہو گئی۔ کہ وہ میری عزیز جان بن گئی۔ اور میں عاجز بندہ بالعجز مقام بندگی سے روشناس ہو کر صراطِ بندگی پر آنے کے لیے آمادہ ہو گیا اور خدائے برتر کی برتری کے سامنے اپنے ظاہر و باطن سے سجدہ ریز ہونے پر واقعتاً میں نے اپنے آپ کو عاجز پایا۔ اور سب مخلوق صورۃً اور معناً مجھے اللہ کے سامنے عاجز ہی نظر آنے لگی۔ اس رضا جوئی میں اللہ تعالےٰ کے خاص فضل و کرم سے مجھے والدین کی سالکانہ عاطفت میں ہی ریاضت شروع کرنے کا موقع مل گیا اور میں نے مجوزہ ریاضت شروع کر دی۔

# چھبیسواں باب

## سالکِ منزل
## اور
## وادیٔ سلوک

مبادیات ریاضت کے دوران میری کچھ موہوم فکریں جو میری لطافتِ قلبی کے سامنے حائل تھیں اور سینے میں کھٹکتی تھیں۔ اس بااصول آغاز ریاضت کے ساتھ یقین و ایمان میں تبدیل ہو کر میری رفیق منزل ہو گئیں۔

یہ اسلامی تقویٰ کی پہلی کرن تھی جس نے مجھے اپنا باایمان منقاد بنایا۔ میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ گویا اسلامی تعلیمات کے تابع عملِ صالح وہ نورانی چراغ ہے، جو تیرہ و تار کمرے میں جلا دیا جائے جس سے کمرے کی تاریکیاں معدوم ہو جائیں اور کمرہ منور ہو کر اپنے داخلی حیثیات کے ساتھ آنکھوں کے سامنے روشن ہو جائے اور ناظر پر اس کا کوئی گوشہ مخفی نہ رہے اور وہ روشنی تعارف وصناحت کی ترجمان ہو۔

ایسے ہی میری مبادیات ایمانی نے میرے جسم و جان کے اندرونی گھر میں نور ایقان کا چراغ روشن کر دیا۔

جس نور کی روشنی میں نفس کا داخلی تعارف ہوا اور مجھ عاجز پر خدا کی ذات و صفات کی باریکیاں واضح ہوئیں۔ اس وصناحتِ عرفِ نفس نے مجھ پر

محبت کی پہلی ضرب کاری لگائی۔ جس نے مجھے بالمحبت راہِ سلوک پر چلنے کا جذبہ عطا فرمایا۔

یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تھا ورنہ میں غریب کون ہوتا ہوں، جو اس پاک وادیٔ ریاضت میں قدم رکھ سکتا ہے۔ نفس سے من حیث الاشتراک روح و جسم دونوں مراد ہیں۔ پہلا تعارف بالایمان قلب کی روحانی تجلیات پر ہوتا ہے اور تزکیہ نفس سے قبل یہ نورانیت اقرار و تصدیق کی صورت میں بلاتزکیہ حجابات نفس میں محجوب رہتی ہے۔ اسلامی طریقِ تقویٰ پر ایمانی اقرار و تصدیق تزکیۂ نفس کی ریاضتوں کے ساتھ حجاباتِ نفس سے آزاد کرانے میں سالکِ راہ کے لیے ممد ہوتے ہیں۔

حجاباتِ نفس سے جس طرح فکریں لاشعور کے حجاب سے صفحۂ شعور پر اتر اتر کر ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ اور شعور ان کا ادراک کر لیتا ہے۔ یہ فکریں باطن کے خیالی دباؤ سے شعور میں واقع ہوتی ہیں۔ شعور یا لاشعور دونوں جذبۂ باطن کے تابع ہوتے ہیں۔ اس قسم کا ہر دباؤ باطن کی ایمان افروز فکری محنت ہوتی ہے۔ ہر لحہ یہ دباؤ جذبہ باطن کی فکری محنت پر ترقی پاتا ہے۔ اور ہر لحہ یہ دباؤ جاری رہتا ہے۔ یہ دباؤ جذبات کے تابع ہوگا۔ اسی نوعیت کے خیالات اور افکار شعور پر مرتب ہوں گے۔

جس طرح کسی رس بھرے پھل پھول کو دباؤ ڈالنے پر اس سے عرق ریزی ہونی شروع ہو جاتی ہے اور ان کے عرق کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ بعینہ لاشعور پر جذبات باطن کا نظریاتی فکری دباؤ حسبِ منشا اپنے ارادی مافی الضمیر افکار کو کسی فیصلہ طلب مقصد کے لیے شعور تک بھیج دیتا ہے۔ جذباتِ باطن شعور کے ذریعہ ہی اپنے ماحصل کو وصول کر سکتے ہیں۔

اور شعور کا کام جذباتِ باطن کے مطابق انتخابِ خیال اور اس کا ادراک ہوتا ہے۔ پھر جن نوعیات کے خیالات کا ادراک ہو گا۔ ان کو ان کی حسب حیثیت معلومہ راہوں پر ڈال دینا شعور کا کام ہے۔ اس کے بعد قوائے حواسیس کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ کہ وہ شعور کے ادراک شدہ جذباتِ باطن کو وصول کریں۔

اگر وہ جذبہ قوت باصرہ کے لیے ہے تو اسے سبیلِ باصرہ وصول کرے گی۔ اگر سامعہ کے لیے ہے، تو قوت سامع وصول کرے گی۔ اگر شامہ کے لیے ہے تو سبیل شامہ وصول کرے گی۔ اگر بو لنے یا ذائقہ کے لیے ہے تو سبیلِ زبان وصول کرے گی اور اگر احساس لامسہ کے لیے ہے تو سبیل لامسہ وصول کرے گی۔

یہ سارا تردّد جذبات باطنیہ کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اگرچہ بغیر تزکیہ نفس کے یہ باطنی افکار و تخیّلات و تصورات نورانیت نہیں پا سکتے۔ تاہم غیر مرئی طور پر انسانی وجود میں بنفسہ نکرم ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح باطن سے میدانِ عقل و شعور پر چل کر براستہ عقل و شعور پر آجاتے ہیں اور ادراک کیے جا سکتے ہیں۔ اس طرح انسان کا باطن بہر نوع غیر مرئی عالم مدرکات کا مقام پالیتا ہے بلکہ سالکین راہ حقیقت کے نزدیک ماضی، حال و مستقبل اور عالم خارج کے جملہ خصوصیات داخلیہ اور خارجیہ کا محورِ کبریٰ انسان کا خود اپنا رجحان باطن ہوتا ہے۔

تمام چھوٹے بڑے جذباتِ انسانیہ مطلعِ باطن سے طلوع ہو کر سب سے پہلے انفس کو منور کرتے ہیں۔ اس کے بعد اسی نورانیت سے جسم و جانِ انسانی کی صلاحیتیں انگڑائی لے کر بیدار ہوتی ہیں۔ جس طرح مطلع

تاباں سے آفتابِ عالمتاب کے طلوع ہونے پر سب ذی جان مخلوقات انگڑائی لے کر جاگ اُٹھتی ہے۔ سوائے چمگادڑ اور اُلو کے کہ یہ رات ہی کو انگڑائی لے کر جاگتے ہیں۔

چمگادڑ اور اُلو سے صوفیائے سالکین نے حقائق پر وہم بد رکھنے والے لوگ مراد لیے ہیں۔ جو نہ تو بازار شعور کے مکین ہیں۔ اور نہ لاشعور کے۔ یہ نفس کے دبیز پردوں میں فلک عقل و دانش کے اجرام افکار کی روشنی میں، نفس کی تاریکیوں میں پروردۂ نفس آنکھیں کھولتے ہیں اور جلبِ منفعت کی راہیں ڈھونڈتے ہیں۔ جس طرح چمگادڑ اور الو اجرام فلکی کی چمک کے ساتھ آنکھ کھولتے اور روشنی پاتے ہیں۔ اور اپنی محدود پرواز جاری رکھ کر شبِ تیرہ و تار میں تلاشِ معاش کرتے ہیں۔ اسی طرح دینِ فطرت کے بد عقیدہ لوگ ہیں۔ جو نفس کے دبیز پردوں میں افکار انسانی سے استفادہ کرتے ہیں۔

مگر نورِ ایمان کے مطلعُ الانوار کے نورِ تاباں سے اپنے باطن کے جہانِ نور میں اقامت اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔ چمگادڑ یا اُلو حیوانِ مطلق ہیں۔ بس وہ فعلِ خلقی کے تابع ہیں جو اپنی جبلت تبدیل نہیں کر سکتے۔ مگر انسان وہم بد کا شکار ہونے کے بعد نفس کے تیرہ و تار جہانوں میں افکار کی روشنی میں ایک مدتِ مدید رہنے کے بعد بھی جہان باطنیہ میں نورانیت صالحہ حاصل کر کے صاحب ایمان ہو سکتا ہے۔ اسی پر امید فکری نوعیت کے اعتبار پر غیر مسلمین کو دعوتِ حق دینے کی تعلیم دی گئی ہے۔

سالکین کے نزدیک تزکیۂ نفس کے ساتھ نورِ ایمان حجابِ باطن

سے نکھر کر بصیرت کے سامنے آجاتا ہے جس سے عارف باللہ نفسِ باطن کا تعارف حاصل کر لیتا ہے۔ اور مَن عَرف نفسہ فقد عرف ربہ کا مصداق ہو کر عرفِ نفسی کے ساتھ عرفِ ربانی حاصل کر لیتا ہے۔ جس طرح فکریں سبیلِ شعور پر آکر گوشۂ وجود پر اپنے انوار ظاہر کرتی ہیں۔ اسی طرح تزکیۂ نفس سے بصیرت پر نورِ عرفان اُترتا ہے۔ میں نے ریاضت کا ابتدائی آغاز طریقہ سلسلۂ قادریہ پر شروع کیا۔ جس میں مجھے یہ تعلیم دی گئی تھی کہ سلسلۂ قادریہ ہر خارجی تاثرات کی بے گانگی کے ساتھ نظریۂ توحید پر یقین کامل حاصل کرنے کے لیے کلمۂ توحید کو نقطۂ آغاز سلوک اور انتہائے سلوک قرار دے کر ریاضت کی بنائے اوّل ڈالتا ہے۔ اور جب اس پیرائے سے مبتدی آغاز کرے تو اسے سوموار کی صبح سے باطہارت کاملہ الگ تھلگ مگر پاک و صاف جگہ پر نہایت عاجزانہ انداز میں دو رکعت نماز نفل بندگی ادا کرکے دوزانو رو بقبلہ اس طرح اپنی توجہ اللہ تعالےٰ کی طرف مرکوز کر لینی چاہیے کہ گویا وہ ہر ماسوااللہ سے کٹ کر بالکل ایک منفرد عاجز کی طرح بے دست و پا اور تہی دامن غریب و مسکین بن کر اور اللہ تعالےٰ کا فقیر بن کر اللہ کے درِ نیاز پر گدائے عبودیت مانگنے کے لیے نیاز مند بن کر آیا ہے۔ بس اس نیت کاملہ کے ساتھ وہ ننانوے مرتبہ پوری اُعوذ پڑھے۔ اور اس کے ترجمہ پر غور رکھے۔ پھر تسمیہ یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ننانوے مرتبہ اس کے معانی پر غور کرتے ہوئے پڑھے۔ پھر ننانوے مرتبہ درود شریف پڑھے۔ اس کے بعد ننانوے مرتبہ پورا کلمۂ طیّبہ پڑھے۔ پھر ننانوے مرتبہ کلمۂ شہادت۔ اسی طرح کلمۂ تمجید، پھر کلمۂ توحید، پھر کلمۂ استغفار، پھر کلمۂ ردِ کفر۔ پھر ننانویں ننانویں بار ایمان مفصّل اور ایمان

مجمل پڑھے۔ پھر لوٹ کر کلمہ طیبہ پر آئے اور اسے ننانوے مرتبہ پڑھے۔ اور کلمہ شہادت کا بھی دوبارہ ننانوے مرتبہ تکرار کرے اور کلمہ تمجید کو بھی ننانوے بار دہرائے۔

اس کے بعد فرمایا۔

سبحان ذی الملک و الملکوت۔ سبحانَ ذی العزةِ و العظمتہ وَالھیبتہ و القدرةَ وَ الکمال وا لجلال وَالجمال و الکبریاء والجبروت۔ سبحان الملک الحی الّذی لا ینام و لایموت سبوح قدوس ربنا و رب الملٰئِکتہ والروح ننانویں مرتبہ پڑھے۔

پھر یا حی یاقیوم بحق لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظلمین ننانویں مرتبہ پڑھے۔

اور اس کے بعد ننانوے مرتبہ درود شریف پڑھ کر دو رکعت نماز نفل بندگی ادا کرے اور یا حلیم یا خبیرُ کا ورد کے ساتھ کچھ وقت کے لیے مراقبہ کرے۔

حالت مراقبہ میں وہ اپنے دل پر نظر رکھے۔ اور اپنے دل پر بصیرتِ عارفانہ کے ساتھ غور کرے۔ کیا وہ اپنے دل میں اللہ تعالےٰ پر کامل یقین رکھتا ہے۔ اگر دل کو ایمان پر صاحبِ استقامت پائے تو زبان سے بالجھر اَلحمد اللہ پڑھے۔ پھر اپنے سارے وجود پر غور کرے۔ اپنی پیدائش سے لے کر حال تک وہ کیا کرتا رہا۔ اور اب اس ریاضت کے دوران کس حالت میں ہے۔ ایسی حالت میں اپنے وجود کو سیاہ دیکھنے کی کوشش کرے۔

اس خیال پر کہ وجود پر تقصیر ہے۔ اس نے نفس و شیطان کے

وسوسوں سے مغلوب ہو کر بڑی بڑی خطائیں کیں۔ بڑی کوتاہیوں کا شکار ہوا اور اپنے پالنے والے سے غافل ہوا۔ اور غیر کی طرف متوجہ رہا۔ یہ اعتراف پوری دلجمعی کے ساتھ کرتے ہوئے بالجہر اَستغفِرُ اللہ العظیم واَتوبُ الیہ پڑھے۔

پھر عالم انفس اور عالم آفاق کے متعلق عالم خلق ہونے کا پورا تصور کرے۔ اور یقین کرے کہ یہ بات سچ ہے کہ انفس و آفاق دونوں اللہ کی مخلوق ہیں۔ اور ان میں سے کوئی ایسی چیز نہیں جو باقی باللہ نہ ہو۔ سب چیزیں اللہ ہی کے حکم سے وجود میں آئیں۔ اور اسی کے فضل و کرم کے نور سے مشہود ہوئیں اور اس کی تربیت سے پرورش پا کر نمود پانے والی ہوئی۔

اس تصور کے بعد بلند آواز سے الحمدللہ رب العلمین پڑھے۔ پھر یا حلیم یا لطیف پڑھتے ہوئے بغرض قیلولہ نیت قیلولہ کرتے ہوئے سو جائے۔ نماز ظہر تک آرام کرے۔ آدھ گھنٹہ قبل از نماز بیدار ہو کر طہارت کاملہ کا اہتمام کرے اور نماز کی تیاری کرے۔ اگر مسجد میں ہو تو نماز باجماعت ادا کرے اور اگر مسجد کے قریب ہو، تو بھی حتی المقدور باجماعت نماز ادا کرے۔ اگر ایسا نہیں تو خود کسی کو شریک نماز کرنے کے لیے آذان دے۔ اگر نمازی مل جائیں تو خود امامت کرے اور نماز باجماعت ادا کرے۔ اگر کوئی بھی نہ ملے تو فرداً نماز ادا کرے۔

جس دن مبتدی نے اس ریاضت کی نیت کی۔ اس دن سے لے کر تا زندگی کمال اہتمام اور خشوع و خضوع کے ساتھ نمازیں ادا کرنے کی نیت کرے۔ بڑے خوف و رجا کے ساتھ اور دانشِ ایمانی سے کام لیتا ہوا فرض

نمازیں ادا کرے کیونکہ باقی تمام نمازیں اپنے اوقات کے ساتھ فرض ہیں۔ اور فرض نمازوں کا درجہ تمام نمازوں سے بلند ہے۔ اس کے بعد سنتوں کا درجہ ہے اور یہ غور کرے کہ پنجگانہ نماز بنائے خمسہ میں سے ایک بنیاد ہے اور عبادات میں یہ وہ بنائے اوّل ہے، جو بعد از ایمان ہے، جس کے بغیر کوئی عمل، چاہے کتنی ہی ریاضت کے ساتھ کیوں نہ ادا کیا جائے، نامقبول و نامنظور ہے۔

صوفیائے صالین کے نزدیک باقی ریاضتیں تزکیۂ نفس کی صورت میں یا اذکار و اوراد کی صورت میں سب کی سب درستیٔ نماز کے لیے ہیں۔ جب نماز درست ہو جائے تو باقی ریاضتیں تابع نماز ہو کر از خود صحیح ہو جاتی ہیں۔ اور اگر نماز ہی غلط ہو جائے تو صد ہا سال کی ریاضتیں خاک کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔ جو اللہ کے نزدیک نامقبول ہیں۔

بس کلمۂ طیبہ کے بعد صوم و زکوۃ ہو یا حج یا جتنے باقی ماندہ فرائض یا سنتیں یا نفل یا ذکر یا اوراد یا چلّے وغیرہ سب کے سب تکمیلِ نماز کے لیے ہیں۔

قرآن مجید اور احادیث نبویہ کی روشنی میں سالکین راہِ حقیقت نے ھدًی لِلمتقینَ سے اہلِ خشیت نمازی مراد لیے ہیں، جنہوں نے نبی آخرالزمان علیہ الصلوۃ والسّلام کے توسط اور کتاب و سنت کے ذریعہ ایمان باللہ و ایمان بالرسول و ایمان بالآخرت پایا۔

یہ کتاب مقدس یعنی قرآن مجید ایسے ہی اتقیا کے لیے ہدایت ہے، جو بر بنائے ایمان بالغیب اللہ تعالےٰ سے ڈرنے والے اور منہیات سے پرہیز کرنے والے ہیں۔ یہ اسلام میں سب سے بڑی معتمد جماعت کے

لوگ ہیں جو کتاب و سنت کی روشنی میں بطرزِ صحیحہ اور براہ راست علیٰ منہاج نبوت حِزبُ اللہ ہیں۔ حِزبُ اللہ ہونے کی شرعی شرائط اس گروہ میں موجود ہوتی ہیں یہ جماعت ایمان باللہ کے بعد نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ نماز کی پابند ہوتی ہے۔ اور غلبۂ خشیت ربانی کی بنا پر قرآن مجید سے مکمل استفادہ کرتی ہے۔ اس پابندی احکامات کی بنا پر حِزبُ اللہ کے متعلق بشارت ہے۔ یعنی اللہ والی جماعت ہی تمام جماعتوں پر غالب رہے گی۔

چنانچہ ارشاد ہے الاانّ حزبَ الله هم الغلبونَ خبردار مطلع رہو کہ اللہ تعالےٰ کی جماعت ہی سب جماعتوں پر غالب ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اپنی اس مخصوص جماعت کو مخصوص اندازِ عمل کی بنا پر تمام اسلامی شعبوں پر بوجہ تقویٰ برتری بخش دی ہے۔ یہی حِزبُ اللہ صحیح معنوں میں اولیا اللہ کی جماعت ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ کسی جبّہ و دستار یا کسی مسند و سجادہ و دلق کے ساتھ ہی اظہار برتری کریں۔ بلکہ اس جماعت کے لوگ ہر شعبۂ زندگی پر مامور کر دیئے گئے ہیں۔ کوئی تو اسلامی سیاسیات کے ذریعہ مراتب امارت پر فائز المرام ہو کر اسلامی طرزِ حکومت کے ساتھ انتظام ملکی کی کفالت کرتے ہیں۔

یہ لوگ بڑے صاحب استقامت ہوتے ہیں۔ اسلامی نظریۂ حیات کے بغور مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے امرائے ملّت اسلامیہ بھی اللہ کی جماعت یعنی حزب اللہ ہوتے ہیں اور اظہار غلبۂ دین ایسے ہی امرائے ملّت کے ذریعہ تکمیل پاتا ہے۔

خلفائے راشدین نے اسی مقام پر فائز المرام ہو کر اپنی متقیانہ اسلامی

طرزِ حکومت کے ساتھ غلبۂ اظہار حق فرمایا اور سیاست مدنیہ کے فرائض خوف باللہ کے ساتھ باحسن وجوہ انجام دیئے اور غلبۂ حق ان کی صالحانہ امارت کے ذریعہ نمودار ہوا۔ ہر شعبۂ حیات میں امرائے قوم کی اطاعت میں اتقیا نے زیادہ اطاعت شعاری کا ثبوت دیا۔ اور اس ثبوت اطاعت نے زیادہ اطاعت شعاری پیدا کی ہے۔ نیز اس اظہار اطاعت نے اولی الامر منکم کی عملی تفسیر مرتب کی۔

اطیعواللہ واَطیعو الرسول و اولی الامر منکم

کا قولی و عملی ترجمہ اسی حزب اللہ نے ترتیب دیا۔ جو تاریخی طور پر ملت اسلامیہ کی ہر دور میں راہنمائی کرتا ہے۔ اور یہ تاریخ ابدالآباد تک بفضل اللہ محفوظ ومامون رہے گا۔

یہ لوگ اولیائے کاملین ہیں۔ ان کی سیاست اسلامیہ اور دوسری جماعتوں کی سیاست میں اتنا بیّن فرق ہوتا ہے کہ ہر بالغ النّظر مسلمان بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ اتقیا کا سیاستِ مدنیہ میں کیا تصرف ہے۔ اور غیر اتقیا متصرفین کی سیاست کا کیا حال ہے۔

حزب اللہ کا تصرف علی الاعلان اطاعت خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سیاست مدینہ کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوتا ہے۔ جس کی ادائیگی سے فضیلت بندگی کا اظہار ہوتا ہے اور ایسے لوگ محض ظاہری جلال وجمال کے قائل نہیں ہوتے۔ بلکہ اسلام کی معینہ حدود میں رہ کر احکایات الہٰیہ کے نفوذ کے ساتھ اور پابندی عمل کے ساتھ جس قدر متقیانہ جاہ و تجمل انہیں ملتا ہے۔ بس اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان کا جلال، جلالِ خداوندی اور ان کا جمال، جمالِ خداوندی کا مظہر بن کر عدالتِ اسلامیہ پر انہیں لاتا ہے۔

وہ ہر ظالم سے مظلوم کا بدلہ لیتے ہیں۔ تاخیر سے کام نہیں لیتے اور ہر عفوو درگزر کے موقع و محل پر رحمت و رافت منقیانہ کے ساتھ جمالِ اسلام بن جاتے ہیں اور اخلاقِ اسلامیہ کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ ان کا جلال و جمال خود ساختہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اسلامی احوال کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ متخلق باخلاق باللہ ہونے کے ترجمان ہوتے ہیں۔ ان کا جلال و جمال اطاعت اسلام کی پیداوار ہوتا ہے۔ ان سے ڈرنے پر خدا کا ڈر محسوس ہوتا ہے اور ان سے محبت کرنے پر خدا کی محبت نصیب ہوتی ہے۔ ایک طرف وہ پرجلال عادل ہوتے ہیں۔ تو دوسری طرف وہ پر جمال عفوو درگزر کرنے والے منکسر المزاج حلیم الطبع ہوتے ہیں۔ ان کی خفی و جلی زندگانیاں ہمہ وقت مصروف اطاعت ہوتی ہیں۔ ان کا کوئی لمحہ غافل نہیں ہوتا۔ جس طرح اسلامی رعیت کو وہ خوف کے ساتھ پابندیٔ احکامات کا حکم دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ خود خدا اور رسول کے خوف سے پابندِ احکامات ہوتے ہیں۔

ایسی حزب اللہ کے مقابلہ میں دوسرے قسم کے مسلمان حکمران جب محرومیٔ تقویٰ کی بنا پر خوف و رجا سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اور یہ خوف و رجا کی کمی انہیں مصنوعی جلال و جمال کی طرف آمادۂ کار کر دیتی ہے تو ایسی حالت میں وہ اسلام کا نام تو لیتے ہیں مگر رسماً۔ انجامِ کار ان کی بے خوفی انہیں ملوکیّت پر مجبور کر دیتی ہے۔ جس سے لوگوں پر خارجی دہشت کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔ رعیّت کے لوگ ان کے ذریعہ بجائے خوف خدا کے خوف عزت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جب سے مسلمانوں میں ایسی سیاست نے رواج پکڑا۔ خوف کم ہو گیا اور ملوکیت کی رسم جاری ہوئی۔ اور رسم ملوکیت نے امارتِ اسلامیہ کو جو شوریٰ کے ساتھ رائے عامہ پر قائم

ہوتی ہے۔ اس کو مبدل بملوکیت آمرانہ کر دیا۔ جس سے سیاست مدنیہ اسلامیہ کو ملوکیّت ظاہریہ کے پردوں میں حجاب در حجاب رکھ کر فہم اسلامیہ سے الگ کر دیا گیا۔

اس ملوکیّت نے اسلام سے ہٹ کر غیر اسلامی سیاسیات کو داخلِ ریاست بھی کیا اور غیر اسلامی شعائر کو بھی رواج دیا۔ جس سے ہر آنے والے دور میں متقیانہ امارت مدنیہ کا اسلامی نقشہ بدلتا گیا۔ اور انجام کار سیاست اسلامیہ مسلمانوں کے لیے ایک اجنبی سیاست بن گئی۔ اللہ تعالےٰ کی جماعت یعنی حزب اللہ متقیانہ شرافت کے ساتھ ہر زمانہ میں موجود رہے گی۔ اور اسی جماعت سے مجددینِ اسلام پیدا ہوا کریں گے۔

اللہ کی جماعت یعنی حزب اللہ کا پہلا اطلاق صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کی جماعت پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد قیامت تک ہر زمانہ میں اللہ کی جماعت صحابۂ کرام کی اطاعت میں ہی حزب اللہ کہلا سکتی ہے۔ اور ایسے ہی متبعین کی جماعت سے مجددینِ اسلام پیدا ہوں گے۔ جن کی بڑی پہچان یہ ہو گی کہ وہ کوئی خلاف دین کام نہیں کریں وہ خلاف اسلام کسی نئی رسم یا نئے دین کے ساتھ نہیں آئیں گے۔ وہ ملت کی تجدید کتاب و سنت کے مطابق کریں گے اور ملوکانہ تصورات اور مخترعانہ تعلیمات کا خاتمہ کریں گے۔ وہ حصول تخت و تاج کے بجائے اسلامی نظریات کو ترویج دینے والے ہوں گے۔ یہ لوگ اسلامی نظریات کو تسلیم کرانے میں حکومت وسطوت کو بھی ٹھکرا دیتے ہیں۔

جو مدعی تجدّد اسلام کے بنیادی احکامات میں ردو بدل کرے یا خدا و رسول کی یا اہل بیت اطہار کی اہانت کرے۔ یا صحابہؓ تابعین یا تبع تابعین

کی راہ سے فرار چاہے۔ یا ان کی اہانت کرے۔ یا سلف صالحین پر تفوق و برتری کا مدعی ہو یا کتاب و سنت کے خلاف کسی نئی راہ پر دعوت دے یا محض وہ غلبہ حاصل کرنے کے لیے کوئی نئی طرزِ سیاست سامنے لائے تو ایسا مدعی اپنے دعویٰ تجدّد میں کاذب ہو گا۔ ایسے مدعی پر مجدد دین ہونے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ چونکہ وہ حزب اللہ سے نہیں۔ وہ صرف ایک سیاسی شخص ہو سکتا ہے جس کی سیاست کا اسلامی سیاست سے کوئی واسطہ نہیں۔

ایسے مصنوعی لوگ ہر زمانہ میں مجدّد ہونے کا دعوی کرتے رہیں گے۔ مگر علمائے اسلام کی جماعت ان کا ردِ عمل کرتی رہے گی اور علمائے اسلام کے ذریعہ ان کے جھوٹے دعوے طشت از بام ہوتے رہیں گے۔

اللہ تعالےٰ کی جماعت والوں کی تعریف کتاب و سنت کی متعیّنہ ہدایات کی روشنی میں ہوتی ہے۔ وہ نماز روزہ، حج اور زکوٰۃ کے پابند ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی حال ایسا نہیں ہوتا جس میں نماز قضا ہو سکے یا کیف و مستی اس حد تک آجائے کہ وہ اپنی نماز کو صرف حالِ روح پر چھوڑ دیں۔ اور اپنی نماز کو اشتراک جسم سے الگ کر لیں۔

جیسا کہ بعض باہوش بدعتی بے دین لوگ نماز کو روحانی نماز قرار دے کر بظاہر ادائیگی نماز سے عمداً کوتاہی کرتے ہیں۔ اور دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے روحانی طور پر نماز ادا کر لی ہے۔ ایسے لوگ اگر بال بچہ دار ہوں۔ اور کھانے پینے، اوڑھنے، رہنے، سہنے کا ہوش بھی رکھتے ہوں اور ایسی روحانی نماز کا دعویٰ بھی کرتے ہوں۔ تو ان پر حزب اللہ کی جماعت کے فرد ہونے کا اطلاق نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ایسے بدعتی اور بے دین لوگ کوئی متقیانہ سلوک کا دعویٰ کر سکنے کے مجاز ہیں اور نہ ہی ان سے کوئی مجدّد ہونے

کا دعویٰ کر سکتا ہے اور نہ ہی ایسے لوگ ہادی و مرشد ہو سکتے ہیں۔
حزب اللہ اشتراکِ جسم و روح کی نماز کے ساتھ انفاقِ مال کرنے والی اور آسمانی کتب پر اور یوم آخرت پر کامل یقین رکھنے والی جماعت ہوتی ہے اور ختمِ نبوت کے بنیادی نظریہ کی قائل ہوتی ہے۔ اس جماعت کی تحریر و تقریر ایسی تمام تر توجیہات سے پاک ہوتی ہے جس سے کسی طرح بھی اسلامی بنیادی معتقدات میں فساد کا شبہ پیدا ہو سکتا ہو۔
یہ لوگ عام فہم طرزِ تبلیغ کے ساتھ غلطیوں کا احساس دلا کر صراطِ مستقیم کی از سرِ نو وضاحت کرنے میں تائیدِ ایزدی کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ نبضِ کائنات کی دھڑکنوں کے مطابق ایک ہی زاویہ نگاہ کے ساتھ بگڑے ہوئے طبائع کو ہدایت کی جانب مبذول کر لینے کی خداداد صلاحیتوں کے مالک بھی ہوتے ہیں۔ وہ ترویج و تنفیذِ دین کی راہ میں ہر قسم کے شدائد پر صبر و استقامت کی توفیقات کے بھی حامل ہوتے ہیں۔ وہ راہِ حق میں غازیٔ سبکسار بھی ہوتے ہیں اور انجامِ کار راہِ حق میں جانِ عزیز کی شہادتؒ کو ترجیح دینے میں خوشی پاتے ہیں۔ امتِ خیر الانام میں آج تک کوئی ایسا مجدد نہیں گزرا۔ جس نے بنیادی احکامات میں ردّ و بدل کرنے کی سعی کی ہو۔
والد بزرگوار نے فرمایا۔ عامتہ المسلمین ہدایت کے لیے ہمیشہ علمائے صالحین کے محتاج ہوتے ہیں۔ اگر علمائے صالحین اہلِ استقامت ہوں تو عامتہ المسلمین بآسانی ہدایت پا لیتے ہیں اور علمائے صالحین ہمیشہ متشرع علمائے بواطن کے مرہون ہدایت ہوئے ہیں۔ نیز علمائے بواطن سے ہی علمائے صالحین کو استقامت ملتی ہے اور علمائے بواطن جو شریعتِ حقہ

کے پابند ہوں وہ اخص الخواص کے مرہونِ ہدایت ہوتے ہیں۔ اخص الخواص کے ذریعہ استقامت ملتی ہے اور اخص الخواص اللہ کی جماعت کے سردار ہوتے ہیں جن کی نگرانی میں خواص اور علمائے صالحین تربیت پاتے رہتے ہیں۔

اس گروہ کی ہدایات عملی سبیلِ تقویٰ کے ذریعہ علماء اور عامتہ المسلمین تک پہنچتی رہتی ہیں۔ اس واسطے حزب اللہ یعنی اللہ تعالےٰ کی جماعت کبھی خلاف دین توجیہات میں خود وقت ضائع نہیں کرتی ہے اور نہ ہی ملتِ اسلامیہ کو شبہات میں مبتلا ہو کر تضیع اوقات کرنے دیتی ہے۔

فرمایا۔ چھوٹے بڑے صالحینِ امت کی ریاضتیں اور ان کی تمنائیں، اور ان کی دردمندانہ دعائیں مل کر ایک صدی میں ایک مردِ صالح و فالح کو خداوندِ ذوالجلال سے مانگ لیتی ہیں۔ جس کو اللہ والوں کی قیادت کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ جس کی دعائیں اور نگاہیں دور رس ہوتی ہیں۔ وہ اسلامی آئینہ داری میں ماضی، حال و مستقبل کا صحیح جائزہ لینے کے بعد تلافیٔ مافات کے لیے عملوا الصٰلحت کے ساتھ میدانِ عمل میں اتر آتا ہے۔ اس کی وضع قطع سب مسنون ہوتی ہے۔ اس کا لباس، اس کا چہرہ اس کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، اس کی تحریر و تقریر، اس کا سفر و حضر اس کی خوشی و غمی سب کے سب مجموعۂ رسول کا جیتا جاگتا نمونہ ہوتے ہیں۔

فرمایا کوئی مجدد مقطوع الریش نہیں ہو سکتا۔ کوئی مجدد نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ میں سے کسی رکن کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کر سکتا۔ کوئی مجدد اپنے آپ کو خدا اور رسول کی صفات میں دخیل نہیں سمجھتا۔ اگر وہ خدا اور رسول کی صفات میں جزوی طور پر بھی دخیل ہونے کا دعویٰ کرے تو وہ مجدد نہیں ہو

سکتا۔

مدعی تجدد اگر نبی اللہ کی سنت کی اطاعت کے علاوہ ان کی ذات و صفات کو اپنی ذات و صفات کے ساتھ مماثل کرے مثلاً ظلی و بروزی تو نبوت کا دعویٰ کرنے والا مجدد ہونا درکنار، وہ تو سرے سے مسلمان ہی نہیں رہتا۔

فرمایا۔ غلام احمد قادیانی نے پہلے عالم دین ہونے کا دعویٰ کیا۔ پھر ولی اللہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ پھر مجدد ہونے کا دعویٰ کیا۔ مابعد ان دعووں کے ظلی و بروزی نبی ہونے کا دعوی کیا۔ پھر مہدی موعود، اور علی التکرار مسیحِ موعود اور کرشنِ موعود وغیرہ کا دعویٰ کرتا رہا۔ اور وَیمد ھم فی طغیانِہم یعمھون کا مصداق بنتا رہا۔

مرزا غلام احمد قادیانی جب اس نقطہ کذب و افترا پر پہنچا کہ اس نے تاویلانہ توجیہات کے انداز اختیار کیئے۔ تو وہ خارج از اسلام ہو گیا اور اس خروج و ارتداد کے بعد اللہ تعالےٰ اس پر اتنے ناراض ہوئے کہ اس پر ہدایت کے تمام دروازے بند کر دیئے اور وہ صریح گستاخ ہوا اور اس کی زبان و قلم سے اتنا غلیظ مواد خارج ہوا کہ جس کی غلاظت اور عفونت نے اجتماعِ امت کا قافیہ تنگ کر دیا۔

اس قسم کی کاذبانہ تاویلات کے پھندے ڈالنے والے اسلامی متقیوں کا لبادہ اوڑھ کر شیطان کی رفاقت میں لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔

فرمایا۔ ایسے لوگ اور ان کے پیرو کار انجام کار ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا حال سامری اور مسیلمہ کذاب کی طرح ان کے لیے مہلک بن جاتا ہے۔ ملت اسلامیہ میں ایسے لوگوں کی تاریخ تاریخِ مکذبین کہلاتی ہے۔ اور وہ

ابدالآباد تک مکذبین میں شمار کیے جائیں گے۔

فرمایا۔ کتاب و سنت تقویٰ کا صحیح معیار ہے۔ خلاف سنت خیر الانام کوئی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس واسطے اگر کوئی مسلمان متقی بننا چاہے تو متشرع اہل اللہ کی نگرانی میں منزل بمنزل آگے بڑھنے کی کوشش کرے تاکہ ریاضت کا کوئی شرعی گوشہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکے۔ ورنہ بصورت دیگر ریاضت دینیہ میں وقفہ ہو جائے گا۔ جیسے قیام نماز میں وقفہ سقوط نماز کا باعث ہو جاتا ہے۔

اسی طرح تغافلِ منازل وقفہ ریاضت بن جاتا ہے اور یہ وقفے منزلِ مقصود سے دور کر دیتے ہیں۔ ایسے وقفہ جات ایک مدت العمر تک کسی صوفی منش مسلمان کے لیے ذریعہ کفر و نفاق بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر ایسے وقفوں کے بعد بھی صوفی یہ کہے کہ میں نے یہ منازل سلوک بکمال طے کر لیے ہیں تو اس میں کذب آجائے گا۔ حالانکہ اس نے ترتیب منازل میں وقفے کیے ہیں۔ پھر جھوٹ ہی کو ذریعۂ تشہیر بنا لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے بے جا دعوے تصوف میں ناکامی کا موجب بن جاتے ہیں۔

فرمایا۔ اسلام میں رہبانیت کو ناجائز قرار دے دیا گیا ہے۔ اگر ریاضت کرنی ہے تو گوشہ نشینی اس غرض سے اختیار کرنی چاہیے۔ کہ ریائے نفسانی اور عجبِ نفسانی کے خلاف جہاد کروں گا۔ اور یہ جہاد خلوت و جلوت دونوں میں ضروری ہوتا ہے۔ لہذا ریاضت کے بعد مجلس میں واپس آنے کی نیت کر لے۔ ورنہ رہبانیت کا شکار ہو جائے گا جو شریعت میں ناجائز ہے۔ جس فقر کو رہبانیت کے ساتھ نسبت ہو، وہ کسی طرح اسلامی فقر و غنا نہیں ہو سکتا بلکہ وہ متعلق بالغیر ہو کر سادھوپت اور رہبانیت ہی رہ

جاتا ہے۔ ایسے راہبانہ تصوف کے ساتھ عباداتِ اسلامیہ کی توہین ہوتی ہے۔ بلکہ عبادات ہو ہی نہیں سکتے۔

طریقہ قادریہ اس سبیلِ شرعی پر چلنے کا نام ہے۔ جو اطیعوا اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم کا مصداق بنائے۔ یہی وجہ ہے، کہ طریقہ قادریہ سید الطرق ہے۔

اس کے علاوہ میں سلسلہ چشتیہ نقشبندیہ سے بھی اجازت یافتہ ہوں۔ فرمایا میں نے سلسلۂ سہروردیہ کے طریقہ پر بھی ریاضت کی ہے۔ مگر تین طریقوں سے اجازت یافتہ ہونے کی بنا پر تمہیں بھی تینوں طریقوں پر عمل پیرا ہونے کی اجازت دیتا ہوں۔ بڑی احتیاط سے ان پر پابندی کرنا۔ اور علمائے امت کا ہمیشہ احترام کرنا۔ علماء جس بات پر یا عمل پر احتساب کریں۔ اسے بار خاطر نہ جاننا کہ اہلِ تقویٰ احتساب شرعی کو اپنے لیے موجب رحمت گردانتے ہیں۔ علمائے اسلام کی مجالس سے راہ سلوک میں اعتدال و احتیاط میسر آتے ہیں۔

# ستائیسواں باب

## اہلِ دُنیا و اہلِ ایمان

اہل دنیا حکمرانوں کی نسبت اہل ایمان کی حکومت زیادہ دیرپا ہے اور لوگ نسبتاً ان سے زیادہ محبت و عقیدہ کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ وجہ معلوم کرنی ضروری ہے کہ انبیاالله یا قوموں کے مذہبی راہنما قرن ہا قرن تک لوگوں کے دلوں میں کیسے اور کیونکر ابدی محبت پا لیتے ہیں۔ بوجودیکہ وہ ظاہری تمکنت کے مالک بھی نہیں ہوتے اور اہل دنیا حکمران اگرچہ اپنی حاکمانہ تاریخ مرتب کر لیتے ہیں مگر لوگوں کے دلوں میں ان کی عقیدت کیوں نہیں ہوتی۔ برخلاف ان حاکمین دنیا کے خلفائے اسلام نے بھی حکومت کی۔ مگر انہوں نے بوجود حکمران ہونے کے بھی عقیدت و احترام کے ساتھ ابدی طور پر لوگوں کے دلوں کو جیت لیا۔

اس کی واضح وجہ یہ ہے کہ اہل دنیا حکمرانوں نے ہمیشہ ظاہری تمکنت کو پسند کیا اور لوگوں پر حکمرانی برائے حکمرانی طرزِ نمود و نمائش کو اپنی عادت بنایا۔

انسانیت اپنی اجتماعی زندگی کی بحالی اور اس کے اعتدال و انضباط کے لیے ہمیشہ حکمرانوں کی محتاج رہی ہے۔ اور آئندہ بھی رہے گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگوں کی اس فطری مجبوری سے غلط فائدہ اٹھا کر کوئی

حکمران بجائے انتظام ملکی کے لوگوں پر اپنا دبدبہ محض جاری کر کے ان کو ڈراتا رہے۔ یہ عادت حکمرانوں کو حکومت کا موقع تو دیتی ہے، مگر انسانی سینے ایسی عادت کو اپنے دلوں میں محبت و الفت کے لیے جگہ نہیں دے سکتے۔

اسلام نے اپنے ہر فرد و اجتماع کو تقویٰ اور پرہیزگاری کا درس دیا ہے۔ تاکہ اسلامی معاشرہ سے جب بھی کوئی فرد کسی صالحیت کے ساتھ برسرِعام آئے تو خوفِ خدا کے ساتھ ہی وہ اپنی صلاحیت کا صحیح تصرف کرلے۔ اگر ایسا متقی حکمران ہو جائے تو بھی اپنے آپ کو اللہ تعالےٰ کی ادنیٰ رعیت سمجھتے ہوئے حکمرانی کے فرائض انجام دے تاکہ اس میں انانیت نہ پیدا ہو۔ بلکہ وہ اللہ تعالےٰ کا عاجز بندہ ہو کر ایک جانب اللہ تعالےٰ کی بندگی کرے اور اس کا شکرانہ بجا لائے اور دوسری طرف اپنے آپ کو لوگوں کا خادم گردانتے ہوئے ان کے حقوق پورے کرے۔

اس نظریہ کے ساتھ اسلامی حکمران حاکم ہو کر بھی عوام کے سامنے اہل اللہ ہی تصور کیے جاتے ہیں۔ خلفائے اسلام کی حکمرانی کا یہی منظر تھا۔ بوجود حکمرانی کرنے کے بھی وہ اولیا اللہ تھے۔ ان کے عملی تقوی نے حکمرانی کو بھی متقی بنا دیا تھا۔

اس کے علاوہ امت رسول علیہ الصلوۃ والسلام کی وہ شخصیات جنہوں نے حکمرانی نہیں کی۔ مگر تزکیۂ نفوس کے ساتھ وہ روحانیت کے ان مقامات تک پہنچے، کہ سلطانی بھی وہاں دم بخود تھی۔

یہ لوگ علماء و مفسرین کی صورت میں متقیانہ اعمال کے ساتھ فرائض بندگی ادا کرتے رہے۔ یہ لوگ اغواث و اقطابِ زمانہ بھی ہوئے۔

ابدال و اوتاد کے مقام پر فائز ہوئے۔ ان کی پہنچ حیران کر دینے والی پہنچ تھی۔ مافوق الادراک کرامات بھی ان لوگوں سے صادر ہوتی رہیں۔ مگر ان لوگوں نے کبھی انانیت کو اپنے قریب نہیں آنے دیا۔ بلکہ مجاہدات محض اسی لیے کرتے رہے تاکہ اس قسم کی زائدہ اور بے ہودہ امراضِ نفسانی ان پر یا معاشرہ پر غلبہ نہ پاسکیں۔

چونکہ اہل اللہ کے نزدیک غرورِ نفس ہی وہ مہلک ترین حادث ہے جو انسان کو نہ ہی خدا کا چھوڑتی ہے۔ اور نہ ہی انسانوں کا اور نہ اپنا۔ ایسا بصاحبِ غرور اپنی ذات کے لیے بھی نفع بخش نہیں ہوتا۔

دنیا میں دونوں قسموں کی حکومتیں یعنی اہل اللہ اور اہل دنیا کی بیک وقت ہر زمانہ میں موجود رہتی ہیں۔ بسا اوقات زمین کا کوئی حصہ اگر ظاہری سلطنت سے محروم ہو بھی جائے۔ تو بھی وہاں اہل اللہ کے تصرفات التزام روحانیت کے ساتھ جاری رہتے ہیں اور یہ انصرام و انتظام روحانیت کے ذریعہ ضابطوں میں پابند رہتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کبھی اور کسی لمحہ کے لیے اہل روح اولیاء اللہ کی روحانی حکومت بند نہیں ہوتی۔ جب اور جس زمانہ میں اس حکومت میں تعطل آئے گا، قیامت بپا ہو جائے گی۔

اسلام کی حکومت، اللہ کی حکومت ہے۔ وہ دنیا داروں کی سیاست نہیں۔ وہ اپنی ریاست میں مرد و زن کے لیے تقویٰ چاہتی ہے اور تقویٰ پر ہی خالص اسلامی تہذیب و تمدن کی بنا قائم ہو سکتی ہے۔ اس طرح خدا اپنے بندوں کے ذریعہ دنیا پر اپنا رحم و کرم جاری رکھتا ہے۔ جب قومیں ایک جسم کی صورت میں منتقی ہو جائیں۔ اور ان کے راہنما ان کے اجتماع قوم کا روحانی دل ہو جائیں تو وہ قوم پیکرِ کرامت بن جاتی ہے۔

جس کا معبود برحق خدا وحدہ لاشریک ہوتا ہے اور جس کے رسول آخری نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام ہوتے ہیں۔ اور جس کا قبلہ بیت اللہ شریف ہوتا ہے۔ اور اس کا آئین کتاب اللہ اور کتاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوتا ہے۔ اور جس کا ایمانِ بالآخرت یہ ہوتا ہے کہ اس نے اور ساری مخلوقات نے قیامت کے دن ایک خدائے برتر کے سامنے جواب دینا ہو گا۔

اگر ہر دعویٰ دلیل چاہتا ہے اور دلیلِ صائب کے ساتھ دعویٰ کی تصدیق ہو جاتی ہے اگر یہ درست ہے۔ تو اس دعویٰ کی دلیل بھی صحیح ہو گی کہ مادہ پر روحانی حکومت جاری ہے۔ کیونکہ ہر ظاہری صورت پر معنویت حکمرانی کرتی ہے اور صورت کی بقا معنویت پر منحصر ہے اور وجودِ معنویت ہی ظاہری صورت کو تمکنت دیتی ہے۔ یہ مثال ہر ظاہری صورت پر اطلاق کرتی ہے۔

ایک ذرۂ بے مقدار سے لے کر عالمین کی مجموعی صورت پر اس بات کا اطلاق علی الاصول ہے کہ یہ ساری کی ساری کائنات فطری معنویت پر قائم ہے۔ جس کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ مگر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہر ذی جان کی صورت جسم میں اس کی جان معنویت ہے۔

معنویت پر صورت استوار ہوتی ہے اور ہر صورت سے جو جو نتائج نمودار ہوں۔ ان کو صورت کی سیرت کہا جاتا ہے اور عالمِ مادہ اپنی صورت کو معنویت پر استوار کرنے کے بعد ہی نتیجتاً ظہور پذیر ہوا ہے۔ اور یہی صوری نتیجہ متشکل کائنات بنا اور اس ظاہری کائنات کو اور اس کی ظاہری حکمرانی کو مادی کائنات اور مادی حکومت کہا جاتا ہے۔

انسان خود ایک صورت ہے۔ جو انسانی معنویت پر متشکل ہوا اور اس کی سیرت تمام عالمین سے افضل و اعلیٰ ہے۔ چونکہ یہ صاحب عقل و نطق ہے۔ اس کی ترقیات کا پھیلاؤ اس کی معنویت سے شروع ہو کر جسم کی راہوں سے مخلوقات تک اپنے استفادے پہنچا کر پھر معنویت پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔

انسانی معنویت کی ابتدا علم الٰہی سے شروع ہو کر بصورتِ آدم علیہ السلام عالم خلق میں نمودار ہوئی۔ معنویت میں انسان خدا کے علم میں اشرف المخلوقات تھا۔ اس واسطے اشرف کی تشریف آوری سے پہلے عالمین کو اس کے لیے فرشِ راہ بنایا۔ تاکہ وہ نزولِ آدم علیہ السلام کے ساتھ اور ان کے قدوم میمنت لزوم سے مشرف ہو۔

پیکرِ آدم صورتاً خاکی تھا۔ مگر معنویت میں اشرف الخلائق ہو کر اول البشر اور ابوالبشر کا مقام پایا۔ مگر یہ معنویت صورتاً و سیرتاً بالنّبوۃ بنتی ہے اور پیکر خاکی معنویت سے صورت اور سیرت بن کر قبائے نبوت زیب تن فرماتا ہے۔ یہ پیکرِ آدم معنویت میں ابدالآباد تک نوع انسانیت کا جامع تھا۔ جس کی پشت میں ازل سے ابدالآباد تک پوری اولادِ آدم مستور تھی۔ معنویت سے صورتِ جسم اور صورتِ جسم سے صورتِ قلب اور صورتِ قلب سے نظامِ تولید۔ پھر دوسری معنویت حوا علیہا الصلوۃ والسّلام کی صورت میں آپ کی پسلی سے پیدا ہوئی۔ پھر علم الٰہی کی معنوی حیثیت حکم الٰہی سے دو صورتوں میں نمودار ہوئی۔ اور وہ دو صورتیں حضرت آدم اور حضرت حوّا علیہما الصلوۃ و تسلیمات تھیں۔ پھر معنویت نے ارحام کی بنیاد ڈالی۔ اصلاب و ارحام کا سلسلہ جاری ہوا۔ اصلابی مادہ نے بالاستتار ارحام

میں منتقل ہو کر صورتِ آدم کی تخلیق کا دوسرا جامہ پہننا شروع کیا۔

آدم علیہ السّلام بغیر ماں باپ کی پیدا ہوئے۔ اور حوا علیہا الصلوٰۃ والسّلام بھی بغیر دستورِ اصلاب و ارحام پیدا ہوئیں اور ان دونوں جوڑوں کی حقیقت نے ایک تیسری صورت اختیار کر لی۔ یعنی پشت سے رحم مادر میں اور رحم مادر میں انسانی خاکہ کشی۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالےٰ ہے۔

هوالذی یصورکم فی الارحام کیف یشاءُ

اللہ وہ ذات ہے۔ جو تمہیں رحم مادر میں جس صورت کے ساتھ چاہتا ہے۔ ویسا ہی بنا دیتا ہے۔ یہ معنویت پر صورت کی چوتھی متشکل ترتیب ہے۔ پھر یہ ترتیب ہمیشہ کے لیے جاری ہو گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسّلام بعد از آدم و حوا ایک نئی قدرت کی مثال ہے۔ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام مذکر تھے۔ آپ کے وجود سے بغیر مادہ صلبیہ اور بغیر مادہ رحم کے مؤنث کو بصورت عورت پیدا فرمایا۔ جو ذریعہ اولادِ آدم بنیں۔

حوا علیہا الصلوٰۃ والسّلام نبی اللہ نہیں تھی، بلکہ ولیہ تھیں اور آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نبی تھے۔ مریم علیہا الصلوٰۃ والسلام ایک عورت تھیں۔ یعنی مؤنث اور ولیہ تھیں۔ آپ کے بطن سے بلا احتیاج مادہ صلبیہ مذکر یعنی مرد پیدا ہوا۔ جو نبی اللہ تھا۔ یہ حیثیت بھی معنویت پر قائم ہونے والی ایک شکل تھی۔ چونکہ حضرت مائی مریم علیہا الصلوٰۃ والسلام اولادِ آدم تھیں۔ اس واسطے ان کے جسم کی اولاد بھی اولاد آدم ہی کہلائے گی۔

چونکہ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام مٹی سے بنائے گئے تھے۔ اس واسطے

ان کی اولاد کے اصلاب و ارحام کے ذریعہ حضرت مریم علیہا الصلوۃ والسلام پیدا ہوئیں وہ مٹی تھیں۔ آیت ہے۔

کلکم بنوا ادم وادم من تراب

تم سب اولاد آدم ہو۔ اور آدم علیہ السّلام مٹّی سے ہیں۔ آپ کو اولادِ مٹی نہیں کہا گیا۔ بلکہ مٹی سے بنایا گیا کی اصطلاح استعمال ہوئی۔ مگر عیسے علیہ السلام بطن مادر سے پیدا ہوئے۔ رحمِ مادر میں ہی اللہ تعالےٰ نے اپنے حکم سے آپ کو تیار فرمایا۔

ندغہ کی صورت میں آپ نے بطنِ مادر میں قرار پکڑا۔ اور مدت حمل کے ساتھ پیدا ہوئے۔ یہ پیدائش کا وہی اندازہ تھا۔ جو عام ولادت کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی مائی صاحبہ کو درد زہ ہوا۔ پھر آپ پیدا ہوئے۔ یہ پیدائش قدرت کی کرشمہ سازی تھی۔ مگر مجموعی طور پر اولادِ آدم کا سلسلہٗ اصلاب و ارحام کی معنویت پر ہی متخلّق و متشکل ہوتا رہا۔

آگے صفات آدمیت کا سلسلہٗ ہے۔ جو انسانی سیرت کہلاتا ہے اور نسلِ انسانی کی سیرت دو حالتوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ یہ تقسیم مشترک ہے۔ ایک معنویت پر روحانیت کا عروج اور روحانیت کا اللہ کی اطاعت کے ساتھ عروج جو جسم نبوت پر اطلاق کرنے کے بعد معجزات بنتا ہے اور اولیاء اللہ پر مرتب ہو کر کرامات بنتا ہے۔

دوسری قسم معنویت پر مادیت کا عروج اور مادیت کے ساتھ نفسانی لذات و رغابات کے ساتھ حرص و ہوا کا عروج۔ اس عروج کا اطلاق مطلق مادیت پرستی پر مرتب ہو کر محض پیکرِ ہوا و ہوس بنا کر جاہ حشمت بن جاتا ہے۔

یہ دونوں مذکورہ اقسام معنویت سے جسم پر مرتب ہو کر سیرت بنتے ہیں۔ ایک سیرت انبیاء و اولیاء کی اور ایک سیرت اہل دنیا کی۔، سیرت انبیاء و اولیاء کے صفات کی جزو اعظم روحانی صلاحیت پر احکام الٰہی کی اطاعت ہوتی ہے۔ ان کا وجود بھی عالم مادہ میں بنایا جاتا ہے۔ ان کا جسم اشتراک روح و مادہ سے ترکیب دیا جاتا ہے۔ مگر ان کی معنویت ان کے اجسام کو روحانی صلاحیت جزو اعظم کے طور پر تفویض کرتی ہے۔

اس واسطے یہ لوگ جہاں اللہ تعالےٰ کی بندگی باحسن وجوہ انجام دیتے ہیں۔ وہاں اہل دنیا کے حقوق کی بھی نگہداشت کرتے ہیں۔ کہ اس میں اللہ تعالےٰ ہی کی اطاعت مراد ہوتی ہے۔ ان کی اصطلاح میں خدمت انسانیت کو حقوق العباد کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

لہذا انبیاء صدیقین، شہداء وصالحین کے تمام اعمال للہ تعالےٰ ہو کر بندگی بنتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ لوگ اللہ کا گروہ کہلاتے ہیں۔ یہ بظاہر حکومت کریں تو بھی للہ تعالےٰ کرتے ہیں۔ اور اگر بظاہر حکومت نہ کریں، تو بھی ان کی برکات حکومت کائنات میں جاری رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ عالم عناصر میں کوئی عنصر ایسا نہیں، جس پر ان اہل اللہ کا تصرف نہ ہو۔

اہل دنیا کا جسم بھی اشتراک روح و مادہ کا مرکب ہوتا ہے۔ مگر ان صفات میں جزو اعظم مادہ پرستی ہے۔ ان سے جو اعمال بھی سرزد ہوتے ہیں۔ اللہ کے لیے نہیں بلکہ خوشنودی نفس اور ریا و نمود کے لیے۔ اس واسطے یہ لوگ عدل و انصاف اور صلہ رحمی سے ہمیشہ بیگانہ ہوتے ہیں۔ ان سے لوگوں کو مادی استفادے ہوتے ہیں مگر وہ بھی غیر متوازن۔ انجام کار ان دنیاداروں کی صلاحیتوں کا اتمام مادہ پرستی ہوتا ہے۔ یہ لوگ مادیت پر

عروج پا کر مادیت پر ہی اپنا اتمام کرتے ہیں۔

اہل اللہ کی حکومت کے لیے یہ دلائل محکم ہیں۔ ان کے تصرفات، زندگی میں، موت میں اور بعد از موت بھی جاری رہتے ہیں۔ چونکہ مومن زندگی میں بھی اللہ کے نزدیک زندہ ہوتا ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی بوجہ ایمان عنداللہ زندہ ہوتا ہے اور غیر مومن زندگی میں بھی عنداللہ مردہ ہوتا ہے اور مرنے کے بعد بھی مردہ۔ فلہٰذا اہل اللہ سے ان کی حیات و موت دونوں میں استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

# اٹھائیسواں باب

## = ایک مردِ خدا سے ملاقات =

= اباجان سے خرقۂ خلافت ملنے کے چند سال بعد ایک عارف باللہ سے دیول شریف میں ہی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ یہ مردِ خدا اکتالیس برس کشمیر کی پہاڑیوں پر ریاضت کرنے کے بعد پشاور کی طرف مراجعت فرما رہے تھے۔ انہوں نے اپنا نام عبدالرحمٰن کابلی بتایا تھا۔ فرمانے لگے۔ اب میری عمر اسی (۸۰) برس کی ہو چکی ہے۔ بیس سال کی عمر میں مجھے بغداد شریف میں خرقۂ خلافت ملا تھا۔ اس کے بعد میں نے حج بیت اللہ شریف کا ارادہ کیا اور دو سال تک مدینہ طیبہ میں دربار مصطفےٰ ﷺ کے سامنے درود خوانی کی اور تلاوت قرآن کریم کرتا رہا۔ مجھے خواب میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مشرق کی طرف چلے جانے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ میں مدینہ منورہ سے مکہ شریف آیا۔ عمرہ ادا کیا اور بغداد کی طرف سے ہوتا ہوا کابل پہنچا۔ جو میرا آبائی وطن ہے۔ دو سال میں نے کابل کے ویرانوں میں ریاضت کی۔ پھر ہندوستان کے تمام مزارات پر حاضری دیتا رہا۔ اور وقت کے عظیم روحانی و دینی پیشواؤں سے علم و عرفان کا فیض پایا۔ چھ برس متواتر حسبِ استطاعت سِیرُوا فِی الْاَرْضِ کی تعمیل کی اور اہل اللہ کی تلاش کرتا رہا۔ جہاں بھی مجھے معلوم ہوا کہ فلاں جگہ کوئی مردِ خدا ہے وہیں

پہنچا۔ فرمایا۔ مجھے اسی سیاحت کے زمانہ میں دریائے اٹک پر حضرت خواجہ
خضر علیہ السّلام سے شرفِ ملاقات نصیب ہوا۔ آپ نے مجھے اپنے سینہ
مبارک سے لگایا اور میرے منہ میں پھونکا اور دعا دی۔ کچھ خاص اوراد
وظائف بھی عطا فرمائے اور فرمایا کہ کشمیر چلے جاؤ۔ اکتالیس برس کشمیر کے
دریاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں میں

یا ودود۔ یا نور۔ یا لطیف کا ورد کرتا رہا

چنانچہ میں نے اکتالیس برس کشمیر کی پہاڑیوں، جنگلوں اور دریاؤں
میں یاودود۔ یا نور یا لطیف کے ورد کے ساتھ ریاضت کی۔ =

= اکتالیس برس کے بعد مجھے کشمیر کے ایک دریا پر بوقت
حضرت خواجہ خضر علیہ السلام سے دوبارہ ملاقات کا شرف ملا آپ نے مجھے
اپنے سینۂ مبارک سے لگایا اور مزید رموز و اسرار بتائے۔ پھر حکم فرمایا کہ
دیول شریف جاؤ۔ وہاں ایک نوجوان مصروفِ عبادت ہے۔ اس کا نام
محمد عبد المجید احمد ہے اور اس کے والد کا نام محمد عبد اللہ ہے۔ جاؤ اور اس
کی راہنمائی کرو۔ تمہارا وہاں جانا ضروری ہے۔ چنانچہ اسی حکم کے تحت میں
تمہارے پاس آیا ہوں۔

حضرت عبد الرحمن کابلی رحمتہ اللہ علیہ نے مجھے اپنے سینۂ مبارک
سے لگایا اور ایک خرقۂ خلافت اپنی طرف سے پہنایا اور مجھے رموزِ معرفت
عجیب و غریب درس دیا۔

اور یا ودود۔ یا نور۔ یا لطیف کے وظیفہ کی اجازت بخشی اور فرمایا۔
اس وظیفہ میں تمہارا خاص حصہ ہے۔ تمہیں جو کچھ ملے گا، اسی سے ملے گا
آپ نے اپنی ذات کے متعلق فرمایا کہ میں اللہ تعالےٰ کے فضل

کرم سے غوثِ وقت کا درجہ رکھتا ہوں۔ اور مجھے اللہ تعالےٰ نے زمانے پر تصرف دیا ہے۔ پھر فرمایا میں جارہا ہوں۔ تجھے خدائے برتر کی حفاظت میں چھوڑتا ہوں۔ اللہ تعالےٰ کا شکرانہ پابندیِ دین کے ساتھ ادا کرنا۔ فرمایا۔ بعض لوگ صرف زبانی شکر ادا کرنے کے اس طرح عادی بن جاتے ہیں کہ ان کے ذہن سے یہ جذبہ مفقود ہو جاتا ہے۔ کہ شکرانہ پابندی عمل چاہتا ہے۔

(۱) فرمایا۔ زبان سے اللہ کی تعریف بیان کرنا اور بدن سے اللہ تعالےٰ کی مجوزہ عبادات کرنا اور حلال کمائی کرکے اسے اللہ تعالےٰ کی راہ میں خرچ کرنا صحیح شکرانہ ہے۔ جو مومن زبان کو اللہ کی یاد میں مصروف کرلے اور اسے جھوٹ اور غیبت سے بچائے اور بدن کو عبادات پر مائل کرلے۔ اور حرام سے بچالے۔ اور حلال کمائی کرے اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے پر پورے یقین سے کاربند ہو جائے۔ تو اس کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے سلامتی، رحمت اور برکات ملتے ہیں۔ اور ایسے ہی مومن کو اسلام کی زبان میں متقی کہا جاتا ہے اور ایسے ہی متقی ولی اللہ بنائے جاتے ہیں۔

اس واسطے بیٹا!۔ ان تین چیزوں پر اللہ کے فضل و کرم کے ساتھ نظر رکھنا۔ ان تین چیزوں کو غلطی اور غفلت سے بچانے کی نیت کرنا۔ اور اللہ تعالےٰ سے مدد چاہنا۔ جب کوئی بندہ نیک کام کی نیت کرلیتا ہے اور اللہ کے حضور شیطان سے پناہ چاہتا ہے، تو اسے نیک کام پر اللہ کی طرف سے توفیق مل جاتی ہے۔

زبان، بدن اور پاک مال خرچ کرنے کے لیے اللہ سے استعانت طلب کرنی چاہیے اور اللہ تعالےٰ کی استعانت صبر و صلوۃ کے ساتھ ملتی ہے

اور صبر و صلوٰۃ کے ساتھ استعانت خاشعین حاصل کرتے ہیں۔

خاشعین وہ ہیں۔ جو اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول مقبول اور دینِ اسلام کی فرمانبرداری میں یوم آخرت پر ایمانِ کامل رکھتے ہوں کہ ہم نے انجام کار خدا سے ملنا ہے، اور زندگی کا حساب دینا ہے اور ہم اس کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ اس نصیحت کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کی آیت پڑھی۔

واستعینوا بالصبر والصلوۃ وانھا لکبیرۃ الا علی الخشعین الذین یظنون انھم ملقوا ربھم وانھم الیہ رجعون۔

یعنی تم اللہ تعالےٰ سے صبر وصلوۃ کے ساتھ استعانت مانگو۔ اور ایسی استعانت حاصل کرنا بہت بڑا کام ہے۔ جس کی ادائیگی سوائے خاشعین یعنی متقیوں کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ یعنی وہ صبر وصلوۃ کے ساتھ اللہ سے امداد مانگتے ہیں اور آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا۔ درود شریف جن کلمات کے ساتھ بھی ادا کیا جائے، اس میں صلوۃ وسلام دونوں کا ہونا ضروری ہے۔ چونکہ اللہ تعالےٰ کا امر ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام پر صلوۃ وسلام کے ساتھ درود بھیجو۔

فرمایا۔ درود تاج مجھے بہت پسند ہے۔ اس کو تم بھی پڑھا کرو۔ مگر ایک خاص درود شریف کی اجازت دیتا ہوں۔ جو نسبتاً زیادہ پرتاثیر ہے۔ مجھے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر وہ درود شریف لکھ کر عطا فرمایا۔ اور اس کی اجازت بخشی۔ وہ درود شریف درجِ ذیل ہے۔

اللھم صلی وسلم علی سیدنا محمد وعلی الِ سیدِنا

محمد عدد مافی علم اللہ صلوۃ وسلما دآیمتہ بدوام ملک اللہ۔

اے اللہ درود و سلام بھیج ہمارے سردار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر اور ہمارے سردار کی ال پاک پر اس مقدار سے، کہ جتنا تیرا علم ہے۔ درود و سلام بھیج اپنی دائمی بادشاہی کے ساتھ اور درود و سلام ہو اللہ تعالےٰ کی نہ ختم ہونے والی حکومت کی مقدار۔

فرمایا ایک دفعہ یہ درود پڑھنے سے اتنے درودوں کا ثواب ملتا ہے۔ جتنا کہ ایک دلائل الخیرات کے پڑھنے کا ثواب ہو اس کے بعد مجھے ایک خاص تحفہ عطا فرمایا اور معرفت کے خاص رموز بتائے۔

پھر فرمایا۔ اولادِ غوث پاک رضی اللہ تعالےٰ عنہ میں سے کوئی صاحبِ تقویٰ مرشد ملے تو اس سے سند خلافت ضرور لینا۔ اور خرقہ خلافت بھی حاصل کرنا۔ اس سے تمہاری خلافت مکمل ہو جائے گی۔ یہ فرمایا، اور اجازت لے کر چل پڑے۔

چلتے ہوئے فرمایا بیٹا۔ خدا حافظ۔ انشااللہ میدانِ حشر میں ملاقات ہو گی۔ خدا ہمارا انجام بالخیر کرے۔ جاتے ہوئے میرے سر پر دست شفقت رکھا۔ میری کامیابی کی دعا مانگی اور لوگوں کو بیعت کرنے کی اجازت دی اور نہایت تیز رفتاری کے ساتھ مسجد سے باہر چلے گئے۔ میں بھی دوڑتا ہوا صحنِ مسجد میں آگیا۔ تقریباً مسجد سے سو قدم کے فاصلہ تک وہ میری آنکھوں کے سامنے رہے۔ پھر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں یہ نہ سمجھ سکا کہ چٹیل زمین کی ہموار سطح سے وہ کس طرح گم ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید فضا میں گم ہو گئے ہوں۔

آپ کی اس کرامت نے میرے وہ ظنون دور کر دیئے جو ہمیشہ میرے ذہن میں چھائے رہتے تھے کہ مردانِ خدا فضاؤں پر چلتے ہیں۔ مردانِ خدا کے لیے زمین سکڑ جاتی ہے اور اس طرح ان کے فاصلے مختصر ہو جاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

# انتیسواں باب

## والد بزرگوار کا وصال

والد بزرگوار علیہ الرحمتہ کے ان پند و نصائح عارفانہ کے بعد میں نے طریقت قادریہ کے مطابق ریاضت شروع کر دی۔ اگرچہ ابتداءً تسلسل کے ساتھ ریاضت کو جاری نہ رکھ سکا۔ تاہم گاہے گاہے اس ترتیب پر کاربند رہنے کی کوشش کرتا رہا۔ بعض دفعہ قلق و اضطراب کی فروانی مجھے بے چین کر دیتی۔ یہ قلق و اضطراب ریاضت میں کسی جھلک کے ہویدا ہو کر بند ہو جانے پر واقع ہو جاتا ہے۔ میں نے اس قلق و اضطراب کا ذکر والدِ بزرگوار سے کیا۔ آپ نے فرمایا۔ راہِ حق میں سالک پر واقع ہونے والا قلق واضطراب توفیقات سلوک سے ہے۔

یہ اللہ کا وہ فضل و کرم ہے۔ جو اجرائے بندگی پر وارد ہوتا ہے۔ جس طرح جاری پانی کا اٹکنا، اچھلنا، پھسلنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح متقیانہ ریاضت کے اجرا میں روحِ سالک اپنے جسم باطن کے نشیب و فراز سے گذرتے ہوئے اٹکتی، اچھلتی، پھسلتی ہوئی قلق و اضطراب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جس کا منشا سراغِ حقیقت ہوتا ہے۔

کسی امید کے ابھرنے پر فوراً ناامیدی قلق و اضطراب کا ذریعہ بن

جاتی ہے۔ سالک راہ کو جب ایسا قلق و اضطراب میسر آ جائے۔ تو ایسے عالم میں اس کو اپنی طلب بندگی کو مزید تیز کر لینا چاہیے اور وہ اصولِ بندگی کے مطابق جادۂ عشق پر اپنے قدم تیز کر لے۔

قلق و اضطراب حصولِ مقصد کی خاطر بطون میں انگڑائی لے کر بحر باطن کو تموج کے ساتھ مد و جزر دیتا ہے اور بار بار مد و جزر سے باطنی طلاطم میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس سے سفینۂ بندگی ہچکولے لے لے کر سالک راہ کو مشقتِ منزل کا عادی بنا دیتا ہے۔ جیسے بحری سفر میں ہچکولوں کا آنا ضروری ہے۔ ایسے ہی بحرِ روحانیت کے مسافروں کو سختیٔ منزل جھیلنے کا عادی بنانے کے لیے یہ قلق و اضطراب ایزادِ عمل کے لیے بصورت توفیق عطا کیا جاتا ہے۔

= ۱۹۴۲ء میں والد بزرگوار نے اس عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف رحلت فرمائی۔ ۱۴ فروری ۱۹۴۲ء بوقت صبح نماز فجر کے بعد آپ مجلس میں پند و نصائح فرما رہے تھے۔ کہ پیغام اجل آ پہنچا۔ چند لمحوں میں آپ نے جامِ وصال نوش فرما لیا۔ =

میں اپنے گھر موجود نہ تھا۔ قریب ہی دیول شریف کی بستی میں اپنے ایک دوست محمد حنیف عباسی کے گھر تھا۔ والد بزرگوار کے وصالِ مبارک کی خبر سن کر بے حد ملول ہوا۔ گویا ایک کوہِ الم مجھ پر ٹوٹ پڑا اور غم نے نڈھال کر دیا۔ سخت اضمحال و پریشانی کے عالم میں میں اپنے مرشدِ اول والد بزرگوار کی جانب بے تابیٔ غم کے عالم میں دوڑتا ہوا آیا۔ آپ کو موت کے جہان میں ساکت و صامت پایا۔ بس اللہ تعالے نے جتنا غم دینا تھا وہ دیا۔ داغِ مفارقت نے بے کل کر دیا۔

مگر غم دینے والا ساتھ ساتھ صبر و استقامت بھی عطا فرماتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں ایسی محبوب ترین متاعِ زیست کے لٹ جانے پر خدا جانے کتنی جانیں ہلاک ہو جاتیں۔ مگر قانونِ قدرت ایسے اغمام کے ورود پر اپنا دستِ تائید اہلِ غم کی طرف بڑھا دیتا ہے۔ جس سے لوگ ایسے نازک ترین حالات کا سامنا کر لینے کی ہمت پا لیتے ہیں۔

بڑا غم ہوا اور سخت غم کی حالت میں دل نے آواز دی کہ حبیب کبریا علیہ الصلوۃ والسلام کے بظاہر وصال کے وقت اہل بیت اطہار اور صحابہ کبار رضوان اللہ تعالے علیہم اجمعین اور بالخصوص سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالے عنہ کو سخت ترین غم واندوہ کی حالت میں سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے بروقت کتاب اللہ کے حوالہ سے نصیحت فرمائی اور اس حقیقی نصیحت سے احباب و اعزا کے تسلی و تشفی پا لینے والی حالت پر غور کر اور صبر کر۔ سیّد الکونین علیہ الصلوۃ والسّلام کے وصال مبارک کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ اور دل کو تشفی ہوئی۔

انا للہ وانا الیہ رجعون پڑھا۔

اسی دن آپ کی تدفین ہوئی۔ جامع مسجد کے چالیس قدم کے فاصلہ پر آپ کا مزار مبارک بنایا گیا۔ آپ نے اپنے وصال مبارک سے دو ہفتے قبل ایک بھری مجلس میں فرمایا کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اللہ تعالے مجھے جلد ہی اپنی طرف بلانے والے ہیں فرمایا۔ مجھے اپنے جسم سے بڑی حیا آتی ہے۔ خدا مجھے ایمان کے ساتھ آسان موت دے۔ اور مجھ بندہ عاجز کی میت کا پردہ رکھے اور میری میت کو اور میری روح کو خفت و ندامت سے بچائے۔ خدا قبر کے حساب میں آسانی کرے اور حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

کی شفاعت اور نظر کرم نصیب ہو اور وصیت فرمائی کہ میری قبر مسجد سے چالیس قدم کے فاصلے پر بنائی جائے۔

فرمایا۔ میں نے گذشتہ شب ایک خواب دیکھا کہ ایک پہاڑ اچانک مجھ پر گر گیا۔ پھر یہ واقعہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور کسی مجلسِ خاص میں مجھے ایک خوبصورت برتن میں کچھ بابرکت لوگوں نے کھانا کھلایا۔ میں نے اس کو تناول کیا۔ مگر وہ کھانا اتنا لذیذ تھا کہ میں یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ اس دنیا میں اتنا لذیذ کھانا میّسر آسکے۔

فرمایا۔ اس خواب کی تعبیر غالباً یہی ہے کہ اچانک مجھے جام موت نوش کرنا ہو گا اور میں جلد ہی تم سے رخصت ہو جاؤں گا۔ اس وقت آپ کے پاس متعدد مستورات اور مرد تعویذات لینے کی غرض سے موجود تھے۔ اس مجلس میں آپ نے فرمایا۔ اے میرے ہم نشینو! میں تم میں اپنا وارث چھوڑے جا رہا ہوں۔ انشاءاللہ یہ تمہاری حسب منشا خدمات دینی انجام دے گا۔ پھر مجھے بلایا اور گلے لگا کر فرمایا۔ کہ بیٹا! میں تم پر راضی ہوں۔ اللہ تعالےٰ کی ذات تم پر راضی ہو۔ اس کے رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام تم پر راضی ہوں۔ بیٹا دین کی خدمت کرنا۔ تقویٰ پر اپنے عمل کو جاری رکھنا۔ عاجزی کو وراثت جاننا۔ سوائے عاجزی کے انسانی بدن پر کوئی لباس پورا نہیں اتر سکتا۔ توبہ کو ورد زباں رکھنا۔ اپنے ہم وطنوں سے وفا شعاری کے ساتھ مروت کا ثبوت دینا۔ اپنی ماں کی خدمت کرنا۔ تمہاری ماں فاضلۂ دین اور صالحہ ولیہ ہے، اس سے فیض پانا۔

اس کے بعد میری والدہ بزرگوارہ کو اپنے پاس بلایا۔ فرمایا۔ سب کا خدا حافظ ہے۔ شاید میں عنقریب تم سے رخصت ہونے والا ہوں۔ اپنی

خاص امانتیں اس بچے کو عطا کر دینا۔ بچوں کو اسلام پر قائم رہنے کی تلقین جاری رکھنا۔ اگر نیک ہوئے تو عاقبت میں کام آئیں گے۔

پھر فرمایا۔ میرے ہم نشینو! میں تم لوگوں میں ایک مخفی درویش باللہ تھا۔ میں عارف باللہ ہوں۔ میں نے تمہارے لیے مقبول دعائیں کی ہیں۔ میں نے اسلام کا پیغام تم تک پہنچایا۔ میں سلسلۂ قادریہ، سلسلۂ چشتیہ، سلسلۂ نقشبندیہ کا اجازت یافتہ سالک ہوں۔ آپ نے بھری مجلس میں اظہار فرمایا۔ کہ میں بفضل اللہ تعالے سالک راہِ حقیقت ہوں۔ میری ظاہری غربت، افلاس، سادگی میرے یارانِ سفر ہیں۔

فرمایا۔ مشکل کشا صرف اللہ کی ذات ہے۔ مگر وہ اپنے بندوں کے توسل کو اپنے اور مانگنے والوں کے درمیان بہتر ذریعہ قرار دیتا ہے۔ سوال کرنے والے سائلین اور اپنے درمیان انبیاء و صدیقین شہداء و صالحین کے وسائل سے مانگنے پر زیادہ راضی ہوتا ہے۔ میں بالوسائل دعا مانگنے والا درویش ہوں۔ میرے اب وجد درویش باللہ ہو گزرے ہیں۔

فرمایا۔ انسان کا زندہ وجود بھی مٹی ہے اور مرنے کے بعد بھی وہ مٹی ہے۔ کار آمد چیز ایمانِ باللہ ہے۔ جو اسلامی روح پر حاصل ہوتا ہے۔ وہی روح کو زندگی میں اللہ کی بندگی کا احساس دلا کر بندۂ خدا ہونے پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ روح مرنے کے بعد مر نہیں جاتی۔ بلکہ زندہ رہتی ہے۔

روح کے لیے زندہ و مردہ وجود کا کوئی امتیاز نہیں۔ وہ حکم خدا سے داخلِ وجود رہ کر کچھ مدت زندہ رکھتی ہے۔ اور حکم خدا کے ساتھ بدن انسانی سے جدا ہو جاتی ہے۔ مگر روح پر مردہ ہونے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ وہ دنیوی زندگی میں زندہ رکھنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اور بدنِ خاکی سے نکل جانے پر

موت جسم کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس واسطے زندگی و موت میں ایمانی تصرف روحِ ایمانیہ پر ہوتا ہے۔ قبل از وصال ہو یا بعد از وصال۔ روح نے ازل کے دن اقرار کیا۔ روح ہی نے اللہ کے حکم سے جسم کو حرکتِ زیست دی اور روح کے نکل جانے پر جسم کی حرکت بند ہوتی ہے۔

روح کا تعلق عالم امر سے ہے۔ اور بدن کا تعلق عالم خلق سے ہے۔ جو ثقیل ہے۔ اور اپنے ثقیل ہونے کی بنا پر وہ نیچے زمین خاک میں مل جاتا ہے۔ اور اہل اللہ کی روح لطیف ہونے کی بنا پر آسمان بالا پر چلی جاتی ہے اور غیر مقبول لوگوں کی روحیں سجیں میں قید کر دی جاتی ہیں۔ بوجہ قید و بند سجین کی روحیں غیر متصرف ہوتی ہیں۔ مگر علیین کی روحیں بوجہ ایمان کے آزاد ہوتی ہیں اور صاحب تصرف بھی ہوتی ہیں۔

وہ جب دنیوی زندگی میں بقید جسم ہوتی ہیں۔ تو بھی کشف و کرامات اولیاء اللہ کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ اور جب وہ علیین میں چلی جائیں تو ان کی آنکھیں ایماندار ہونے کی بنا پر بالکشف و کرامات اس لیے متصرف ہوتی ہیں کہ روح ہی صاحب عقل و خرد ہوتی ہے۔

فرمایا۔ واللہ۔ باللہ۔ تم تاللہ! میں گزرے ہوئے اولیائِ عظام کے تصرفات کا بارہا مشاہدہ کر چکا ہوں۔ اس کے بعد فرمایا کہ اولیاء اللہ کے قبور پر جانا موجب خیر ہے۔

شرعی طریق عمل کے مطابق قبور پر جانا، ان کے لیے دعائے مغفرت کرنا ان کی قبور پر بغرض حصول ثواب جانا موجبِ برکات ہے۔ اس سے ایمان کو تقویت ملتی ہے اور استفادہ اللہ کی رضا سے حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالٰے اپنے ولیوں کی حیات میں اور بعد از وصال بھی ان کی یاد و

تقریب سے راضی ہوتے ہیں۔ پھر یہی رضا قبولیتِ دعا بن جاتی ہے۔ مگر وسیلہ سے مراد نیک لوگوں کی نیکیاں ہوتی ہیں۔ بااعتبار تقویٰ ان کا وجود معتبر ہوتا ہے۔ نہ کہ بااعتبار وجود۔

اولیاء اللہ جن نیکیوں کے موصوف ہوتے ہیں۔ وہی نیکیاں ان کے موصوف ہونے کا اعتبار ہوتی ہیں۔ لہذا اولیاء اللہ کی قبور پر جا کر ان کے نیک اعمال کے اعتبار کی روشنی میں ان کے متعلق مراقبہ کرنا چاہیے۔ اور مراقبہ میں صاحبِ مراقبہ اولیاء اللہ کے صفات نیک پر غور کرے تاکہ ان نیکیوں کا موصوف یعنی ولی اللہ نیک اعمال کی معیت میں نیک متصور ہو سکے۔

ولی اللہ جب صفاتِ اسلامیہ کے ساتھ صاحبِ مراقبہ کے قلب و نظر پر اترے گا۔ تو اس کی طبیعت متقیانہ صفات کی طرف رغبت کرے گی۔ یہ ہیئت مجموعیہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا اچھا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ جس سے دعا کو بالوسیلہ مستجاب ہونے کا موقع مل سکتا ہے فرمایا۔ اولیااللہ کے مزارات پر بغرضِ ثواب جانا چاہیے۔ جو بڑا پرتاثیر طریقہ ہے۔ بشرطیکہ قبور پر رکوع سجود نہ کیا جائے۔ اور خلافِ امورِ دین کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہونے پائے جس سے اہل قبور کی روحیں پریشان ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ ناراض ہو۔

بہتر طریقہ وہی ہے جو شریعت نے آدابِ قبور کے لیے بتایا ہے۔ اور صوفیائے اسلام نے شریعت کے مطابق جو آداب مقرر کیے ہیں۔ یعنی باوضو ہو کر زیارات اولیا اللہ پر بغرضِ دعا مغفرت جائے۔ اور اسلام علیکم یا اہل القبور کہہ کر فاتحہ خوانی کرے اور سورۃ اخلاص متعدد بار

پڑھ کر ایصالِ ثواب کرے۔ پھر اہل اللہ کے مزار کے سامنے دو زانوں ہو کر نہایت ادب کے ساتھ ان کا تصور اس طرح کرے۔ کہ یہ لوگ اللہ کی اطاعت و محبت میں سرشار رہے ہیں۔ انہوں نے رات دن اپنی کروٹوں پر اپنے معبودِ برحق کی عبادات سر انجام دیں۔ یہ لوگ عارفانِ باللہ تھے۔ انہوں نے راہِ حق پر وصول حق کے لیے موت پائی ہے۔ ان کے وجود قبور میں علی وجہ تقوی مسعود و محبوب اور محفوظ و مامون ہیں اور یہ تصور کرے کہ۔ ولی اللہ کی موت سے ولایت نہیں مر سکتی۔ بلکہ ولایت دینوی میں اور ولایت مابعدِ الحیات ہر دونوں حالات میں صورتاً اور معناً ولایت ہی ہوتی ہے۔ وہ میدان بندگی میں ریاضت کرتی ہے اور معنویت میں اللہ تعالٰے کی خوشنودی حاصل کرتی ہے اور بعد از وصال بھی اسی جسم خاکی کے ساتھ وہ سپردِ خاک ہوئی۔ جس پر متقی ولی اللہ ہونے کا اطلاق ہوتا تھا اور حسابِ قبر بھی اس کے ولی اللہ ہونے کے مطابق ہی ہوا ہوگا اور منازل برزخ بھی بر سبیل ولایت ہی طے ہوں گے۔ وہ زندگی میں بھی ولی اللہ تھے اور وصال کے بعد بھی ولی اللہ ہیں۔ در حقیقت ولایت کی صحیح جزائے خیر مرنے کے بعد ہی ملتی ہے اور یہ کہ ولیوں کی سب ریاضتیں موت کے لیے اور انجام کار جزائے خیر پانے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ لہذا اولیا اللہ زندگی اور موت اور مابعد الموت کے بہر حال مقبولانِ بارگاہ الہی ہوتے ہیں۔

علمائے صالحین اور اصفائے صالحین دونوں کے مقابر پر متذکرہ تصور کے ساتھ مراقبہ کرنے میں ایمان کو تقویت و طمانیت ملتی ہے۔ اور عبادات پر تحریص میسر آتی ہے۔

فرمایا۔ مابعد کے عجمیت پسند لوگوں نے آداب قبور میں خلافِ

اسلام افراط و تفریط کے ساتھ کافی ردو بدل کر دیا۔ جس کی وجہ سے عوام نے قبور کو وہ مقام دے دیا۔ جس کے دیکھنے سے یہ شبہہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ جیسے کوئی بت پرست قبر کی پوجا کر رہے ہوں۔

یہ طریقہ شعائر اسلام کے خلاف ہے اور ایک گروہ نے اجتناب زیارات و قبور پر اتنا زور دیا۔ گویا کہ مرحومین سے انہوں نے قطع تعلق کر لیا ہو۔ ان دونوں حالات کی اسلام میں کوئی سند نہیں۔ نہ ہی ترک زیارت قبور کے لیے کوئی حکم ہے اور نہ ہی قبور پر رکوع و سجود کا کوئی حکم ملتا ہے۔

فرمایا مجددِ الفِ ثانی رحمتہ اللہ علیہ جنہوں نے اکثر فیصلے بر بنائے مکاشفات والہاماتِ عارفانہ کیے ہیں۔ آپ نے جب اپنے زمانہ کے بعض بے اصول لوگوں کا شرعی روشنی میں جائزہ لیا۔ تو ان کو ہنود کے طرزِ عبادات پر صنم پرست پایا۔ جیسے ہنود اور بدھ مت وغیرہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اصنام کے ذریعہ خدا ملتا ہے۔

چنانچہ وہ مرنے والی شخصیات کے بت بنا لیتے ہیں اور ان کو سجدہ کرتے۔ اور ان سے حاجتیں مانگتے ہیں۔ اگر یہی وطیرہ مسلمان عوام نے بھی اختیار کر لیا تو اہل ہنود اور مسلمانوں کی عبادات میں مغائرت اور امتیاز حاصل کرنے کے لیے دقت پیش آئے گی۔ چنانچہ ان حالات کے رد عمل کے لیے آپ نے وحدت وجود کے عقیدہ کی اعلانیہ تردید کی۔ چونکہ اس وقت یہی مسئلہ مسلمانوں کو قبر پرستی کی طرف مائل کر رہا تھا اور اکثر اہلِ عقیدہ یہی گمان کرنے لگ گئے تھے کہ خدا حلول کرتا ہے۔

# باب تیسواں

## عقیدۂ حلول اور وحدت الوجود کی تردید

اسلام عقیدہ حلول کی تردید کرتا ہے۔ اسلام تو خدا کو عرض و جسم ہونے سے منزہ قرار دے کر اسے وراء الورا ثابت کرتا ہے اور یہ کہ اسلام خدا کو ہر جگہ موجود کر کے اسے ہر قسم کی تلویثات سے منزہ قرار دیتا ہے۔ یہ کہ اللہ تعالےٰ مومن کے دل کو اپنی قرار گاہ بنانے کے بعد بھی غیر حادث ہے اور مومن اللہ کو اپنے قلب و نظر میں پا کر بھی اپنے آپ کو حادث جانتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز میں رہ کر بھی منزہ عن التلویث ہے۔

اس طرح اسلام نے خدا کا تقرب حاصل کرنے کے طریقے بتائے ہیں نہ یہ کہ اللہ تعالےٰ حاول کرتا ہے۔ اس وقت کے مغلوب التفریط لوگ بزباں خود تو یہ کہتے تھے کہ ہم ان قبور کو سجدہ نہیں کرتے۔ بلکہ ہم تو ان قبور میں اللہ ہی کو پاتے ہیں یعنی قبور سجود نہیں۔ بلکہ مسجودء الیہ کا مقام رکھتی ہیں۔ اور اسلام میں مسجودِ الیہ کا مرتبہ و مقام اللہ تعالےٰ نے کعبتہ اللہ کو دے رکھا ہے۔

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کعبتہ اللہ مسجود حقیقی نہیں۔ بلکہ مسجودِ الیہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر یہ تخصیص عام ہو جائے تو اس میں کعبتہ اللہ کی

اہانت ہوتی ہے۔ اور بظاہر یہ نمونہ ہنود اور دوسرے قسم کے اصنام پرست اور آتش پرست وغیرہ لوگوں کا ہے۔ اور ایسے لوگ بھی بظاہر تو یہی کہتے ہیں۔ کہ ہم تو بتوں کے ذریعہ اللہ تعالےٰ کو پاتے ہیں۔ یعنی یہ بت مسجودِ حقیقی نہیں بلکہ مسجود الیہ ہیں۔

اس طرح اسلامی عقائد اور غیر اسلامی عقائد کا اختلاطِ عمل حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کو سخت ناگوار گزرا۔ آپ نے سرے سے ہی وحدت الوجود کا انکار کر دیا اور مسلمانوں کے عقائد کو بر سبیلِ اسلام اعتدال پر لانے کے لیے آپ نے عقیدہ وحدت الوجود کی بجائے عقیدہ وحدتِ شہود پر اپنی تسلیم و رضا کا با دلیل دعویٰ کیا تاکہ مسلمانوں کے اذہان خارجی تصورات سے ہٹ کر اسلام کے داخلی تصورات پر آجائیں۔ جس سے خدا کے تقرب کا عقیدہ بھی محفوظ و مامون رہ سکے اور مسلمان اللہ تعالےٰ کے بتائے ہوئے طرز عبادات کو اپنانے میں کامیاب ہوں۔ اور اسلامی و غیرِ اسلامی عبادات میں مغائرت کا بھی ثبوت ہو۔

چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کی اس موحدانہ تحریک نے مسلمانانِ عجم کو عجمی تصورات غیر سے نجات دلائی۔ آج تک اسی تبلیغ کا اثر کارفرما ہے کہ مسلمان قبور کی پرستش سے بخوف شرک اجتناب کرتے ہیں۔ ورنہ یہ سلسلہ عام ہو جاتا اور مسلمان علی الاعلان قبور پرست ہو جاتے۔ اس کے بعد بھی زیاراتِ قبور کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔ بلکہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ زیارات قبور کا ولولہ پیدا ہوا۔ مگر باادب اندازِ احترام کے ساتھ زیارت قبور ہوتی رہی۔ فرمایا۔ میں اولیا اللہ کی قبور پر باوضو جاتا ہوں اور فاتحہ خوانی کرتا ہوں اور کلامِ الٰہی پڑھ کر ایصالِ ثواب کرتا ہوں اور ان

کے لیے صدقہ و خیرات کرنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اور میرا ایمان ہوتا ہے کہ اس طرح اولیائے مرحومین کو زیادہ راحت ملتی ہے۔ اور ان کی روحیں زیادہ خوش ہوتی ہیں اور ان کی خوشی ہی وسیلہ قبولیت دعا ہو جاتی ہے۔ برخلاف اس کے اولیااللہ کی روحیں ناراض ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی ناراضگی بجائے قبولیت دعا کے الٹا ناراضگی رب کا موجب بن جاتی ہے اور دعائیں نامقبول ہو کر واپس لوٹا دی جاتی ہیں۔

# باب اکتیسواں

## میرے وصال کے بعد میری قبر پر آنے کے آداب
## پیشین گوئی

میرے وصال کے بعد میری قبر پر آنے کے آداب کی پیشگوئی۔
فرمایا۔ میرے مرشدین نے مجھے یہ بشارت دے رکھی تھی کہ اگر تمہاری قبر پر کوئی مسلمان سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص تین تین بار پڑھ کر دعا کرے گا تو اللہ تعالےٰ اس کو بامراد کرے گا اور اگر تمہاری قبر پر کوئی بغرضِ ایصال ثواب کسی قسم کی خیرات کرے گا۔ تو بھی بامراد ہو گا۔ اور ایسے باادب زائرین اپنی جملہ نیک مرادوں میں کامیابی پائیں گے۔

مگر میں نے بوجہ خوفِ بدعت، اس بشارت کو ہمیشہ صیغۂ راز میں ہی رکھا۔ صرف تمہیں اس بشارت سے آگاہ کرتا ہوں کہ جب میری قبر پر آؤ تو حسبِ توفیق کلام الٰہی پڑھ کر مجھے ایصالِ ثواب کرو اور نقد و جنس کی صورت میں خیرات کرو اور یہ خیرات اہل حق تک پہنچاؤ۔ جس سے میری روح خوش ہوگی۔ اور میرے مرشدین کی بشارت کے مطابق عمل بھی جاری رہے گا۔

چنانچہ حضرت والد بزرگوار کی وفات مبارک کے بعد میں جب بھی

مزار مبارک پر حاضری دیتا ہوں۔ تو حسب استطاعت کلام پاک کا کچھ ختم کر لیتا ہوں۔ اور مزار مبارک پر حاضری دے کر ایصال ثواب کرتا ہوں اور کچھ نقد و جنس کی صورت میں خیرات بھی کر دیتا ہوں۔ میرا دل ایسا کرنے سے مطمئن رہتا ہے کہ میرے والد بزرگوار کی روح مجھ پر خوش ہو رہی ہو گی۔ اس واسطے کہ میں حسبِ فرمائش بجا آوری آداب کرتا ہوں۔

فرمایا۔ میری اولادوں نسلوں میں سے یا عقیدت مندوں میں سے یا کوئی صاحبِ ایمان جب بھی میری قبر پر حاضر ہوں۔ تو طریقہ مسنون سے تغافل نہ برتیں۔ ورنہ میری روح سخت پریشان ہو گی۔

فرمایا۔ میرے اہلِ عقیدت یا تمہارے اہل عقیدت دین کے خلاف کسی مخترع عقیدہ کے ساتھ مقابر اولیاالله پر نہ جائیں۔ اس طریق سے اولیا ناراض ہوتے ہیں۔ اور ان کی ناراضگی گواہ بن جاتی ہے۔

فرمایا۔ زیارت قبور مسنون ہے۔ مگر افراط و تفریط کے لیے نہیں۔ کہ لوگ نماز روزہ، حج و زکوۃ سے بھی بے خبر ہو کر صرف قبور ہی کو ذریعہ نجات قرار دے دیں۔

اولیاالله کے قبور پر باادب حاضری دینے سے الله تعالے مرادیں پوری کرتا ہے۔ سب مسلمان عوام و خواص قبور پر جائیں، حاضری دیں، سلام دیں فاتحہ پڑھیں، صدقات و خیرات کریں۔ مگر آدابِ اسلام کو نہ بھولیں۔ ورنہ وہاں جانے سے نہ جانا بہتر ہے۔ خلافِ آدابِ شریعت مقابر پر اندھا دھند والہانہ کیف و مستی کی طرف لے جانے کا سبب بن سکتی ہے۔ مسلمانوں پر حق لازم آتا ہے کہ وہ نہ صرف قبور پر بلکہ ہر شعبۂ زندگانی میں اپنے حال و قال کو دینی ضوابط کا پابند رکھیں۔ اس لازمہ کی

پابندی مسلمان قوم پر عائد ہوتی ہے۔ نہ کہ غیر مسلمین پر۔

جملہ مکاتبِ فکر علمائے اسلام اور مشائخ عظام پر یہ فرض عائد ہوتا ہے۔ کہ وہ آدابِ قبور اس صالحانہ اندازا سے بیان کریں کہ عوام ان آدابِ شرعیہ کا مفہوم کر لینے میں آسانی پائیں اور آداب دین کی روشنی میں قبور سے روحانی استفادہ کر سکیں اور یہ ذہن نشین کر لیں کہ عوام و خواص کی زیارات صرف عبرت و ثواب کا ذریعہ ہیں۔

فرمایا۔ اسلام میں ہر منت اللہ تعالےٰ کے نام پر مانی جاتی ہے۔ چاہے وہ عبادات کی صورت میں ہو۔ چاہے صدقات و خیرات کی صورت میں ہو۔ اگر اولیا اللہ کے نام منت مانی جائے تو بھی نیت یہ ہونی چاہیے۔ کہ اللہ کے نام پر ہی کسی ولی اللہ کے لیے نقد یا جنس کی منت مانے۔ یہ کہ صدقہ و خیرات کرے۔ یہی طریقہ منت افضل ہے۔

چونکہ اس میں اللہ تعالےٰ کی تائید کو شامل کیا جاتا ہے۔ فرمایا۔ قرآن و حدیث کے ذریعہ جتنے صدقوں کا ثبوت ملا ہے۔ وہ سب اللہ تعالےٰ کے لیے ہیں۔ اور سب منتیں عہد باللہ سے متعلق ہو کر نذور کم بنتی ہیں۔ یعنی تم اپنی ان منتوں کو پورا کرو۔ جو تم نے اللہ تعالےٰ سے استمداد حاصل کرنے کے لیے مان رکھی ہیں۔

اگر جملہ منتوں کا تعلق اللہ تعالےٰ سے توڑ لیا جائے۔ تو اسلام میں ان پر منت کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ فرمایا۔ مجھے سمجھ نہیں آسکتی کہ بعض لوگ منتیں ماننے کے وقت اللہ تعالےٰ کی ذات کو کیونکر فراموش کر دیتے ہیں اور بعض لوگ سرے سے ہی منتوں کا انکار کرتے ہیں۔

فرمایا۔ اعتدال کا یہی راستہ ہے۔ احتیاط کرو اور نہ بت پرست بنو۔

چنانچہ میں نے ان نصائح کے تابع اللہ تعالے کے حضور یہی دعا کی ہے۔ کہ وہ مجھے عاجزانہ بندگی پر ثابت قدمی نصیب کرے اور میں اپنے والد بزرگوار کے ان اسلام پسندانہ اقوال کی روشنی میں راہ فقر پر تادم واپسیں بطریق اسلام سفر جاری رکھ سکوں۔ اللہ تعالے مجھے اور تمام مسلمانوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ امین۔

# بتیسواں باب

## خاندانی طور پر غیر آسودہ حالی

= اس کے بعد میں نے حسب الارشاد اور حسبِ تفویضات اسلامی تعلیمات کی روشنی میں راہ سلوک پر تدریجاً ریاضت دینیہ کے ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ والد بزرگوار کے وصال مبارک کے بعد خاندانی غیر آسودہ حالی اور باپ کی جدائی نے اگرچہ مجھے بے سہارا کر دیا تھا۔ مگر بباطن میرے دل میں آپ کی تعلیمات نے اتنا توکل پیدا کر دیا تھا۔ کہ میں بہرحال اللہ تعالٰے کی ذات پر ہی کامل بھروسہ کر سکوں اور ہر آنے والی تکلیف کو مرضیات الٰہی پر محمول کر سکوں۔ یہ کہ اللہ تعالٰے کا کوئی فیصلہ خالی از حکمت نہیں ہو سکتا۔ یقیناً والد بزرگوار کا وصال اللہ کی مرضی کے مطابق ہوا۔ دورانِ ریاضت ہر لمحہ والد بزرگوار کے لیے دعائے مغفرت کرتا رہا ہوں۔ اور اس دعا کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ خداوند تعالٰے سب مسلمانوں کو اپنے والدین کا وفادار اور فرمانبردار کرے۔ اور سب کو نیک ماں باپ کی عاطفت نصیب کرے۔ آمین۔ =

= آپ کے وصال مبارک کے بعد ایک عظیم فریضہ جو میرے ذمہ تھا۔ وہ میری والدہ ماجدہ کا وجود مسعود تھا۔ والدہ بزرگوارہ کے سایہ عاطفت میں مجھے راہِ سلوک پر ریاضت کا سلسلہ جاری رکھنے میں زبردست تائید حاصل

ہوئی۔ آپ بوجہ ضعیف العمر ہونے کے بے حد نحیف تھیں۔ بمشکل تمام مہمانوں سے کلام فرماتیں اور ان سے حسبِ استطاعت مروت فرماتیں۔ آپ نے مرض الموت تک لوگوں کی دینی خدمات انجام دیں۔ اور اپنے پندو نصائح کو جاری رکھا۔ مجھے اوباً بار بار منازلِ سلوک پر نئی ریاضت کے لیے والدہ ماجدہ سے اجازت لینی پڑتی اور آپ ایسی اجازت پر اس قدر زیادہ مسرور ہوتیں گویا آپ کو کوئی نعمت مل گئی ہو۔

والد بزرگوار کے وصال کے چالیس یوم بعد میں نے والدہ ماجدہ کی خدمت بابرکت میں باادب و احترام حاضری دی۔ اور اللہ تعالےٰ کی راہ میں میں مفوضہ اجازت کے مطابق ریاضت کرنے کی اجازت لینے سے قبل یوں عرض کی۔ اماں جان! میری یہ قلبی تمنا ہے کہ میں آپ کی قدم بوسی کا دائمی شرف پاسکوں۔ آپ مجھے بار بار جنگلوں، بیابانوں میں الگ تھلگ رہ کر ریاضت کرنے کا حکم فرماتی ہیں۔ میں نافرمانی بھی نہیں کرسکتا۔ مگر اماں جان میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ التماس کرتا ہوں کہ مجھے آپ صرف اپنی خدمت کے لیے مامور فرمالیں۔ میں بس پنج گانہ نماز اور تلاوت قرآن کریم اور دوسرے چند وظیفوں کے ساتھ آپ کے تقرب میں آپ کی خدمت چاہتا ہوں۔ آپ کا یہ بڑا احسان ہو گا۔ کہ مجھے اپنے آپ سے کہیں دور ریاضت کے لیے نہ بھیج دیں۔

میں اپنی ضعیف اور بزرگ والدہ کے جملہ معمولات میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ یہاں تک کہ روٹی پکاتا تھا۔ چائے بناتا تھا۔ جھاڑو دیتا تھا۔ اور آپ کے کپڑے بھی دھویا کرتا تھا اور برتن وغیرہ بھی صاف کرتا تھا بایں وجہ آپ مجھ سے بہت راضی تھیں۔ میں نے خدمت کرنے کا موقع طلب کیا کہ آپ

مجھے خدمت کے لیے اپنے پاس رکھیں۔

میری اس التماس کے بعد آپ نے تازہ وضو کیا۔ اور دو رکعت نماز نفل ادا کیئے۔ اور دورد شریف کا وظیفہ فرمایا اور نہایت استقامت ایمانیہ کے ساتھ مجھے مخاطب فرمایا۔

بیٹا! میں اپنے ضعف جسمانی یا ضعفِ مالی یا ذرائع کی تنگی سے قطعاً گھبرانے والی نہیں ہوں۔ یہ اللہ تعالے کا مجھ پر عین فضل و کرم ہے کہ میں ہر حال شاکر باللہ ہوں۔ اس سے پہلے جو کچھ مہربانیاں ہوئیں۔ وہ سب اللہ تعالے کے فضل و کرم کا نتیجہ تھیں۔ اب بھی جو کچھ حالات ہیں۔ اللہ ہی کے فضل و عنایات کا نتیجہ ہیں۔ اور آئندہ بھی جو کچھ ہو گا۔ انشاالله بہتر ہو گا۔

مجھے نہ تو اپنی ذات پر بھروسہ ہے۔ اور نہ ہی بچوں پر اور نہ کسی دوسرے سہارے پر، وجود ہوں، بچے ہوں یا دوسرے سہارے ہوں، سب اللہ کی دین ہوتے ہیں۔ یہ بھی کسی کی ذاتی کمائی نہیں ہوتے۔ لہذا تم میری کیا مدد کرو گے۔ جب تم بے بسی اور بےچارگی کے عالم میں میرے بطن میں تھے۔ وہاں میری اور تمہاری نگہبانی کس نے کی تھی تم کو معصومیت میں کس نے پالا۔ مجھے تمہاری معصوم طفولیت میں کس نے خدمت کی توفیق دی۔ اب تک میری اور تمہاری کفالت کون کرتا رہا ہے۔

فرمایا۔ وہی ایک اللہ ہے۔ جو سارے جہانوں کا بادشاہ اور مخلوقات کا پالنے والا ہے۔ فرمایا۔ دنیا کی زندگی اس کی دین ہے۔ جس پر موت اور قیامت حق ہے۔

میں اپنی قسمت پر شاکر ہوں۔ سوائے امدادِ حق کے کسی امداد کی طالب نہیں ہوں۔ تم اگر مجھے خوش کرنا چاہتے ہو۔ تو میری ریاضت نہ کرو۔ میرے، مالک و مولا کی ریاضت کرو۔ جو میرا اور تمہارا اور سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔

تم اللہ کی راہ میں ریاضت کرو گے تو اس کی نیک تاثیرات مجھے اس ضعیفی میں اس طرح ملیں گی۔ جس طرح طفولیت میں اللہ تعالیٰ نے میری تاثیرات پادرانہ سے تمہاری مدد فرمائی تھی۔ میں نے اللہ تعالےٰ کے رحم و کرم سے تمہیں پالا تھا۔ تم اسی مہربان کی اطاعت کے ساتھ میری کبر سنی میں میری روح کو اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کے ساتھ پالو۔ اور خوش کرو۔

بیٹا! اس میرے خاکی وجود کو کب تک سہارا دو گے۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ تم بظاہر سہارا دینا چاہو گے۔ مگر نہ دے سکو گے۔ کیا فائدہ ایسی خدمت کا، جو صرف وجود دنیا ہی سے متعلق ہو۔

فرمایا۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اولاد کو اپنے والدین کی خدمت کا نیک صلہ ملتا ہے۔ مگر میرے نزدیک والدین کے لیے خدا کی بندگی کرنے والی اولاد سے بہتر کوئی دوسرا صلہ نہیں ہو سکتا۔ جو اولاد اللہ تعالےٰ اور اس کے حبیب اکرم علیہ الصلوۃ والسّلام اور اسلام کی وفادار ہو، وہی ماں باپ کی بھی وفادار ہو سکتی ہے۔ فرمایا۔ میرے پاس چند ایسی اور بھی اجازت ہیں، جو اللہ کی دین ہیں۔ اور میرے پاس امانت ہیں۔ وہ بھی تمہیں اللہ کے نام پر تفویض کرتی ہوں۔

پھر مجھے الگ کر لیا۔ اور بہت سی بابرکت تفویضات سے نوازا۔

فرمایا یہ تفویضات جملہ قسم کی خارجی مداخلت سے آزاد ہیں۔ یہ اجازتیں اللہ تعالےٰ کی کامل بندگی حاصل کرنے کے لیے قرآن مجید اور احادیثِ شریفہ سے اخذ کی ہوئی ہیں جو اپنے اجداد سے مجھے ورثہ میں ملی ہیں۔

فرمایا بیٹا! میں اجازت دیتی ہوں۔ جاؤ دریاؤں پر ان وظائف کی ابتداء کرو۔ فرمایا میرے نزدیک تم علم دین سے بیگانہ ہو۔ تم پر عالم دین کا یا عارفِ باللہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اور مجھے سب سے بڑا خدشہ یہی ہے کہ تم کہیں بغیر علم دین کے عالم دین اور بغیر ریاضتِ شرعیہ کے عارفِ باللہ ہونے کے مدعی نہ بن بیٹھو۔ خدا تمہیں ہر حال اپنا بندہ عاجز رکھے۔ جب علم دین مل جائے تو اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جاہل گردانو۔ اور جب عارف باللہ ہو جاؤ تو اپنے آپ کو اللہ کے سامنے پر تقصیر جان کر معترف بنو۔

یہی نقطہ ہے، جو راہِ بندگی میں سب سے زیادہ کام آتا ہے۔ جس نے اس راز کو پالیا۔ اس نے خدا کو پالیا۔

اسلام میں فقر کے چند معانی ہیں۔ ایک فقیر بندگی کا صحیح مظہر ہوتا ہے جس سے سالک اللہ کے درِ اقدس کے سوا دوسرے در کی احتیاج نہیں رکھتا۔ یہی اسلام کا داخلی فقر ہے۔ جس کی بنیاد سرورِ کونین علیہ الصلوۃ والسّلام نے الفقر فخری کے ساتھ ڈالی۔

حضور علیہ الصلوۃ والسّلام کا فقر کتاب و سنت کے ساتھ ظاہر ہے کہ آپ نے اپنے خدا کے سامنے انتہائی عبودیت کا مظاہرہ فرمایا۔ اور عالمگیر سلطنت کے مالک ہو کر بھی فقر ہی کو ظاہری جاہ و تمکنت پر ترجیح دی۔ جس فقر کی معیت میں آپ درِ خدا پر آخری بندگی کے ساتھ ساجد رہے اور

اسی فقر کی معیت میں آپ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ میں مسکینی کو پسند کرتا ہوں۔ مجھے مسکینوں میں زندہ رکھ۔ میری موت مسکینوں میں ہو اور میرا حشر بھی مسکینوں کے ساتھ ہو۔ اس مسکینی اور فقیری کے صحیح معنی احتیاج غیر اللہ سے قطعی طور پر آزاد ہو کر ایک درِ اقدس کی بندگی مراد ہے۔

ایک فقر اطاعت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام میں نمود پاتا ہے۔ وہ فقر اہل بیت اطہار اور صحابہ کبار رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کا فقر و غنا ہے۔

ایک فقر علمائے صالحین امت کا ہے۔ جو خدا اور رسول اور صحابہ کی اطاعت میں نمود پاتا ہے۔ اس فقر کی آگے چل کر دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک علمائے صالحین جو علمائے ظواہر کہلاتے ہیں۔ مگر ان میں خشیتُ اللہ اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ ماسوااللہ کی احتیاج سے آزاد ہو کر صرف اللہ تعالےٰ پر ہی کامل بھروسہ کرتے ہیں اور اعلائے کلمۃ الحق کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ کسی دوسرے قسم کے ایسے مشاغل کی طرف عملاً رجوع نہیں کرتے کہ تبلیغ دین میں حرج واقع نہ ہو۔ دوسری شاخ ان علمائے اسلام کی ہے۔ جو علم دین کی روشنی میں تزکیۂ نفس کرتے ہیں۔ اور عرفانِ نفس کے بعد عرفان باللہ کے مقام ذی برکت پر فائز المرام ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ایسے لوگوں کا بیشتر وقت تزکیۂ نفوس میں صرف ہو جاتا ہے۔ مگر کامیابی کے بعد یہ لوگ علوم دینیہ کی فضلیت کے ساتھ ساتھ کرامات اعمالِ اسلامیہ کے نتائج سے بھی بہرہ ور ہو کر دین کے اس وقفہ کو بھی پورا کر لیتے ہیں جو دورانِ تزکیہ میں پڑ گیا تھا۔

البتہ ناکامی کی صورت میں انہیں ان وقفہ جات پر توبہ کرنی پڑتی ہے۔ مگر ناکامی کی حالت میں بھی اللہ تعالےٰ ان کی ریاضت کے ثواب سے ان لوگوں کو محروم نہیں فرماتے۔ کامیابی و ناکامیابی اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ مگر اللہ تعالےٰ کسی کی نیک محنت کو ضائع نہیں کرتے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔

یعنی اللہ تعالیٰ کسی کے نیک اعمال کی نیک جزا ضائع نہیں کرتے۔

فرمایا۔ جو فقر محض لبادۂ فقر تک محدود ہو۔ وہ مصنوعی فقر ہے۔ صرف لباسِ فقر پہن لینے سے کوئی فقیر بن سکے۔ تو سب دنیا داروں کے دروازوں پر دریدہ حال سائل فقیر، سالک باللہ کہلائیں۔ مگر ایسا نہیں۔ اہل دنیا کے دروازوں کے سائل فقیر محتاج غیر اللہ ہیں اور اللہ کے فقیر صرف اللہ کے محتاج ہو کر غیر اللہ کی احتیاج سے قلباً، ضمیراً و ایماناً آزاد ہو جاتے ہیں۔ اس آزادی سے انہیں احکاماتِ ربانی کی طرف کامل توجہ کے ساتھ مصروف بندگی ہو جانے کا موقع مل جاتا ہے۔ اور ان کی رگ حیات کی دھڑکنوں تک بھی مصروف عشق حقیقی ہو جاتی ہیں۔ وہ ہر لحہ اللہ کے بارے میں تفکّر اور تدبّر کرتے ہیں اور ہر فکر عارفانہ پر کتنے ہی برس کی عبادت کا ثواب پاتے ہیں۔

فرمایا۔ ہر حرف قرآن پر دس نیکیاں پاتے ہیں۔ وہ اپنے لیے بھی اور پوری انسانیت کے لیے نجات دارین کے متمنی ہوتے ہیں۔ وہ خیر ہی خیر بن جاتے ہیں۔ لہذا فقرِ اسلام میں کوئی ایسی حرکت نہیں ہونی چاہیے۔

جو عند اللہ و عند الرسول و عند الاسلام و عند الاولیاء و عند العلماءؒ و صالحین قابلِ گرفت ہو۔ حال و قال دونوں کے متعلق خدا کے سامنے ہر کس و ناکس نے جواب دہی کرنی ہے۔

فرمایا۔ شراب حرام ہے۔ اس واسطے کہ اس کا سکر عقل و دانش سے بے حال کر دیتا ہے اور اس حد تک بے خبر کر دیتا ہے کہ انسان اپنی ذمہ داریوں سے بے خبر ہو جاتا ہے اور ایسی بے خبری میں حلال و حرام کی امتیاز کرنے کی صلاحیتیں بھی مفقود ہو جاتی ہیں۔

اگر یادِ الٰہی جو پابندی ارکان چاہتی ہے، فقیر سالک کو اتنا مدہوش کر دے کہ ارکان بندگی بھول جائے۔ تو یقیناً اس کا سکر اس کے حال کو ارکانِ اسلام سے غافل کر دے گا اور خدائے برتر کے مقرر کردہ ارکانِ بندگی سے سالک کی غفلت شعاری اس کی فقدانِ خوف پر منتج ہو گی۔

کوئی صاحب خوف سوائے حالت جنون کے ایسا نہیں کر سکتا کہ بجا آوری کے لیے میدانِ بندگی میں اترا ہو۔ اور میدانِ عمل میں اترنے کے بعد اپنے مالک و معبود کے احکامات سے غفلت کر رہا ہو۔

راہ سلوک میں حیرت و استعجاب، کیف و استغراق کو بھی خوف خدا کے تابع رکھنے کا حکم ہے۔ اگر جلالت الٰہی سے مرعوب و مبہوت ہو کر یا دیدارِ جلوت الٰہی سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں یا سالک مدہوش ہو جائے اور اس کی مدہوشی اس حد تک پہنچ جائے۔ کہ سوائے جلال و جمالِ معشوق اسے اور کچھ نظر ہی نہ آئے۔ تو ایسا مدہوش سالک ہوش مند ہونے تک غیر مکلّف ہے۔ مگر یہ حالت شاذ و نادر ہوتی ہے۔ بڑے رقیق القلب اور نازک مزاج سالک ایسے سکر کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر تدریج سے وہ اپنے ہوش

پر جلد ہی قابو پالیں تو وہ پھر رجعت الی الاولیٰ کر کے صاحبِ سہو ہو کر ارکانِ عبادات پورا کرنے کی راہ پر آسکتے ہیں۔

مگر رجعت میں دیر یا تاخیر ہو جائے تو ایسے لوگ مجذوب ہو جاتے ہیں۔ عین تلاشِ حق کی راہ میں مجذوب ہونے والے اگرچہ شرط سہو کے کھو جانے پر غیر مکلف ہوتے ہیں۔ مگر اپنے عقل و دانش کو راہ حق میں مردہ کر کے اپنے دلوں کو زندہ کر لیتے ہیں۔ اور ان کی دل کی آنکھیں ہی عالمِ انفس و آفاق کا مطالعہ کرتی ہیں اور دل سے ہی اپنے مالک کے ساتھ لو لگائے رکھتے ہیں۔ یہ بھی سالکین راہ حقیقت ہوتے ہیں۔

مگر مجذوب العقل ہونے کی بنا پر ظاہری اعمال کے تکلف سے آزاد کر دیئے جاتے ہیں۔ جس طرح نابالغ بچے اور مجنون غیر مکلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح مجازیب بھی غیر مکلف ہوتے ہیں۔

مگر اہل اللہ میں زیادہ مقبول وہی سالک ہوتے ہیں۔ جو شریعت کی روشنی میں مجوزہ راہِ طریقت کے آئین کے پابند ہو کر منزلِ مراد کی طرف رختِ سفر باندھیں۔

فرمایا۔ سب سے افضل سلوک اصحابِ کبار کا سلوک تھا۔ جنہوں نے اطاعت میں سرِ مو بھی فرق لانے کی جسارت نہیں کی۔ خلفائے راشدین سالک راہ حقیقت تھے۔ مگر ان کا طریق سلوک علی منہاج نبوت تھا۔ مابعد کے سالکین کو چونکہ اصحاب رسول کریم ﷺ ہونے کا شرف نہیں مل سکا مگر صحابہ کی اطاعت میں ان کا طریقہ سلوک بھی علی منہاج شریعت و طریقت رسول کریم ہوا۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لیے طریقت اصحاب پاک ہی نافذ العمل رہے گی۔ اور اولیائے امت اسی طریقہ سے اکتساب فیض

کرتے رہیں گے۔

جملہ طرق اسلامیہ اپنی نسبت کے اعتبار سے خلفائے راشدین میں سے کسی ایک کے ساتھ متعلق ہو جاتے ہیں۔ مگر راہ سلوک میں سیّد الطائفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذات ہے۔ آپ سمندر عرفان ہیں اور جملہ سلوک کے دریا آپ ہی سے نکل کر آپ ہی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

فرمایا۔ فقر اسلام نے ہر شعبہ اسلام سے انگڑائی لی۔ متقی تجار بھی ولی اللہ تھے۔ اور متقی عساکر اسلام کے جرنیل اور سپاہ سب کے سب سالکِ راہ حقیقت تھے۔ ان کے صالحانہ کردار سے میدانِ دنیا میں گونا گوں کرامات کا ظہور ہوتا رہا۔

اسلامی غزوات میں مسلمان سپاہ کو فرشتگانِ مکرمین کے ذریعہ تائیدِ غیبی کا ملنا، درندوں کا مجاہدین کے راہ سے ہٹ جانا اور بسا اوقات راہنمائی کرنا، دریاؤں کا راہ دے دینا، ارض و سما کے موسموں میں مویّدانہ تغیرات۔ یہ سب احوال ان کے کریم النفس ہونے کے علامات تھے۔

اس واسطے یہ گمان کر لینا کہ سلوک صرف سند سے ہی متعلق ہو کر سلوک کہلاتا ہے، ایک بے معنی منطق ہے جو صرف جہلا کو ہی اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہے۔ مگر وہ بھی عارضی وقت کے لیے۔ تصوف اسلام جو ایمان اور جانِ بندگی ہے، یہ کوئی یک طرفہ سلسلہ نہیں۔ بلکہ ہمہ گیر نظریۂ حیات ہے۔

فرمایا۔ خبردار! یہ بھوت پریت کا فقر نہیں۔ نہ ہی یہ علم نجوم و مسمریزم کا شعبدہ ہے۔ بلکہ حسنِ ازل کے سامنے خنجرِ تسلیم و رضا کے ساتھ ذبح ہو جانے کا نام ہے۔

بس میری اتنی نصیحت پر ہی اکتفا کرو۔ مجھے اللہ پر چھوڑو اور اپنے اللہ کی بندگی پورا کرنے کی سعیٔ مومنانہ کرو۔ اور تشہیر نفسی کے لیے اگر ایسا کرو گے تو میں قیامت کے دن مواخذہ کروں گی۔ جب فراغت کا وقت ملے تو مجھے ملو۔ مگر تہی دامن ہو کر مجھ سے نہ ملنا۔

جو بیٹے دینوی کمائی کرنے کے لیے باہر بھیجے جاتے ہیں۔ وہ نقد کمائی کا مطالبہ نہیں کرتی۔ مجھے اللہ تعالےٰ نے صاحب نظر بنایا ہے۔ تم جب کبھی عبادات سے تھوڑی فراغت پا کر میرے ملنے کے لیے آیا کرو گے تو میں تمہارے چہرہ سے معلوم کر لوں گی۔ کہ تم تہی دست واپس آئے ہو۔ یا بندگی کے ساتھ نور ایمان کما کر لائے ہو۔ میں تمہارا امتحان لوں گی۔ چونکہ میں نے خدائے لم یزل کے سامنے تمہارے لیے جوابدہی کرنی ہے۔ نیز تمہارے والد بزرگوار تمہاری روحانی کفالت پر مجھے مامور کر گئے ہیں۔ اس طرح مجھ پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

بیٹا! خدا ہی خدا ہے۔ اسی کے لیے جیو، اور اسی کے لیے مرو، اور اسی کے لیے بندگی کرو۔ تمہیں میں ایسی حالت میں چلہ کشی کے لیے بھیج رہی ہوں جبکہ میرے پاس سوائے دعا کے اور کوئی دنیوی سامان موجود نہیں ہے۔ میری مفلسانہ دعائیں قبولیت کا شرف پائیں گی۔

اللہ کے فضل و کرم سے والدہ کے پندو نصائح نے میرے دل پر گہرا اثر ڈالا اور مجھے اتنا متاثر کیا کہ رقت قلبی سے میرا وجود موم ہو گیا۔ آپ کی اجازت کے بعد میں نے موضع دیول شریف کے دامن سے گذرتے ہوئے دریائے جہلم کے کنارے جو ایک لق و دق ویرانے سے گزرتا ہے۔ بیٹھ کر مجوزہ و مفوضہ ریاضت شروع کر دی۔ یہ میرا پہلا وظیفہ

تھا جو سلسلۂ قادریہ سے متعلق تھا۔ گیارہ دن مسلسل میں نے اس وظیفہ کے ساتھ ریاضت کی۔ جس سے میرے اکثر منفی قسم کے وہ خیالات اور وساوس بھی دور ہونے شروع ہو گئے، جو برہانِ سلوک کے متعلق میرے یقین کو متذبذب کرنے کا باعث تھے۔ اس ریاضت سے مجھے اطمینان نصیب ہوا اور میرے قلب و نظر اور ذہن نے مثبت پہلو اختیار کیا۔ جس سے منفی کیفیت قلب و نظر نے مثبت پہلو اختیار کیا اور بے یقین رکھنے والے ظن وگمان کم ہونے شروع ہو گئے۔

اس وظیفہ کے دوران مجھے ہر چیز کے خیرِ محض ہونے پر مثبت حقیقی کی طرف قدم اٹھانے کے لیے ہر چیز کی قلبِ ماہیت کے ساتھ اس کے مثبت پہلو پر غور و حوض کرنے کی بصیرت ملی۔ ہر حادث چیز کو میں نے مسبح پایا۔ ہر چیز مجھے دعوت تسبیح و تہلیل دے رہی تھی۔

چنانچہ ایک وقت ایسا بھی آیا۔ جبکہ میں ایک سبز اور گنجان جھاڑی کے پاس بیٹھا دریا کے سامنے مصروف وظیفہ تھا کہ گنجان جھاڑی کی پتیوں کی متحدہ زبان سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا ورد سنا۔ مجھے شبہ ہوا کہ جھاڑیوں کے قریب کوئی خوش زبان معصوم بچے ایک جھمگٹے کی شکل میں کلمۂ طیبہ کا ذکر کر رہے ہیں۔ مگر بار بار اس شبہہ کو دور کرنے کے لیے میں نے جھاڑی کے قریب ہو ہو کر بار بار ذکرِ پاک سنا۔ جب میں متیقن ہو گیا کہ یہ جھاڑی ہی ذکر الٰہی کرتی ہے۔ (واللہ علم) تو اس فوق الادراک واقعہ نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ مجھے مزید شبہات نے آگھیرا کہ شاید کوئی جنات وغیرہ ایسا نہ کر رہے ہوں۔ اس پر میں نے حسب نصیحت تیسرا کلمۂ تمجید پڑھا کہ اگر کوئی وسوسہ ہے تو دور ہو جائے۔ اگر وسوسہ نہیں تو اصلی حالت

میں میرے سامنے آ جائے۔ چنانچہ فی الواقع پتیاں ہی مصروف ذکر پائی گئیں۔ اس کیفیت سے مجھے پہلی بار باہوش وجد نصیب ہوا۔ اللہ تعالےٰ کی پرتاثیر کلام پاک کی اس معجز نمائی نے میرے دل پر وہ اعجاز انگیز انقلاب پیدا کیا کہ میں نے اپنے آپ کو اپنے رب کے قریب پایا اور دوری کا وہم ختم ہونے لگا۔

گویا کہ میری عاجزانہ امیدوں کی حوصلہ افزائی کے لیے قدرت کاملہ مجھے پہلی بار برہانی دور عطا کر رہی تھی۔ اس کیفیت کو میں نے کافی وقت دیکھا اور ذکر الٰہی سنا اور قریب رہا۔ پھر وہ پر کیف مجلسِ ذکر معاً ختم ہو گئی۔ اس کیفیت کی تاثیرات میرے لیے وجد انگیز تھیں۔ اور اس پر کیف تاثر کو میں نے ایک شعر کی صورت میں یادداشت کے طور پر محفوظ کر لیا۔ راہِ سلوک میں غالباً یہ میرا پہلا منظوم بند ہے۔ جو فی البدیع تھا۔ وہ یہ ہے۔

نزدِ تُو جب شجر کے جائے گا مارے ہجر کے

تو بول اٹھے گا لاالہ ہوں گے تماشے ذکر کے

یہ واقعہ میری اس پابند ریاضت کے پانچویں دن صلوۃ العشاء کے بعد پیش آیا۔ ان پانچ دنوں میں مسلسل ریاضت سے مجھے سخت تکان محسوس ہو رہی تھی اور نیند کا غلبہ ہو رہا تھا۔ جس کو دور کرنے کے لیے مجھے بار بار دریا کے ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا پڑتا۔ مگر اس قدرتی اظہار ذکر نے میری روح میں ایسا پرتاثیر ارتعاش پیدا کیا کہ تکان اور نیند کا احساس بصورتِ محبت مزید جستجو میں بدل گیا اور میری تکان آسودگی میں اور میری نیند بیداری سے بدل گئی۔ بار بار ارض و سما کی ہر چیز کی طرف اس امید پر میرے کان کھڑے ہو جاتے کہ شاید کہیں سے پھر ویسے ہی اذکار سننے

میں آئیں۔ ایسے پر کیف مناظر میری آنکھیں دیکھ سکیں اور اس صورت کو میں دوبارہ پا سکوں۔

اس بے قراری میں سالکانہ قلق و اضطراب کی اتنی فراوانی ہوئی کہ ماہی بے آب کی طرح اپنے محدود دائرہ ریاضت میں تڑپنے لگا کہ معاً دل نے شریعت کا دامن تھام لیا۔ اور میرے دل نے مجھے ایسے جذب سے منع کر دیا۔ جس کے واقع ہونے سے ارکانِ بندگی میں کوتاہی کا شبہہ ہو۔

چنانچہ میں سنبھل گیا۔ دو رکعت نفل بندگی ادا کیے۔ اور شکرانہ ادا کیا۔ اور مصروف بندگی ہو گیا۔ مزید ایک دن اور ایک رات گزارنے کے بعد گاہے گاہے قریب کی فضاؤں سے لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ کے نغمے سنائی دیئے۔ یہ طریقِ ذکر پہلے ذکر سے کہیں زیادہ دل آویز تھا۔ اس ذکر نے مجھے وجد و استغراق دیا اور میں گویا وجد و استغرق میں محصور تھا۔ مگر قدرت کاملہ نے میری مدد فرمائی کہ مجھے ہوش میں رکھا اور میں ارکان عبادات کی رعایت کو ملحوظ رکھتا رہا۔

سحر سے دوسرے دن ورود شام تک گاہے گاہے یہی ماجرا درپیش آتا رہا اور میں اپنے آپ کو صاحبِ حال پا کر شکر الٰہی کے ساتھ مزید مصروف عبادات ہوا۔

پھر ساتویں کے بعد آٹھویں شب کو دریا، ہوا اور جنگل کے درختوں نے ایک زبان ہو کر ذکر نفی و اثبات جاری کر دیا۔ اب میں گویا مکمل طور پر ہر چہار جانب کے ہجوم ذکر میں پوری طرح محویت و سرور پا رہا تھا۔ اس ذکر نے نہ صرف میرے سمع و نظر کو ہی متاثر کیا بلکہ میرے جسم و جان کو اپنی تاثیر میں لے لیا۔ اور میرے بدن کا رونگٹہ رونگٹہ لاالہ الااللہ

محمد رسول اللہ کے خارجی ہجوم ذکر میں شریک ہو گیا۔ یہ سارے اذکار طرز الحان میں بیک آواز تھے۔ اس مقام پر ہوش کو برقرار رکھنا میری طاقت جسمانی سے باہر تھا۔

مگر نورِ شریعت نے میری اس بے قابو حالت کو اپنی باضابطہ حفاظت میں لے لیا اور مجھے ارکان عبادات کی رعایت سے غافل نہ ہونے دیا۔ اور میں اس ہمہ گیر وجد و سرور میں بھی باہوش مصروف عبادت رہا۔ اس مقام پر میں نے سوائے ذکر الٰہی کے کسی دوسری کیفیت کو دیکھنے یا پانے کی خواہش نہیں کی۔ اور یومنون بالغیب کی طرف ہی توجہ مبذول رہی۔ میرے دل نے خوف عُجب سے بچنے کے لیے ہر اس چیز کی نفی کر دی، جو غرور نفس کا سبب بن سکتی ہے۔

چونکہ کشف و مکاشفہ مقصود سلوک نہیں ہو سکتے۔ بلکہ صرف چراغ راہ ہو سکتے ہیں۔ مگر بعض دفعہ بعض سالک اپنی ریاضت کے دوران آنکھوں پر کشف وارد کرنے کے لیے تکلف کرتے ہیں۔ یہ تکلف اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ سالک ایمان بالغیب پر ایمان بالشہود کو ترجیح دے رہا ہے۔ اور یہ بنیادی غلطی ہے جو سالک کی ساری زندگی میں آڑے آتی ہے۔ اور طبعیت کو مرہون غیر بنا دیتی ہے۔

چونکہ کشف و کرامات مطلوب نہیں، بلکہ غیر ہیں۔ جب حصولِ غیر کو مطلوب پر ترجیح دی جائے تو منزل غلط ہو جاتی ہے۔ جس کی انتہا پھر غیر پر ہی اختتام پذیر ہو کر سالک کو اپنے اصل مقصود سے دور کر دیتی ہے۔ اور ایسی حالت میں سالک کشف و کرامات کو بجائے ایزادرحمت قرار دینے کے اپنا ذاتی اکتساب گردانتا ہے اور یہ گمان سالک کو سہل پسند بنا

دیتا ہے۔

ایسا شخص جو اپنی ریاضت سے عجب و غرور پائے۔ اور دعوائے اکتساب کو اپنی ذاتی محنت قرار دے۔ اس کی ساری محنت اسے بجائے مردِ کامل بننے کے محض ایک عامل قسم کا آدمی بنا دیتی ہے۔ چنانچہ پابندِ شریعت ہونے کی بنا پر مجھے ان پر کیف اور وجد انگیز حالات میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایسے خارجی خیالات سے مکمل محفوظ و مامون رکھا اور میں بفضل اللہ تعالےٰ منزلِ سلوک پر شرعی طریق پر گامزن رہا۔

آٹھویں، نویں، دسویں یوم کی گیارہوں رات تک اس قسم کے امید افزا حالات مرئی اور غیر مرئی انداز میں پیدا ہوتے رہے اور میری ہمت مضبوط کرتے رہے۔ ان حالات سے میں نے کسی مرحلہ پر اپنی ذاتی حیثیت کو اپنے ذہن میں جگہ نہیں دی۔ بلکہ شریعت اسلام کے متعینہ عبادات کی عملی تاثیرات پر میرا ایمان مضبوط و مستحکم ہوتا رہا۔ اور بار بار یہی گمان پیدا ہوتا رہا کہ شریعت اسلام کس قدر پر تاثیر ہے۔ جو نفس و آفاق پر فتوحات حاصل کرنے کا یقیناً آخری ذریعہ ہے اور یہ کہ ساری انسانیت اسی کے ذریعہ فلاح دارین پا سکتی ہے اور یہ کہ شریعت اسلام ہی انسانی فلاح و نجات کی ضامن ہو سکتی ہے۔

جوں جوں میں ریاضت میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ میرے دل میں بر سبیل طریقت شریعت اسلام کی حقیقت ہی واضح ہو رہی تھی اور میں ہر گوشۂ ریاضت سے شریعت اور شارع علیہ السلام کو اہل اسلام کے لیے اللہ کا احسان قرار دیتا رہا۔

قرآن مجید کی یہ آیت پاک لقد من اللہ علی المومنین

اذبعث فیہم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم ایتہ
ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمتہ
بار بار میرے سامنے آ آ کر مجھے طریقت باشریعت اور اطاعت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جانب متوجہ کرتی رہی اور تزکیۂ نفس کے لیے عمل شریعت کی طرف رکز دیتی رہی اور اس تقویٰ دینے والے محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی آئینہ داری کرتی رہی۔ یہاں تک کہ میرے قلب و نظر نے اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم کی پوری پوری تصدیق کرلی۔ اور یہ کہ میری روح و دانش پر وماارسلنک الا رحمتہ اللعلمین کی صحیح تفسیر واضح ہوگئی۔

# تینتسواں باب

## دیول شریف کے نام کی وجہ تسمیہ

اس کامیاب ترین ریاضت کے دوران مجھے ایک مرد کامل نے میرے ان خیالات میں لفظ دیول شریف کی راہنمائی کی جبکہ میں اس لفظ پر علماً اور عقلاً اعتراض کر رہا تھا اور لفظ دیول کی وجہ تسمیہ معلوم کرنے میں مجھے دقت پیش آ رہی تھی۔ سحری کے وقت نماز تہجد کے بعد یہ برگزیدہ شخصیت دیول شریف کی جامعہ مسجد میں اچانک تشریف لائی۔

فرمایا۔ کہ میں خواجہ خضر ہوں۔ نام دنیا میں دنیا دار لوگ کسی نہ کسی انداز میں رکھ لیتے ہیں۔ نام رکھنے میں آنے والی نسلوں کا کوئی قصور نہیں ہوتا جیسا کہ مدینہ طیبہ کا پہلا نام یثرب تھا حالات نے اس کو مدینہ طیبہ ہونے کا شرف بخشا۔ ایسے ہی بیت اللہ شریف دنیا کا سب سے بڑا بت خانہ تھا جس کو اللہ تعالیٰ کی مشیت نے عالمین کی رشد و ہدایت کے لیے حالات کے مطابق مرکز و محور اعظم قرار دے دیا اور فرمایا

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکتہ مبارکاً وھدی اللعالمین

یعنی سب سے پہلا گھر جس کی بنیاد اللہ تعالےٰ نے پوری انسانیت اور عالمین کی ہدایت کے لیے رکھی، یہ بھی عظیم بت خانہ سے عظیم ترین

معبد انسانی بنا۔ پس یہ سنت اللہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو بت پرستوں اور بت خانوں کے ماحول میں پیدا کرتا ہے اور وہیں سے ان کی عملی تاریخ کو ترتیب دے کر تاریخ ہدایت بنا دیتا ہے۔ دنیا میں جتنے بڑے بڑے انبیاء تشریف لائے وہ سب کے سب اپنی پس پشت میں ایسے ہی بت پرستوں کی تاریخ رکھتے ہیں ان مواضع یا ان مقامات کے نام غلط ہوتے ہیں۔ تاریخی شخصیات کے ورود مسعود کے بعد یا تو وہ نام مٹا دیئے جاتے ہیں اور تاریخی طور پر یہ ثبوت ملتا ہے کہ خدا پرستوں نے ان ناموں کو مٹایا تھا۔ اگر کسی غفلت سے یہ نام باقی رہ جائیں تو علاقہ والوں کی غفلت کا نتیجہ ہوں گے۔ ان علاقہ والوں پر ہر زمانے میں یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ مفہوماً غلط معنی دینے والے ناموں کو دینی ناموں کے ساتھ تبدیل کر دیا کریں۔ اس بزرگ ہستی نے فرمایا۔ کہ قدیم میں دیول ہندوؤں کی بستی تھی یہاں ہندو لوگ پوجا پاٹ کرنے کے لیے آتے تھے۔ دیول شریف کی وسط میں ایک کھڑ کوٹ نامی بستی ہے جس میں ایک بہت پرانا چشمہ جاری وساری رہتا ہے۔ جس کو دیول والے لوگ باولی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ صاحب فرمانے لگے کہ اس باولی کے اوپر ایک درخت ہوتا تھا جس پر کبھی کبھار ایک بڑا سانپ آکر اونچی آواز سے چلایا کرتا تھا۔

ہندو اس کی آواز سن کر سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔ اس باولی کے ارد گرد جمع ہو کر اس جگہ کو اور اس درخت کو اپنا دیوتا سمجھ کر اس کی عبادت کرتے تھے۔ اور دور دراز کے ہندو سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے وہاں پہنچتے تھے راستے میں جب لوگ ان سے پوچھتے تھے کہ تم کہاں جا رہے ہو تو اکثر پنجابی ہندو پنجابی زبان میں جواب دیتے تھے کہ ہم دیوی ول جا رہے

ہیں۔ ول کے معنی طرف کے آتے ہیں کہ ہم دیوی کی طرف جا رہے ہیں۔ پس اس قسم کے سوالات و جوابات سے یہ موضع دیولی سے دیول ہو گیا۔ اس میں موجودہ یا آنے والے بنائے دیول کا کوئی قصور نہیں۔ آج کی کسی شخصیت کو بھی اس نام سے بدنام کرنا یا تہمت لگانا ایک قسم کی جہالت ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری وجہ سے دیول کو دیول شریف ہونے کا مرتبہ ملا اور یہ ہندی نام لفظ شریف کے ساتھ مبدل بااسلام ہو گیا۔

نہ صرف دیول یا مضافات دیول میں دیول کو دیول شریف کہا جاتا ہے بلکہ عالم اسلام میں اور دیگر ممالک میں مشرق و مغرب تک اس کو دیول شریف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور انشاءاللہ قیامت تک دیول شریف کے نام سے یاد کیا جاتا رہے گا۔ اس نام پر مجھے اس وقت کامل اعتقاد ہو گیا تھا جبکہ شاہ فیصل کے زمانہ میں مجھے حج بیت اللہ شریف اور میری قیادت میں وفد الحج کو ضیوف کی شکل میں حج بیت اللہ کے لیے بھیجا گیا تھا۔ شاہ فیصل مرحوم و مغفور رحمتہ اللہ علیہ غسل کعبہ کے وقت در کعبہ پر خاص عربی اور شاہانہ لباس میں کھڑے تھے اور جس کو غسل کعبہ میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی ان کو وہ مصافحہ کرنے کے بعد کعبے کے اندر داخل ہونے کی اجازت مرحمت فرماتے تھے۔ پاکستان کی طرف سے میں ہی ایک ایسی شخصیت تھا جس کے متعلق مرشدِ پاکستان پیر دیول شریف کے نام سے اناؤنس کیا گیا تھا۔ جو لفظ میں نے اور میرے وفد نے سنے وہ لفظ یہ تھے کہ پیر صاحب دیول شریف غسلِ کعبہ میں شرکت فرما رہے ہیں۔ یہ آواز میں نے اس وقت سنی جبکہ میں اور میرے ساتھی کعبتہ اللہ کی چار

دیواری کے اندر مصروف غسل تھے یقیناً وہاں کی در و دیوار پر یہ لفظ رقم ہو گئے ہوں گے اور وہاں کے فرشتوں نے بھی ان کو لکھ لیا ہو گا۔ یہ لفظ دیول شریف کی ازلی ابدی اور سرمدی طور پر توثیق تھی۔ =

واخرو دعونا عن الحمد لله رب العالمين

دارِ خلیفہ محمد شریف گرما دری